DUE DATE

Cl No. ______________ *Acc. No.* ______________

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1**/- per day Over Night Book **Re. 1**/- per day.

2 [illegible] 1997			
26 MAR 2001			
[illegible]			
24/10/01			
20-12			

جامعہ

مولانا محمد علی نمبر



جامعہ

جلد ۷۶ | بابت ماہ جنوری تا اپریل ۱۹۷۹ء | شمارہ ۱ تا ۴

فہرست مضامین

منظوم خراجِ عقیدت

فہرست تصاویر

خط و کتابت کا پتہ:

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی ★ مطبوعہ: جمال پریس دہلی ★ ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

مولانا محمد علی کی دو نایاب تصویریں





مولانا محمد علی اور دوسرے قومی رہنما



اخوذ از روداد کانگریس ۳۹ واں اجلاس منعقدہ ۲۶، ۲۷ دسمبر ۱۹۲۴ء بہ مقام بلگام

شذرات

جامعہ کا مولانا محمد علی نمبر اب قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ اسے پڑھیں گے اور اپنی ایک رائے قائم کریں گے، نہ صرف اس خاص شمارے کے بارے میں بلکہ اس دلآویز عظیم شخصیت کے بارے میں بھی جس کی یاد میں اسے ترتیب دیا گیا ہے۔ ہم یہ دعویٰ تو نہیں کرتے کہ اس خاص شمارے نے مولانا محمد علی مرحوم کی حیات اور کارنامے کے ہر پہلو کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے، لیکن یہ [illegible] کریں گے کہ ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ مولانا کی شخصیت کے نمایاں خد و خال ابھر کر سامنے [illegible] اپنی اس کوشش میں ہم کہاں تک کامیاب ہیں، اس کا فیصلہ ناظرین کریں گے۔

شذرات میں اس کا موقع تو نہیں ہے کہ مولانائے مرحوم کے سلسلے میں کم و بیش وہی باتیں دہرادی جائیں جو اس شمارے کے مضمون نگاروں نے قلم بند کی ہیں یا جن کی طرف ان کے یہاں اشارے ملتے [illegible] دو باتوں کے لیے میں خاص طور پر قارئین کی توجہ کا طالب ہوں۔ ایک تو یہ کہ ابھی تک مولانا محمد علی کے کسی سوانح نگار نے جہاں تک مجھے علم ہے ان کی اس جد و جہد کا سیر حاصل اور تنقیدی [illegible] پیش کیا ہے جس کا مقصد ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ کو اس کے استعماری پرنسپلوں سے [illegible] سوانح نگاروں کے یہاں اس سلسلے کی کچھ باتیں ملتی ہیں، لیکن وہ سرسری ہیں اور ان میں سے اکثر اپنی تائید میں معتبر دستاویزی شہادتیں نہیں رکھتیں۔ مولانا کو قدرت کی طرف سے حساس دل و دماغ ودیعت ہوا تھا اور وہ ذہین بھی غضب کے تھے، یہ میرا احساس ہے، بلکہ یوں [illegible] کی زندگی کے حالات پر غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اول روز سے جب مولانا نے علی گڑھ کی سرزمین پر پہلا قدم رکھا اس دن تک جب وہ ۱۹۲۰ء میں اولڈ بوائز لاج (علی گڑھ)

سے نکالے گئے، ایک لمحہ کے لیے بھی وہ علی گڑھ کی سیاسی و مذہبی زندگی سے مطمئن نہیں ہوئے لیکن اسی کے
ساتھ ان کی اور علم سے ان کی محبت روز افزوں رہی۔ گویا جیسے جیسے بے اطمینانی بڑھتی تھی، محبت کا
مضبوط ہوتا جاتا تھا، ابھی وہ اسکول ہی میں تھے کہ انہیں علامہ شبلی کے قرآن پر اُن لیکچر
[illegible] علی گڑھ کالج کی بڑی جماعتوں کے طلباء کو صبح کے وقت دیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی
آپ بیتی میں لکھا ہے کہ "بے شک علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلباء کافی ترقی یافتہ تھے اور انہیں اپنے
مسلمان ہونے پر بھی کافی فخر تھا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ مذہب کے معاملے میں کافی سے
[illegible] کو "دینیات" کے نام سے جو تعلیم دی جاتی تھی وہ چند نہایت ہی ابتدائی
مذہبی کتابوں کی تعلیم تھی (اور یہ صورت آج بھی کم و بیش جوں کی توں ہے) اور جہاں تک قرآن مجید کا
تعلق ہے وہ طالب علموں کے لیے ایک سربستہ کتاب ہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید کے علی گڑھ میں
جو مذہب اور تہذیب و ثقافت سے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے اور عشق رسولؐ میں سرشار تھے،
[illegible]کے لیے قرآن پاک اور سیرت رسولؐ کی تعلیم و تدریس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کیسی محرومی تھی یہ!
اور اس محرومی کی چبھن کو محمد علی کے حساس قلب نے بُری طرح محسوس کیا اور اپنے اس احساس کو بعد
میں انھوں نے اس طرح قلم بند کیا کہ "اس عام گھپ اندھیرے میں علی گڑھ میں ایک روشن نشان بھی تھا اور
وہ شبلی نعمانی کی ذات گرامی تھی جو غیر معمولی خوبیوں اور بالکل نئے ادبی نقطۂ نظر کے حامل تھے اور جنھیں
سرسید کالج میں کھینچ لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔" یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ علامہ شبلی ان
حریت پسندوں میں تھے جو علی گڑھ میں انگریز کے آمرانہ اقتدار کو سخت ناپسند کرتے تھے اور تادم واپسیں
[illegible]مسلم سیاست کے حامل و حامی رہے۔

اپنی آپ بیتی میں مولانا نے اسی سلسلے کی ایک اور نہایت اہم بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ
علی گڑھ میں طلبا کے درمیان گرما گرم بحثیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اگر ان کا موضوع مغربی ادب
اور فلسفہ و سائنس نہ ہوتا تو وہ زیادہ تر ہندوستان کی سیاسیات پر جس کا تعلق میرے اسکول اور کالج
کے دنوں میں ملک کے ایک دوسرے سے برسرپیکار فرقوں کے اپنے اپنے مطالبات سے زیادہ اور برطانوی
حکومت سے ہندوستان کے عوام کے مطالبات آزادی سے کم تعلق تھا، مرکوز ہوا کرتیں۔ چنانچہ واقعہ

ہے کہ ان حالات کی وجہ سے اس زمانے میں ہمارا ملی اور فرقہ وارانہ شعور مذہبی کم اور دنیوی زیادہ تھا۔" مجھے معاف کیا جائے اگر میں یہ کہوں کہ مجموعی اعتبار سے علی گڑھ کا یہ "ملی شعور" (یعنی مذہبی کم اور دنیوی زیادہ) ۱۹۴۷ء تک اسی طرح برقرار رہا اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان کا "سیاسی شعور" [illegible] صحیح عکس ہے۔

[illegible] زندگی میں علی گڑھ میں مسلم سیاست کے سربراہ مسٹر بیک تھے۔ ۱۸۹۹ء میں بیک کے انتقال کے بعد مسٹر ماریسن نے باگ ڈور سنبھالی۔ بیک کے زمانہ ہی میں جارحانہ ہندو فرقہ پرستی نے سر اٹھایا تھا اور یو۔پی میں ہندی اردو کا جھگڑا کھڑا ہو گیا تھا جس کے نتیجہ میں صوبہ کا لفٹنٹ گورنر نواب محسن الملک [illegible] ناراض رہا۔ مسٹر ماریسن بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی کوئی الگ سیاسی [illegible] انگریزی حکومت سے مطالبات کریں۔ چنانچہ انھوں نے اس طرح کی باتیں کہنی شروع کیں کہ جمہوری حکومت نہ صرف مسلمانوں کے لیے مضر ثابت ہوگی بلکہ تمام ہندوستانیوں کے لیے بھی اس میں خطرات ہیں۔ جمہوری حکومت اقلیتوں کو لکڑی کاٹنے والوں اور پانی بھرنے والوں کے درجے تک پہنچا دے گی اور مسلمانوں کا ملک میں نام و نشان نہ رہے گا۔" مسٹر ماریسن نے یہاں تک کہا کہ مسلمانوں کا نفع اس میں ہے کہ "وہ اپنی قسمت کو سر اینٹونی میکڈانل (گورنر صوبہ متحدہ) کے ہاتھوں میں چھوڑ دیں۔"
یہ اور اسی طرح کے اور حالات تھے جو مسلمانوں کی عام زندگی کو متاثر کر رہے تھے۔ محمد علی کی آزاد طبیعت رہ رہ کر ان حالات پر پیچ و تاب کھاتی تھی، پھر وہ مسٹر ماریسن کے زخم خوردہ بھی تھے جنھوں نے محمد علی کی آزاد طبیعت کا اندازہ کرتے ہوئے نواب محسن الملک کے کہنے کے باوجود انھیں کالج اسٹاف میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ گویا بیٹے کو ماں سے جدا کر رکھا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب ماریسن واپس اپنے وطن [illegible] جگہ ایک اور انگریز پرنسپل آرچبولڈ آ گئے۔ محمد علی اگرچہ اب ریاست بڑودہ کی ملازمت میں تھے لیکن ملک کی سیاست اور خاص طور پر مسلمانوں کے مسائل سے غافل نہ تھے۔ اور کالج تو ان کی تمام [illegible] تھا، جب بھی موقع ملتا وہ آرچبولڈ کی مخالفت کرتے، اسی دوران انھوں نے نواب محسن الملک کو ایک خط لکھا جس کا مندرجہ ذیل اقتباس محمد علی کے ذاتی اضطراب اور آزادی خواہ مسلم نوجوانوں کے موڈ کو ظاہر کرتا ہے:

"حالات کے واقعات سن کر میں اپنے عزیز کی موت کو بھول گیا ہوں، اور کالج و قوم کی وفات پر إنا للہ و إنا إلیہ راجعون پڑھ کر دو چار آنسو بہا لیتا ہوں۔ بہتر ہے کہ جو کچھ ہوا اب آپ اس مردہ قوم کو اس کے حال پر چھوڑ دیں، اور اپنی بوڑھی ہڈیوں کو آرام دے لیں۔ ساری عمر انھیں آرام نصیب نہیں ہوا۔ لاٹ (گورنر صوبہ متحدہ) صاحب آئے، لارڈ کچنر گئے، امیر صاحب (امیر کابل) آئیں گے اور لارڈ منٹو تشریف لائیں گے۔ مگر مارا چہ ازیں قصہ، نہ ان سے کالج کو فائدہ پہنچتا ہے نہ قوم کو، نہ آپ کو، مسلمانوں کو چند بڑی یا چھوٹی نوکریاں مل جائیں گی۔ آپ کو ایک ذلیل اور بے وقعت خطاب عطا ہوگا۔ مگر یوروپین اسٹاف کا نام بھی ہوگا، عزت بھی بڑھے گی اور ان کو قوم کا روپیہ بھی جس کو آپ نے خون بہا کر پیدا کیا ہے، ملے گا۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔"

نواب محسن الملک کے نام محمد علی کا یہ خط ۱۹۰۶ء کا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں انگریز پرنسپل اور انگریز اسٹاف کی خودسری اور دراز دستیوں سے عاجز آکر کالج کے طلبا نے اسٹرائک کر دی۔ اسٹرائک ہی کے دوران اولڈ بوائز کا ایک جلسہ ہوا، محمد علی بھی اس میں موجود تھے، انھوں نے سرسید کی تصویر کو مخاطب کر کے ایک نظم پڑھی جس کے دو شعر یہ تھے:

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو
تمہیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علی گڑھ میں
اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اور جا بجا تم ہو

یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں کہ علامہ اقبال نے جو ان دنوں انگلستان میں زیر تعلیم تھے، اس اسٹرائک کو پسند نہیں کیا تھا اور ایک نظم "طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام" کے عنوان سے لکھ کر گویا انھیں نصیحت کی تھی اور کہا تھا کہ پہاڑوں سے یہ آواز آتی ہے کہ زندگی کا راز سکون میں ہے اور موج ناتواں کا کہنا یہ ہے کہ لطفِ خرام اور ہی چیز ہے۔ نظم کا آخری شعر بھی ملاحظہ ہو:

بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی

کسی کو کیا معلوم تھا کہ چار پانچ برس کے اندر ہی بین الاقوامی اور قومی سیاست کی بھٹی اتنی گرم ہو جائے گی کہ جو بادہ نیم رس تھا اُس میں اِس زور کا ابال آئے گا کہ خُم کے سر سے خشتِ کلیسا اچھل کر دور جا پڑے گی اور نواب وقار الملک جیسا بزرگ مدبر بھی اپنے تقویٰ اور پرہیزگاری کے باوجود اس "بادۂ پختہ" سے سرشار ہو اٹھے گا۔ داستان طویل ہے اور تفصیل کی گنجائش نہیں، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ۱۹۱۲ء تک یہ انقلاب دیکھنے میں آیا کہ علی گڑھ کالج کی انگریز پرستی کا سنگین حصار مسمار ہو کر رہ گیا اور سر آغا خاں جیسے لوگ ہمیشہ کے لیے ہندوستان کی مسلم سیاست سے رخصت ہو گئے، اب مسلم سیاست کو قیادت ملی محمد علی اور ابو الکلام جیسے حریت پسند اور انقلابی نوجوانوں کی اور شیخ الہند جیسے بوڑھے مگر روشن خیال عالم دین کی، جن کی تحریروں، تقریروں اور انقلاب آفریں سرگرمیوں سے عظیم الشان برطانوی سامراج کے ایوانوں کی دیواریں متزلزل ہو گئیں۔ بلا شبہ علی گڑھ کی اس قلب ماہیت میں محمد علی کی مسلسل جد و جہد کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ کیا اچھا ہو کہ ان کا کوئی سوانح نگار معروضی انداز میں ان کے اس کارنامے کا جائزہ لے۔

دوسری بات جو ہماری توجہ کی طالب ہے وہ "ملیت" اور "قومیت" کے بارے میں مولانا محمد علی کا موقف ہے۔ بلا شبہ مولانا محمد علی بہت بڑے محب وطن تھے، اپنے ملک سے انھیں بے پناہ محبت تھی، اس کے عوام کے سچے بہی خواہ تھے۔ انگریزوں کی غلامی سے اسے نجات دلانا اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتے تھے، لیکن وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کی ملت اس ملک میں پسماندہ نہ رہے اور اس کے جو حقوق ہیں وہ اُسے ملیں، وہ اپنی ملت ہی کے لیے حقوق نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کی آرزو تھی کہ ہندوستان کی تمام ملتوں کو ان کے جائز حقوق ملیں۔ وہ ایک عرصہ کے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ "اس سرزمین میں جہاں کروڑوں کی تعداد میں بے شمار ملتوں، مذہبی فرقوں اور گروہوں کے لوگ آباد ہیں اور سب کو اپنے اپنے مذہب سے گہرا تعلق ہے، قدرت نے مختلف اجزاء کو باہم کو متحد اور ان میں امتزاج پیدا کرنے کا ایک نادر موقع دیا ہے اور اس کی صورت سوائے مذاہب

کے وفاق یعنی فیڈریشن کے اور کوئی صورت نہیں۔ ان ملتوں اور مذہبی گروہوں کو آپس میں جدا کرنے والے خطوط اتنے زیادہ نمایاں ہیں کہ ان کو سوائے وفاق کے اور کسی طرح متحد نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ہفت روزہ "کامریڈ" کو جو "سب کا کامریڈ" (ساتھی) اور کسی کا بھی بیجا حمایتی نہیں، انھیں خیالات کا ترجمان ہونا تھا اور اس کا مقصد مسلمانوں کو اپنی ما ورا وطن ہمدردیوں کے جوش و خروش میں جو کہ اسلام کا مقصود اصلی ہے، ذرہ برابر کمی کئے بغیر ان کو ملک اور وطن کی محبت میں اپنا مناسب حصہ پیش کرنے کے لیے تیار کرنا تھا۔" ابھی مولانا کے یہ خیالات تفصیل طلب تھے اور وہ اس اہم مسئلہ پر یقیناً وضاحت سے لکھتے لیکن انھیں جلد ہی سیاست نے اور خاص طور سے بیرون ہند کی اسلامی سیاست نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پھر وقت نے اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ اس نظری بحث کے مختلف گوشوں میں دور تک جا سکتے۔

مولانا محمد علی کا ذہن اس سلسلہ میں 'بہرحال' بالکل صاف تھا کہ ملک کی مختلف ملتوں کے فرقہ وارانہ مفادات کو ہندوستان کے برتر و اعلیٰ مفادات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے، اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ ملک کا جو بھی آئین بنے اس میں اس کلیہ کا بہر طور لحاظ رکھا جائے۔ مگر وہ اس بات کو بھی زور دے کر کہتے تھے کہ ملتوں کے جو مفادات ہیں ان میں اگر ہم آہنگی اور توازن ہوگا تو وہی باہم مربوط ہوکر ملک کے عمومی مفادات بن جائیں گے۔ اور اس کے علاوہ ملک کا عام مفاد اور کیا ہے؟ اور اسی کو ۷ اکتوبر ۱۹۲۶ء کے ہمدرد میں اپنے ایک مضمون میں انھوں نے قومیت مشترکہ قرار دیا ہے۔ انھیں اپنے بعض ہم وطنوں اور مسلم احباب سے شکوہ تھا کہ وہ مغرب سے درآمد کی ہوئی قوم پرستی یا نظریۂ قومیت کو اصل قومیت سمجھتے تھے۔ کیا اس "قومیت" کے عفریتی مظاہر ان کی آنکھوں نے گزشتہ جنگ کی ہولناکیوں کی صورت میں نہیں دیکھے؟
" ایک مسلمان اس 'قومیت' کا ہرگز طرفدار نہیں ہو سکتا جو اسے اپنے دینی بھائیوں کی تنظیم سے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

مولانا محمد علی مرحوم

ترجمہ: پروفیسر محمد سرور

مولانا محمد علی کی آپ بیتی

مولانا محمد علی مرحوم جب ۱۹۲۳ء میں بیجاپور جیل میں قید تھے تو انھوں نے انگریزی میں ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی جس کا عنوان تھا: "Islam : Kingdom of God" مگر یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ اس کے شروع میں مولانا مرحوم نے مختصراً اپنے حالاتِ زندگی بھی لکھے تھے جنھیں پروفیسر محمد سرور صاحب نے ترجمہ کر کے اپنی مرتبہ کتاب: "مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے" میں شامل کیا ہے جو کتابی سائز پر ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اگرچہ یہ آپ بیتی نامکمل ہے، اس میں صرف ۱۹۲۳ء تک کے حالات ہیں مگر اس کی اہمیت یہ ہے کہ خود مولانا مرحوم کے قلم سے ہے، اس لیے اس کی تلخیص یہاں پیش کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے تلخیص میں آپ بیتی کی سبھی اہم باتیں نہ آسکیں گی، مگر کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اہم باتیں اس میں آجائیں۔ تلخیص میں ترجمے کی اصل عبارت برقرار رکھی گئی ہے اور ذیلی عنوانات بھی وہی ہیں جو فاضل مترجم نے قائم کیے ہیں، البتہ حاشیے میرے ہیں۔ مولانا مرحوم کی یہ نامکمل کتاب جنوری ۱۹۴۲ء میں (My Life : A Fragment) کے نام سے لاہور سے شائع ہو چکی ہے، جسے جناب افضل اقبال نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مسودے کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ تلخیص کرتے وقت یہ انگریزی کتاب بھی پیش نظر رہی ہے اور غیر ملکی ناموں اور طباعت کی غلطیوں کے سلسلے میں اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ عبداللطیف اعظمی

بچپن

گذشتہ صدی کے آخری چوتھائی حصے میں ریاست رام پور کے ایک اچھے خاصے آسودہ حال اور تہذیب یافتہ گھرانے میں پیدا[1] ہونے کی بنا پر یہ ایک قدرتی بات تھی کہ میں بچپن میں مذہب اسلام کی تعلیم حاصل کرتا۔ چنانچہ اپنے ہم عمر اور اپنی حیثیت کے اور بچوں کی طرح، میں ابھی چھوٹا ہی تھا کہ میں نے عربی زبان میں، ظاہر ہے بغیر ایک لفظ کا مطلب سمجھے، قرآن مجید پڑھنا سیکھا اور اس کے ساتھ ساتھ بغیر کسی خاص کوشش کے میں نے ایک درجن کے قریب قرآن مجید کی آخری مختصر سورتیں بھی حفظ یاد کر لیں، تاکہ بعد میں انھیں روزانہ نمازوں میں پڑھ سکوں ۔......

اگر میں کسی ایسے خاندان کا فرد ہوتا جو مذہبی علوم میں مہارت رکھتا ہوتا تو مجھے بے شک اپنی نصف عمر قرآن اور اس کی تفسیر اور حدیث و فقہ کی تحصیل میں گذارنی پڑتی، نیز عقائد، کلام اور منطق پڑھنی پڑتی اور ان دینی علوم کی تمہید کے طور پر مجھے کئی سال تک عربی صرف و نحو اور اس کے ساتھ عربی ادب کا مطالعہ کرنا ہوتا اور اس طرح بیس تیس سال کی عمر تک میں وہ پورا نصاب تعلیم مکمل کرتا جو تمام شمالی اور مشرقی ہند میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے عربی مدارس میں رائج ہے، اس کے بعد میں کہیں جا کر "عالم دین" کے درجے پر فائز ہو سکتا اور پھر ان ہی درسی کتابوں کی دوسروں کو تعلیم دیتا، لیکن چونکہ میں ایسے کسی خاندان سے تعلق نہ رکھتا تھا، اس لیے اس سلسلے میں مجھے صرف اتنا کرنا پڑا کہ اپنے ایک سرخ ریش استاد سے جو ریاضی، تاریخ، جغرافیہ سے، علوم کیمیا و طبیعات کا تو اس ضمن میں ذکر ہی نہ کیجیے بالکل عاری تھے، ایک درجن یا اس سے زیادہ فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں۔ جیسے شیخ سعدی کی گلستاں بوستاں، رقعات عالمگیر، سکندر نامہ از نظامی اور شاہ نامۂ فردوسی، اس کے علاوہ کچھ فارسی نثر کی کتابیں جو میرے لیے کم قابل فہم تھیں، لیکن ان کی زبان گلستانِ سعدی سے زیادہ دلکش تو نہیں لیکن اس سے زیادہ مرصع مزور تھی، جیسے ظہوری کی سہ نثر اور رنگ زیب عالمگیر

[1] ۱۷ جون ۱۹۲۷ء کے "ہمدرد" میں مولانا نے "میری زندگی کے پچاس سال" کے عنوان سے اداریہ لکھا تھا جس میں اپنی تاریخ پیدائش ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ لکھی ہے جو سنہ عیسوی کے مطابق ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء ہے۔

اصلاس کی دکن کی شیعہ سلطنتوں کی فتوحات کے بارے میں نعمت خاں عالی کی ہجو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے فارسی کی ان درسی کتابوں میں سے بہ مشکل چند ایک ہی ختم کی ہوں گی کہ مجھے رام پور کے ایک اسکول میں جو ابھی نیا ہی قائم ہوا تھا، بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے اپنے گھر سے چالیس میل دور بریلی کے ایک اسکول میں انگریزی اور اس کے ساتھ ساتھ معمول کے مطابق اسکول کے دوسرے مضامین مثلاً تاریخ اور جغرافیہ پڑھنے کے لیے جانا پڑا۔ ہمارے اکثر ماموں اور چچا زاد بھائیوں کے برخلاف جن کے والدین اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم سے پیدا ہونے والے بے دینی کے اثرات کا تختۂ مشق بنا کر ان کی نجات کو خطرے میں ڈالنے کے مخالف تھے، ہماری والدہ میرے دو بڑے بھائیوں کو پہلے ہی بریلی کے اسکول میں بھیج چکی تھیں۔

میری والدہ کی ستائیس برس کی عمر تھی کہ چند گھنٹے کی بیماری کے بعد ہمارے نوجوان والد[۲] آناً فاناً بیضے کی نذر ہو گئے اور وہ بیوہ ہو گئیں۔ ہماری والدہ نے دوسری شادی کرنے سے انکار کر دیا اور اس مشورہ دینے والوں کو بظاہر مذاق میں لیکن بباطن دل کا تمام کرب والم چھپاتے ہوئے کہا تھا کہ پہلے تو انھیں صرف ایک خاوند کا اتنے عرصے تک خیال رکھنا پڑا، لیکن اب انھیں پانچ خاوندوں اور ایک بیوی کا خیال رکھنا ہوگا۔ اس سے ان کی مراد ظاہر ہے اپنے پانچ لڑکوں اور ایک لڑکی سے تھی۔ جن میں سب سے بڑے کی عمر جو بیمار رہتا، تیرہ برس کی تھی اور سب سے چھوٹا یعنی راقم الحروف ابھی دو برس کا نہ تھا۔ عورتیں بالعموم مردوں سے زیادہ مذہبی یا کم سے کم زیادہ توہم پرست ہوتی ہیں، لیکن ہماری والدہ جنھوں نے کسی دوسرے کی مدد کے بغیر ہماری تربیت کی، گو بہت مذہبی تھیں لیکن اس کے باوجود نمایاں طور پر تعصب اور توہم پرستی سے خالی تھیں، چنانچہ جب دو بڑے بھائیوں میں سے چھوٹے یعنی شوکت صاحب کو بھی والدہ صاحبہ نے انگریزی تعلیم دلوانے کا فیصلہ کیا تو ہمارے چچا نے جو ہماری جائداد کے منتظم تھے، ان کی تعلیم کے مصارف ادا کرنے کی اجازت دینے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ خاندان

---

[۲] مولانا کے والد کا نام عبد العلی خاں تھا اور وہ نواب رام پور جناب یوسف علی خاں کے بر دالعزیز اور ممتاز درباریوں میں سے تھے، ان کا انتقال ۳۲ سال کی عمر میں ۲۰ اگست ۱۸۸۰ء میں ہوا۔

میں ایک "ملحد" کا ہونا کچھ کم برا نہیں۔ ہمارے چچا نے یہ بات بڑے ہی خلوص سے کہی تھی اور ان کی اس بات میں وہ پوری تلخی موجود تھی جو نئی تعلیم کے متعلق اس زمانے کا اور خاص طور سے اس مقام کا اس وقت خصوصی رجحان تھا لیکن ہماری والدہ عزم بالجزم کر چکی تھیں، چنانچہ انھوں نے اپنا بعض ذاتی زیور ایک ہندو مہاجن کے پاس جو سودی کاروبار کرتا تھا، اس کی نوکرانی کے ذریعہ چوری چھپے گروی رکھوا دیا اور خاندان کے دوسرے ہونے والے "ملحد" کو اس یقین کے ساتھ بریلی بھیج دیا کہ ان کے پاس کم سے کم کچھ عرصے کے لیے مصارف تعلیم ادا کرنے کے لیے کافی رقم ہے۔ جب ہمارے چچا ایک قوی ارادہ اور عزم صمیم رکھنے والی ایک خاتون سے، جن کا اپنی پوری دکھوں اور تکلیفوں بھری طویل زندگی کے باوجود خود اعتمادی کا جذبہ بھی اتنا قوی تھا، جتنا ان کا قدرتِ خداوندی کی لامحدود رحمت پر کامل اعتماد، اس طرح مات کھا گئے، تو انھوں نے مجبور ہو کر مہاجن کو سے والدہ کے زیور چھڑوا دیے اور ہماری جائداد سے اپنے دونوں بھتیجوں کی تعلیم کے مصارف ادا کرنے پر راضی ہو گئے اور اس کے بعد جب ایک اور "ملحد" نے بھی اسی تباہی کی راہ ڈھونڈی تو چچا کو اس اٹل آفت کو قبول کیے بغیر چارہ نہ رہا، چنانچہ اس طرح میں بریلی روانہ ہو گیا اور میری والدہ کو اس سلسلے میں کسی ساہوکار کے پاس اس کی نوکرانی کے ذریعہ چوری چھپے اپنا زیور گرو رکھنے کی ضرورت نہ پڑی۔ بہرحال میری زندگی کے اور بہت سے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی شوکت صاحب ہی نے میرے لیے راستہ ہموار کیا اور اور اسے میرے لیے سہل بنایا۔۔۔۔۔

انگریزی تہذیب اور انگریزی تعلیم کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کا یہ رجحان ہماری رام پور کی ریاست میں تو اور بھی زیادہ معاندانہ تھا۔ پورے صوبے میں زمین کا یہی ایک ٹکڑا تھا جو اب ایک ہندوستانی مسلمان حکمراں کے ماتحت رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس کی حیثیت اردگرد کے برطانوی ہند کے درمیان صحیح معنوں میں ایک نخلستان کی تھی۔ رام پور کے باشندوں کا اہم عنصر قسمت روہیل کھنڈ کے باقی اضلاع کی طرح ان روہیلوں کی اولاد پر مشتمل تھا جو کسی زمانے میں افغانستان سے ترکِ وطن کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ ان روہیلوں کے خلاف وارن ہسٹنگز نے صرف پیسے کی خاطر ایک بدنام ترین جنگ لڑی تھی جس میں کہ والی اودھ نے انگریزی فوجوں کو کرائے پر لیا اور ان سے روہیلوں پر حملہ کر دیا تھا۔ موجودہ ریاست رام پور روہیلوں کی آزاد

سلطنت کا جو کبھی دامن کوہ سے گنگا تک (ہمالیہ سے گنگا تک) پھیلی ہوئی تھی، بچا کھچا حصہ ہے۔ ان روہیلوں کے دلوں میں فطرتاً انگریزوں کے لیے جنھوں نے دوسرے سے پیسے لے کر ان پر چڑھائی کی تھی، زیادہ محبت نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ جب رام پور سے صرف ایک سو میل پر میرٹھ اور دہلی میں بڑے زور شور سے غدر کا ہنگامہ شروع ہوا تو وہ بہت جلد گرد و نواح کے روہیلوں کے علاقے میں بھی پھیل گیا، لیکن اس کے باوجود والیٔ رام پور نے اپنے اس الگ تھلگ مرکز سے اس بات کے علی الرغم کہ روہیلوں میں انگریزوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی مصیبت میں بری طرح پھنسے ہوئے انگریزوں کی اس موقع پر بڑی مدد کی جس کی وجہ سے والیٔ موصوف جو اپنی فیاضی کی بنا پر اپنی رعایا میں بہت ہر دل عزیز اور اس لیے بہت محبوب تھے، کافی عرصے تک بدنام رہے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے خود اپنے محافظ سپاہی جو اُن کے سونے کے کمرے کے باہر کی حفاظت پر متعین ہوتے، جب رات کو پہرہ بدلتے تو سپرد کی جانے والی قابل حفاظت چیزوں کو گنواتے ہوئے نئے سپاہیوں سے ایک زریں پلنگ کا بھی ذکر کرتے اور آخر میں سامان کی فہرست کو اس تلخ جملے پر ختم کیا جاتا

" اور وہ غدار جو اس زریں پلنگ پر سو رہا ہے "

غدر کے بعد جب مسلمانوں کے باقی ماندہ علم و فضل کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے نہ دہلی کا دربارِ شاہی رہا اور نہ لکھنؤ ہی باقی بچا، تو لے دے کے صرف ایک رام پور تھا جو اس کے لیے ایک سہارا اور پناہ گاہ بنا۔ چنانچہ رام پور کے دوسرے والی نے اپنے بعد میں آنے والے جانشینوں کے لیے عربی اور فارسی کے بہت سے نادر اور بیش قیمت مسودات کا، جن کا یہ جانشین بڑی قدر کرتے تھے اور جن میں انھوں نے بہت کچھ اضافہ بھی کیا، ایک ایسا ورثہ چھوڑا جو ہندوستان بھر کا بہترین علمی ذخیرہ بن گیا، اور یہ والی خود بھی کوئی کم پایے کے عالم نہ تھے۔ یہ حالات تھے جنھوں نے رام پور کی تہذیبی قدامت پسندی کو اور بھی تقویت دی، اور اسے باقی صوبے سے اگرچہ وہ بھی نئی تعلیم سے جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ کوئی زیادہ محبت نہیں رکھتا تھا، الگ کر دیا۔ انگریزی تعلیم سے رام پور کی عداوت کا اندازہ اس ایک دلچسپ واقعہ سے کیا جا سکتا ہے جو گذشتہ صدی کے اواخر میں پیش آیا۔ ہوا یوں کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ پرانے بے میل اور خالص ہندوستانی ریاست کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا بھی ٹیلیگراف کی تاروں کے ذریعہ باقی ہندوستان

سے ملا دیا گیا اور اتفاق سے ایک دن ایک رام پوری پٹھان کو اپنی زندگی میں پہلی دفعہ یہ حیرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ اس کے نام کہیں سے ایک تار آ گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ تار انگریزی میں تھا۔ جب وہ اور اس کے دوست اس حیرت انگیز واقعہ کے پہلے صدمہ سے ذرا سنبھلے تو انھوں نے محسوس کیا کہ اب تو انھیں اس اٹل حقیقت سے عہدہ برآ ہونا ہی پڑے گا، چنانچہ اب سوال یہ تھا کہ کافروں کی دنیا سے آنے والے اس عجیب و غریب پیغام کے راز سربستہ کو کون کھولے۔ آخر کار ان میں سے کسی شخص کو اتفاق سے یاد آ گیا کہ ہمارے خاندان کے بعض لڑکے انگریزی پڑھنے باہر بھیجے گئے ہیں اور اس نے یہ بات اس پریشان حال تار پانے والے پٹھان سے کی، لیکن جونہی اس ناشدنی مصیبت سے نکلنے کی یہ تجویز سامنے آئی، باقی سب لوگوں نے بڑے خلوص سے اس اطلاع کو ماننے سے انکار کر دیا اور ان میں سے ایک چلّا اٹھا: "استغفراللہ! تم کیا کہہ رہے ہو۔ ارے بھائی! وہ تو بڑے شریف لوگ ہیں۔"

گو ہم اپنے آپ کو "شریف لوگ" تو سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود ہم اتنے ناپاک ضرور ہو گئے کہ ہم نے انگریزی پڑھی، اگرچہ اس کے لیے ہمیں رام پور چھوڑنا پڑا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، اپنی ایک دفعہ کی لمبی چھٹیوں میں میرے بھائی ذوالفقار اور شوکت میرے انگریزی کے استاد بن گئے اور اس واقعہ پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس ترقی یافتہ ناظم نے، جس کے مشورے پر والدہ نے میرے دونوں بھائیوں کو انگریزی پڑھنے بریلی کے اسکول میں بھیجا تھا، خود رام پور میں اسی قسم کا ایک اسکول کھول دیا۔ میں نے اس اسکول میں چند ماہ پڑھا، جب میں اپنی عمر کے بارہویں سال میں قدم رکھنے والا تھا کہ مجھے اپنے بڑے بھائیوں کے ساتھ بریلی جانے کی اجازت دیدی گئی۔ شرفاء رام پور کے ضابطۂ آداب کی نظر میں ہمارے اس انحراف کا نتیجہ خواہ "الحاد" سے ہماری قربت کی شکل میں جیسا کہ ہمارے بچانے کہا تھا، نہ بھی نکلا ہو، لیکن جہاں تک ہماری مذہبی تعلیم کا تعلق ہے، بے شک اس انحراف کی وجہ سے ہمیں نقصان ضرور ہوا۔

اسکول اور کالج کا زمانہ

مجھے اس اسکول میں زیادہ عرصہ نہ رہنا پڑا کیونکہ جیسے ہی شوکت صاحب نے یہاں سے دسویں جماعت پاس کی، ہم دونوں اپنے بھائی ذوالفقار صاحب کے پاس چلے گئے، جو چند سال پہلے بریلی اسکول سے دسویں جماعت پاس کرکے علی گڑھ کالج میں داخل ہوگئے تھے۔ یہ اس وقت ایک کافی مشہور اور ایک لحاظ سے بدنام درس گاہ تھی جسے دس یا پندرہ سال پہلے انگلستان کے پبلک اسکولوں اور رہائشی کالجوں کے نمونے پر ایک "نیچری" مسلمان سرسید احمد خاں کے۔سی۔ایس۔آئی نے قائم کیا تھا۔[۱] غدر کے دوران میں جب کہ موصوف روہیل کھنڈ کے ایک فسادزدہ ضلع میں سب جج تھے، انھوں نے انگریزوں سے بڑی پرخلوص وفاداری کا ثبوت دیا تھا، اس کی بنا پر سرکاری حلقوں میں ان کا کافی اثر و رسوخ ہوگیا تھا اور اسی وجہ سے ملک میں بھی ان کو نمایاں حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور جس کے وہ بہرحال اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور مفادِ عام کے کام کرنے کے لحاظ سے پوری طرح مستحق بھی تھے۔

سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے سے کافی پہلے انھوں نے ایک ایسی مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی ایک اسکیم بنائی جس کے دروازے سب مذاہب اور سب فرقوں اور ملتوں کے لیے کھلے ہوں اور وہ ہر قسم کے مذہبی اور نسلی تفرقوں سے کلیتاً آزاد ہوں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ یونیورسٹی زیادہ تر اور بنیادی طور پر ان کی اپنی ملت اور اس کے نوجوانوں کے لیے ہو، جنھیں دنیوی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم دینا اس کا مقصد ہوگا۔ مزید برآں اس یونیورسٹی کے پیش نظر مسلمان نوجوانوں کے لیے ایک ایسا مرکز قائم کرنا ہوگا جس کی فضا خالص اسلامی ہو تاکہ اس سے فارغ التحصیل ہونے والے صرف تعلیم یافتہ اور تہذیب و ثقافت سے بہرہ مند افراد ہی نہ ہوں، بلکہ وہ تعلیم یافتہ اور تہذیب و ثقافت سے بہرہ مند مسلمان بھی ہوں۔ ....

ہمارا اسکول گو اپنی الگ عمارت میں تھا لیکن وہ عمارت تھی اسی احاطے میں، جس میں کہ کالج کے دارالاقامہ تھے، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ میں نے اسکول کی جس عمارت میں داخلہ لیا، اسے جگہ نہ ہونے کی

۱؎ مدرسۃ العلوم (ایم۔اے۔او کالج) علی گڑھ جس کا سنگِ بنیاد لارڈ لٹن نے ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو رکھا۔

وجہ سے اسکول کی عمارت سے کالج کے ایک کمرے میں، جس کے ہال میں مولانا شبلی نعمانی تفسیر پر روزانہ لیکچر دیا کرتے تھے، منتقل کر دیا گیا۔ ایک صبح کا ذکر ہے کہ میں اتفاق سے اس ہال کے باہر کھڑا تھا کہ مولانا شبلی نے اپنا مقررہ درس شروع کر دیا، میں وہیں کھڑا رہا اور پورے غور سے سنتا رہا۔ اس کے بعد ہوا یہ کہ کوئی "بڑی عمر کا" کالج کا لڑکا اپنے کالج کے مقررہ گھنٹوں کے علاوہ اس پابندی سے اس درس میں حاضر نہیں ہوتا تھا جتنا یہ چھوٹا سا اسکول کا طالب علم جو بعض دفعہ خود اپنی جماعت سے شوقیہ غائب ہو جایا کرتا تھا۔ صبح کا ناشتہ میں اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ ڈائننگ ہال میں کرتا تھا اور وہاں سے ان کے ساتھ ہی باہر آتا۔ چنانچہ جب انھوں نے مولانا شبلی کا درس سننے کے متعلق میرا اتنا شوق دیکھا تو اس کا ذکر انھوں نے مولانا سے کیا جو مجھے اپنے درس میں دیکھتے دیکھتے میرے وجود سے باخبر ہو چکے تھے۔ میں جب پہلے پہل بریلی کے اسکول میں سے علی گڑھ آیا تو میں عربی بالکل نہیں جانتا تھا، لیکن ایک دن میں نے اپنے بھائی شوکت کو ان عربی اشعار کا جو وہ پڑھ رہے تھے، حیران کن صحت کے ساتھ ترجمہ کر کے اچنبھے میں ڈال دیا۔ انھوں نے پوچھا کہ مجھے ان اشعار کا کیسے علم ہوا اور بالخصوص میں نے ان کے معنیٰ کہاں سے معلوم کئے۔ میں نے انھیں بتایا کہ ان کی کتابوں میں مولانا شبلی کی تصنیف "المامون" پڑی ہوئی ہے، اور میں نے اس میں یہ عربی اشعار اور ان کے معنیٰ پڑھے ہیں۔ شوکت صاحب یہ جان کر کہ میں نے ان اشعار کو زبانی یاد کرنے کی کوشش کوئی خاص نہیں کی، بلکہ یہ محض پر اثر رقت اور سادگی کی وجہ سے میرے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں، اتنے متاثر ہوئے کہ اس واقعہ کا ذکر انھوں نے مولانا شبلی سے کیا، لیکن پروفیسر صاحب کو اس کا یقین نہ آیا اور ان کی حیرانگی یہ سن کر اور بھی بڑھ گئی کہ میں گیارہ سال کی ناپختہ عمر میں اردو شاعری میں بھی ٹانگ اڑاتا ہوں۔ انھوں نے بغیر اطلاع کے میرا امتحان لینے کی ٹھانی، چنانچہ ایک دن میں ان کے کالج کے کمرے میں پہنچایا گیا۔ وہ میرا امتحان لینے لگے۔ انھوں نے مجھ سے اپنی کتاب "المامون" کے بارے میں سوال پوچھے، میں نے اس کتاب کو بڑی جلدی میں اور وہ بھی محض وقت گزارنے کی غرض سے، جبکہ میرے بھائی کالج میں پڑھنے گئے ہوئے تھے اور میں ابھی اسکول میں داخل نہیں ہوا تھا، پڑھا تھا، لیکن میرا خیال ہے کہ میرے حافظے کا یہ امتحان اپنے نتیجے کے اعتبار سے اطمینان بخش رہا۔ اس کے بعد مجھے ایک مصرع طرح دیا گیا کہ میں اس پر غزل کہوں۔ مجھے ان اشعار کی بنا پر نہ تو شعرا

کے لیے مخصوص قبرستان میں دفن ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ وہ اشعار ایسے تھے کہ میں آج بھی "خود اپنی مرضی سے انھیں مرنے نہ دوں"۔ اِس طرحِ مصرع پر جو شعر میں نے کہے، وہ بہرحال فن وعروض پر پورے ضرور اترے چنانچہ مولانا شبلی کے اس کڑے امتحان میں کامیاب ہونے کا مجھے پورا معاوضہ بھی ملا، یعنی یہ کہ اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ مجھے بھی ایک شام انھوں نے اپنے ہاں کھانے پر بلایا۔ لیکن مجھے یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ میں نے اس شام مولانا شبلی کی گفتگو کی دل آویزی کی داد دینے میں چنداں خوش مذاقی کا ثبوت نہ دیا۔ کیونکہ جب کافی دیر بعد کھانا جانے لگا تو انھوں نے اس ننھے شاعر کو کمرے کی سب سے بڑی آرام کرسی میں بڑے آرام سے لوٹ پوٹ مارے سویا ہوا پایا اور بعد میں جب اسے شاعرانہ خیال آفرینیوں سے جگا کر غیر شاعرانہ نثری حقیقتوں یعنی بریانی اور شاہی ٹکڑوں کی دنیا میں لایا گیا تو اس نے زور زور سے آنکھیں ملنی شروع کر دیں، تاکہ وہ اپنے آپ سے نیند کے شبہے کو دور کر سکے۔ الغرض قرآن مجید کے درس کے سلسلے میں یہ جان کر کہ میں ان کی باتوں کی داد دے سکا تھا، اور یہ کہ میں ان کے لیکچر دروازے کے باہر کھڑا ہو کر برابر رسا کرتا ہوں، انھوں نے مجھے ازراہِ عنایت اندر آنے کی اجازت دیدی اور اس طرح مجھے اس غیر معمولی مسرّت سے بہرہ مند ہونے کا موقعہ ملا کہ میں پرنسپل کے ہال کے اندر بیٹھ کر ایک کالج کے انڈرگریجویٹ کی پوری شان کے ساتھ مولانا شبلی کا درسِ قرآن سن سکوں۔ . . . .

مختصراً قرآن مجید کے معانی و مطالب سے اس طرح میرا پہلی بار تعارف ہوا، لیکن افسوس کہ اس کی مدت چند ماہ سے زیادہ نہ تھی، کیونکہ بعدازاں میری جماعت کو اسکول کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا اور اس میں اور کالج کی عمارت میں جہاں مولانا شبلی درسِ قرآن دیا کرتے تھے، اتنا فاصلہ تھا کہ میں مولانا کا درس سن کر وقت پر اسکول نہیں پہنچ سکتا تھا اور اگر اب میں غلطی نہیں کر رہا تو شاید مولانا شبلی بھی اپنے اس درس کو زیادہ عرصے تک جاری نہ رکھ سکتے تھے اور میرے خیال میں سوائے اس کے اور کوئی وجہ نہ ہوگی کہ کوئی اہم ضرورت جیسا کہ ڈائننگ ہال کے منتظمین نے صبح کے ناشتے کا وقت ذرا بعد میں کر دیا ہو، اس میں منتقل ہو گئی ہو اور اس بنا پر مولانا نے صبح کو یہ درس دینا، جس میں کہ میرے خیال میں کافی لوگ آتے تھے، چھوڑ دیا ہو، تاہم یہ صبح کے مختصر سے نصف گھنٹے تمام عمر میرے حافظے میں محفوظ رہے ہیں۔ چنانچہ بعد میں

جب حکومت نے مجھے ایک ایسی کمیٹی میں نامزدگی کی عزت بخشی جس کے ذمے ڈھاکہ میں ایک نئی طرز کی مقامی اور رہائشی یونیورسٹی کے سلسلے میں اور بالخصوص اس کے شعبۂ اسلامیات کے لیے نصاب کے تعین کا کام کیا گیا تھا اور وہ اس لیے کہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ تھی تو میں نے اس کمیٹی سے درخواست کی تھی کہ وہ مولانا شبلی کو آمادہ کرے کہ وہ ہمیں اس بارے میں اپنے خیالات سے مستفید کریں اور مولانا اس بات کے لیے خوشی راضی ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب وہ اس سلسلے میں ڈھاکہ آئے تو میں نے ان کے نصف گھنٹے روز کے وہ قرآن مجید کے درس انھیں یاد دلائے، انھیں بڑی خوشی ہوئی کہ مجھ [illegible] وہ درس یاد ہیں۔

مولانا شبلی کے ان درسوں کو کہیں سنے اتنے برس ہو گئے تھے، ایک نتیجہ میری وہ بیزاری تھی جو [illegible] اور [illegible] دو [illegible] مولویوں کی ان سطحی معلومات کے خلاف [illegible] کالجوں میں "دینیات" کا نام دیا جاتا تھا، مجھ میں پیدا ہو گئی تھی۔

آکسفرڈ میں

علی گڑھ میں آٹھ سال رہنے کے بعد، ان میں چار سال تو اسکول میں گزرے اور چار سال کالج میں میں نے الٰہ آباد کی سرکاری یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری لی۔ یہ یونیورسٹی [illegible] صوبے اور دوسرے ملحقہ صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں کے تمام اسکولوں اور کالجوں کا امتحان لیا کرتی تھی۔ میں بی۔اے میں اپنے استحقاق سے بڑھ کر اچھے درجے میں پاس ہوا تھا۔ میری اس غیر متوقع کامیابی نے میرے بھائی شوکت [illegible] معجزہ دکھانے پر آمادہ کیا اور انھوں نے کسی نہ کسی طرح سے روپے کا انتظام کر کے مجھے آکسفرڈ بھجوا [illegible] میری تعلیم کے لیے مصارف کا انتظام کرنا معجزہ سے کم نہ تھا، لیکن آج کے معجزات نہ ماننے والے دور میں یہ معجزہ آخر کار پورا ہو کر رہا۔ چنانچہ ابھی حیرت و استعجاب کے روایتی نو دن گزرنے نہیں پائے تھے کہ میں بحر [illegible] کے سمندر میں جہاز پر سوار برسات کے

لہ یہاں اغلباً فاضل مترجم کی طرف سے درج ہے کہ، "مولانا محمد علی نے ۱۸۹۶ء میں بی۔اے کیا اور صوبے میں اول آئے"، یہ سنہ صحیح نہیں ہے۔ ۱۸۹۸ء صحیح ہے (مطبع۔ عفی)

طوعاں کا مقابلہ کرتے ہوئے انگلستان جا رہا تھا اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ انگلستان تک میرا سمندر کے راستے ہی جانا طے ہوا تھا، تاکہ اس طرح میرے ابھی آخری بھائی کو (فرانس کے راستے) خشکی سے جانے کے مقابلے میں میرے سمندر کے راستے جانے کی وجہ سے ایک ہفتہ اور مل جائے جس میں [illegible] تار کے ذریعہ مجھے لندن بھجوا سکیں۔

آکسفرڈ میں، جہاں سے کہ میں نے تاریخ جدید میں آنرز کی ڈگری لی تھی، مجھے بہت اچھا موقع ملا کہ میں نے، جو اپنے اسکول کے لیے عام تاریخ کا مضمون لیا تھا، اس کے ضمن میں اپنے ہم مذہبوں کی تاریخ کے ایک حصے سے واقف ہو گیا، جو مشتمل تھا اسلامی سلطنت کے آغاز اور اس کے عروج پر اور اس میں شروع کی صلیبی جنگوں کا زمانہ بھی آتا ہے، لیکن اس کے باوجود مذہب کے بارے میں جو عہد قدیم کے مسلمانوں کے لیے تلوار اور ڈھال دونوں تھا، آکسفرڈ میں مزید کچھ نہ پڑھ سکا۔

کامریڈ کا اجرا

[illegible] کے بعد میں ہندوستان واپس آگیا۔ گویا میں نے آکسفرڈ سے ڈگری تو لے لی لیکن انڈین سول سروس (آئی۔ سی۔ ایس) کا جسے اس زمانے میں بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا جاتا تھا، میں رکن نہ [illegible] اس میں کچھ تو انگریزوں کے موسم بہار کا دخل تھا اور کچھ ایک نوجوان کی تھوڑی سی بہت احمقانہ [illegible] بہرحال اب میرے پاس مذہب کا مطالعہ نہ کرنے کا اور بھی زیادہ معقول عذر موجود تھا، کیونکہ جو نوجوان بڑودہ کے مہاراجہ گائیکواڑ جیسے جوشیلے اور باریک بیں منتظم کے ماتحت سرکاری ملازمت میں امتیاز حاصل کرنے کا خواہش مند ہو، اسے ظاہر ہے کہ بڑی مشقت پسند زندگی گزارنی تھی۔ اپنی ریاست رام پور میں محکمہ تعلیمات کے عہدے سے مستعفی ہونے کے کچھ عرصہ بعد میں مہاراجہ گائیکواڑ کی ملازمت میں آیا تھا اور رام پور میں بھی گھر کی محبت اور اس کے قابل محبت افراد کی الفت میرے جذبۂ امتیاز کے لیے مزید محرک بنی اور اس کی وجہ سے میں اپنے محکمے کے کام میں بے حد مصروف رہا۔ ١٩١٠ء کے آخر میں میں نے بڑودہ کی ملازمت بھی ترک کر دی اور کلکتہ سے اپنا ایک ہفتہ وار اخبار نکال کر صحافت میں آگیا۔ یہ نئی راہ ایک حد تک

کافی سنگین تھی اور خاص طور سے اس شخص کے لیے جو بیکن Bacon کی پُرمعنی اصطلاح میں قسمت کے حضور میں اپنی بیوی اور بچوں کی صورت میں اتنے یرغمال پیش کر چکا ہو۔ بہرحال کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بڑودہ میں ایک افسر کی حیثیت سے اپنے کام کے سلسلے میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کی تھی اور میں وہاں کی ملازمت سے صرف اس طرح علیحدہ رہ سکا تھا کہ جب مجھے پہلے اپنی علیحدگی کو دو سال کی بلا تنخواہ رخصت کی ظاہری شکل دی اور جب اس ظاہری شکل کے لیے کوئی اور صورت باقی نہ رہی اور میں نے مہاراجہ گائیکواڑ کے ہاتھ میں اپنا استعفا پیش کر دیا جسے وہ قبول کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے اور بالآخر مجبوراً وہ مجھے مزید رخصت دینے پر راضی ہو گئے۔ بے شک یہ باتیں میری خودپسندی کے جذبے کے لیے بڑی تسکین دہ تھیں، بڑا صلہ تھا میری ان محنتوں کا جن کا ظاہری علامت معمولی اپنی تندرستی پر برا اثر پڑا تھا لیکن در اصل اس وقت میرا یہ خیال تھا کہ مجھے اس ملازمت کے بجائے دوسرے دائرے میں کام کرنا چاہیے۔ میں ریاست بڑودہ ہی کی ملازمت میں تھا کہ مجھے دو اور ریاستوں کی پیش کش کو، جو بڑودہ کے عہدے سے بلند درجہ رکھتی کی حامل تھی، مسترد کرنا پڑا اور اسی قسم کی ایک تیسری پیش کش کا جواب، جو ان سے بھی زیادہ اپنے اندر دلکشی رکھتی تھی، میں نے اُس وقت دیا جب "کامریڈ" کا پہلا پرچہ نکل آیا۔[۱] درحقیقت نیلسن Nelson کے اس مشہور واقعے کی نیم سنجیدہ تقلید میں، جس میں اس نے اپنی اندھی آنکھ کے سامنے دوربین رکھ لی تھی میں نے اس آخری ریاست[۲] کی پیش کش کے لیے چوڑے تار کو جس میں مجھے وزارت پیش کی گئی تھی، اس وقت تک نہ کھولا جب تک "کامریڈ" کا پہلا پرچہ چھپ کر بکنے کے لیے کلکتے کے بازاروں میں نہیں پہنچ گیا، کیونکہ مجھے یہ شک تھا کہ یہ اَن کھلا تار اُس نوجوان والیِ ریاست کا ہو گا جس کی مصرانہ پیش کش کی

---

[۱] انگریزی کا یہ ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" کا پہلا شمارہ کلکتہ سے ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء کو شائع ہوا۔ ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے کے بعد "کامریڈ" کا دفتر دہلی منتقل ہو گیا اور ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو دلّی سے پہلا شمارہ شائع ہوا۔ ۲۶ر ستمبر ۱۹۱۴ء کے "کامریڈ" میں مولانا کا مشہور اداریہ "چوائس آف دی ٹرکس" شائع ہوا اور اس کی وجہ سے "کامریڈ" کی ضمانت ضبط ہو گئی جس کے نتیجے میں اخبار بند ہو گیا۔ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کو "کامریڈ" دوبارہ جاری ہوا اور ۲۲ر جنوری ۱۹۲۶ء تک شائع ہوتا رہا۔

[۲] وسطی ہندوستان کی ریاست جاورہ کی طرف اشارہ ہے۔

سرمائیکل اوڈائر Sir Michael O'Dwyer جیسا آدمی بڑے زوروں سے مانند

کرتا تھا اور میں اس آخری لمحے میں بھی اس قسم کی تمام ترغیبات سے بچنا چاہتا تھا صحافت کی نئی راہ اختیار کرکے مجھے ایک یقینی، گو بہت زیادہ نہ تھی، آمدنی اور مستقبل کی ترقی کے تمام مواقع سے دست بردار ہونا پڑا اور میں نے ایک جواری کی طرح وہ تمام روپیہ جو میں کہیں سے بھی اکٹھا کرسکا، ایک داؤ پر لگادیا اور یہ داؤ تھا ایڈیٹر اور پروپرائٹر بننے کا، جس نے بعد میں ایک غیر مقدس لیکن ... ''تثلیث'' یعنی ایڈیٹر، پروپرائٹر مع پرنٹر کی شکل اختیار کرلی۔ اور یہ سب کچھ میں نے ... کی خاطر ... جاذبیت ... طرفہ تر امر یہ تھا کہ مجھے اس وقت تک اس پیشے کا، جو اور پیشوں کی طرح کافی سخت ہے، تھوڑا سا بھی تجربہ نہ تھا، سوائے اس کے کہ میں کبھی کبھی ''ٹائمز آف انڈیا'' بمبئی کے لیے ... میں مجھے پہلے مسٹر لوویٹ فریزر Lovat Fraser نے لکھنے کی دعوت دی تھی، کچھ لکھ دیا کرتا تھا۔ دراصل جس چیز نے مجھے صحافت میں جانے پر اس ناقابل مدافعت حد تک مجبور کردیا وہ یہ تھی کہ اس وقت میں صحافت ہی کے ذریعہ اپنی ملت کے مسائل کے سلسلے میں کام کرکے ملت کے لیے ایک حد تک مفید بھی ہوسکتا تھا اور اس طرح اپنی روزی بھی کما سکتا تھا، لیکن اس کے باوجود میرا یہ کوئی مذہبی جذبہ نہ تھا جس کا عملی نتیجہ میرے مسلک حیات میں ... اطمینان کے ساتھ عمل پیرا ہوچکا تھا اس فوری اور جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا اس قدر اہم تبدیلی کی صورت میں نکلا، اس امر کے محرک زیادہ تر میری ملت کے دنیوی[1] مسائل تھے، جنھوں نے اس وقت میرے منصوبوں کا رخ بدلنے کا مطالبہ کیا تھا۔

لیکن جیسا کہ میں ۱۹۱۱ء میں، جب کہ میں صحافت کی اسٹیج کا روشنیوں کے سامنے پہلا کورنش بجالایا، بڑی امیدوں کے ساتھ منصوبہ بنایا تھا۔ آگے چل کر حالات بالکل اسی طرح رونما نہیں ہوئے

---

[1] یہ "دنیوی" لفظ "سیکولر" کا ترجمہ ہے، جسے آج سے ۶۶ سال پہلے مولانا محمد علی جیسے مذہب پرست نے استعمال کیا تھا۔

یہ سال اسلامی ملکوں کے لیے بڑا منحوس تھا، ترکی، ایران اور مراکش کی نئی حکومتوں کو اپنی اصلاح اور ترقی کی مسافت کی پہلی ہی منزل میں جھگڑوں سے دوچار ہونا پڑا اور ان جھگڑوں نے جلد ہی مستقل طور پر طوفان کی شکل اختیار کرلی۔ . . . میں بلقان کی پُرمصائب جنگ کے دوران میں ایک وقت شدتِ جذبات سے اتنا نے قابو ہوگیا تھا [جس کا] میں آج یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اس وقت خودکشی کرنے تک کا سوچا۔ یہ بات بظاہر بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اس قسم کے اخلاقی بزدلی کے اقدام کے لیے کچھ ہمت کی ضرورت ہوتی ہے اور میں نے اس پر بعد میں کئی دفعہ غور کیا ہے کہ آیا میں اس وقت اپنے اندر اتنی ہمت بہم کرسکتا تھا کہ میں اس منحوس رات کو آخری اور قطعی قدم اٹھا سکتا۔ اس رات اس مضمون کا رائٹر کا آخری تار مجھے ملا تھا کہ بلغاری فوجیں قسطنطنیہ کی دیواروں سے صرف ۲۵ میل دور رہ گئی ہیں وہ قسطنطنیہ جو گزشتہ پانچ صدیوں سے ہر مسلمان کے لیے اس کی سب سے اعلیٰ امیدوں کے مرکز ہونے کی وجہ سے مقدس تھا۔ میں آج پہلی دفعہ اس بات کا، جس کو مجھے اپنی کمزوری نہیں کہنی چاہئے، اعتراف کررہا ہوں۔

مشکلات کا آغاز

اس زمانے میں پریس ایکٹ کے ماتحت اخبارات و رسائل کے ناشروں اور چھاپہ خانے کے مالکوں اور کیپروں Keepers کو اچھے چال چلن کے لیے حکومت کے پاس نقد ضمانت داخل کرانی پڑتی تھی، لیکن جب ۱۹۱۰ء میں میں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تو میرے اخبار کے انگریز طابعوں Printers کو اس بنا پر ضمانت داخل کروانے سے مستثنیٰ کرایا گیا کہ اس زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست زیادہ تر انگریزی حکومت کے حق میں تھی، بلکہ ہندوستان کی دوسری زیادہ آگے بڑھی ملتوں کے مقابلے میں اس میں بسا اوقات خوشامد اور کاسہ لیسی کا شائبہ پایا جاتا تھا اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت حد تک بے ضرر سمجھا جاتا تھا دو سال بعد جب میں کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا تو ہندوستان کے اس نئے پرانے پایۂ تخت میں جہاں کلکتہ کی طرح طباعت کی سہولتیں

بعض، مجھے خود ایک چھاپہ خانے کا "کیسر" سا پڑا۔ اس وقت تک میں انگریزی حکومت کی نظروں میں کچھ تھوڑا سا مشتبہ ہو چکا تھا، چنانچہ مجھے متعدد اعلیٰ افسروں سے ملنا پڑا۔ تب کہیں جاکر مجھے ضمانت داخل کرانے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ اس بڑی عنایت کی سرکاری طور پر وجہ یہ بتائی گئی کہ دو سال پہلے کلکتہ میں میرے ساتھ ضمانت کی گئی تھی اور یہ کہ میں نے امیدواری کا یہ دو سال کا عرصہ "شرافت" سے گزارا ہے، لیکن افسوس کہ میں زیادہ دنوں تک ابھی اس "شرافت" پر قائم نہ رہ سکا، کیونکہ مجھے ان دنوں ترکی سے بلقانی اتحادیوں کے مقدونیہ میں مظالم کے متعلق ایک پمفلٹ ملا تھا جس میں عیسائیوں اور بالخصوص انگریزوں سے جو کہ بظاہر ترکوں کے برائے حلیف اور برلن کانگریس میں ان کے دوست تھے، اپیل کی گئی تھی] اس پمفلٹ کا عنوان تھا۔ "مقدونیہ میں آؤ اور ہماری مدد کرو[9]۔"

(مولانا کو جب یہ کتابچہ ملا تو مع تصاویر کے پورا کتابچہ بعنوان "کامریڈ" میں ضمیمے کے طور پر قسط وار سے ۳۰ جون ۱۹۱۳ء تک شائع کر دیا اور اس کا اردو ترجمہ روزنامہ "ہمدرد" میں، جو ۱۳ جون ۱۹۱۲ء کو اور اس سے پہلے فروری ۱۹۱۳ء میں "نقیب ہمدرد" کے نام سے جاری ہوا تھا ۶ جون سے ۲۰ جون تک شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کی وجہ سے پریس کی ضمانت ضبط ہو گئی۔ اب آگے کی کہانی خود مولانا کی زبانی سنئے، وہ فرماتے ہیں :) "دہلی کے مجسٹریٹ نے میرے چھاپہ خانے کے "کیسر" سے زیادہ سے زیادہ ضمانت جو وہ قانوناً مانگ سکتا تھا، فوری طور پر داخل کرنے کا مطالبہ کیا اور میرے اس وقت دہلی سے باہر کلکتہ میں ہونے کا بھی اس نے کوئی خیال نہ کیا۔ میرے وکیلوں نے اس ڈر سے کہ کہیں چھاپہ خانہ بند ہونے سے میری صحافتی سرگرمیاں ختم نہ ہو جائیں، تمام تر اپنی ذمہ داری پر ضمانت کی رقم جمع کرا دی۔ اس کے ایک سال بعد جس دن برطانیہ نے ترکی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا، یہ ضمانت ضبط کر لی گئی اور اس کے ساتھ اس سے پانچ گنا زیادہ دوسری ضمانت طلب کر لی۔ اب اگر اس کے بعد قانون کی خلاف ورزی ہوتی تو اس دوسری ضمانت کے علاوہ پچاس ہزار کا چھاپہ خانہ بھی ضبطی کے احکام کی نذر ہوتا۔ اس تازہ حکم ضمانت طلبی کا سبب ایک مضمون تھا جو "لندن ٹائمز" کے افتتاحیہ بعنوان "ترکوں کا انتخاب" The Choice of the Turks سے برانگیختہ ہو کر "کامریڈ" میں لکھا گیا تھا اور جو ایک ماہ ہوا شائع ہوا تھا۔[10]

---

[10] کلکتہ سے "کامریڈ" کا دفتر ۱۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کو دہلی منتقل ہوا اور ۱۲ اکتوبر (۱۹۱۲ء) کو "کامریڈ" کا پہلا شمارہ دہلی سے شائع ہوا

[9] "Come over into Macedonia and Help us"

یہ مقالہ[11] ایک عظیم بحران کے زیر اثر لکھا گیا تھا۔ میں اس وقت تک ذیابیطس کی تکلیف سے، جس وجہ سے مجھے ہفتے پہلے پاؤں کی انگلی کے ناخن کے نیچے ایک پھوڑے کے لیے سرجن کی ضرورت پڑی تھی، صاحب فراش تھا۔ اس مقالے کے بیس[12] فیصلہ کن کالم لکھنے کے لیے چالیس گھنٹے مسلسل بیٹھا رہا اور اس دوران میں نہ تو میں سویا نہ میں نے آرام کیا اور نہ کچھ کھایا ہی، سوائے اس کے کہ میں بڑی تیز کافی پیتا رہا، جسے میں بہت کم پیا کرتا تھا۔ اس مقالے کے پروف میں نے رام پور جاتے ہوئے چلتی گاڑی میں پڑھے، جہاں کہ میں اپنے بے حد عزیز بھائی کی اکلوتی بہن کے خاوند کی تدفین کے لیے، جن کا اچانک انتقال ہو گیا تھا، جا رہا تھا۔ "کامریڈ" کے اس شمارے کے لیے ایک اور افتتاحیہ پہلے کمپوز ہو چکا تھا، لیکن اس شمارے کو روک لیا گیا، تاکہ یہ نیا مقالہ اس میں شائع ہو سکے اور اس طرح وقت پر برطانیہ اور ترکی پہنچ سکے تاکہ اس کے لیے اگر ممکن ہو تو یہ اس لڑائی کو جھگڑے سے روک سکے جس کی طرف "لندن ٹائمز"[10] کا افتتاحیہ کریمیا کے حلیفوں (ترکوں) کو دھکیل رہا تھا۔ جب "کامریڈ" کے اس مقالے کی بنا پر چھاپہ خانے کی ضمانت ضبط ہوئی تو "ہمدرد" کو بھی، جو کبھی کسی کے لیے وجہ پریشانی نہ بنا تھا، اپنے دروازے بند کرنا پڑے۔ ضمانت کی ضبطی کے اعلان کے فوراً بعد ان لوگوں نے جنھیں مجھ سے ہمدردی تھی، مجھے چیک بھیجنے شروع کر دیے تاکہ میں دس ہزار روپے کی یہ ضمانت جمع کرا دوں اور واقعہ یہ ہے کہ اس ضمن میں مجھے ضمانت سے زیادہ رقم چند دن میں آ گئی، لیکن اس کے باوجود ہر ایک دوست نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ میں یہ ضمانت جمع نہ کروں، کیونکہ اگر یہ ضمانت ضبط ہوئی تو اس کے ساتھ چھاپہ خانے پر بھی زد پڑے گی۔ میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جب تک جنگ رہے گی میں دوبارہ "کامریڈ" نہیں نکالوں گا، کیونکہ حکومت ایسے قضیوں کے متعلق، جن کی حمایت میں کرتا تھا، کوئی بات صبر و تحمل سے سننے کے لیے آمادہ نہیں ہے

ایک طرف میری یہ پریشانی اور اس کے ساتھ اس قسم کے زائد کام تھے اور دوسری طرف مجھے کلکتہ اور لاہور پریس ایکٹ کے مقدمے کی وجہ سے بار بار جانا پڑا۔ ان چیزوں نے میری صحت کو بالکل تباہ کر دیا اور میرے ڈاکٹروں[13] نے بڑی آسانی سے اندازہ کی جانے والی مدت کے اندر اندر میری موت کی ضمانت دے دی اگر میں نے

---

[10] "لندن ٹائمز" مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۱۴ء۔ [11] یہ مقالہ ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کے "کامریڈ" میں شائع ہوا۔

[12] مولانا سے سہو ہوا ہے۔ یہ مقالہ "کامریڈ" کے بیس کالم میں نہیں، پورے اٹھارہ کالم میں شائع ہوا ہے اور ۸ صفحات میں ۲۳۳ سے ۲۴۰ صفحات تک ہے۔

[13] ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خاں

'لمبی چھٹی' نہ لی، جو ایک عرصے سے میرے لیے بے حد ضروری ہو گئی تھی۔ چنانچہ "ہمدرد" کو دوبارہ نکالنے کے تین ماہ[۱۳] بعد میں نے اس کی ادارت کی ذمہ داری اپنے معاون ایڈیٹروں[۱۴] اور اس کے انتظامات کی ذمہ داری اپنے بھائی شوکت صاحب کے سپرد کر دی اور خود میں رام پور چلا گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہی صوبجات متحدہ (یوپی) کے انسپکٹر جنرل پولیس، جس کے حاکم لارڈ مسٹن Lord Meston تھے جن سے ایک زمانے میں میرے بہت دوستانہ تعلقات تھے اور جو مسجد کانپور کے حادثے کے بعد کوئی دو سال سے میرے کھلم کھلا دشمن ہو گئے تھے، میرے پیچھے میرے اس علاقہ امن میں پہنچ گئے اور انھوں نے ہز ہائی نس نواب رام پور سے مل کر وہیں میری "نظربندی" کا انتظام کر دیا،[۱۵] لیکن چونکہ وہاں کی گرمی کی شدت کا اثر میری صحت پر اور بھی برا پڑا تھا، اس لیے ہز ہائی نس نے مجھے پہاڑ پر جانے کی اجازت دے دی اور جو ہی میں پہاڑ جاتا ہوا اپنے طبی مشیر اور دوست ڈاکٹر انصاری کی معیت میں، جو مسوری میں میرے ساتھ مکان میں شریک ہونے والے تھے، دہلی پہنچا[۱۶] تو میرے پاس حکومت دہلی کی طرف سے "نظربندی" کا حکم آ گیا۔[۱۷] اس حکم میں میرے بھائی شوکت صاحب بھی شامل تھے، جن کا حاجیوں کے لیے بڑی سرگرمی سے کام کرنے کے علاوہ صرف یہی ایک جرم تھا کہ میری دہلی کی غیر حاضری میں وہ پچھلے ایک ماہ سے میرے مالی انتظامات کی دیکھ بھال کر رہے تھے، پھر انھوں نے نظربندی کے اس حکم کی بڑی کامیابی سے پیروی کر کے جو ہز ہائی نس نواب رام پور سے مجبوراً لیا گیا تھا، منسوخ کرا دیا تھا۔

رہائی اور سیاسی مصروفیتیں

ایک صبح[۱۸] کو جب کہ ابھی دن نہیں چڑھا تھا، ہمیں اپنے چھندواڑہ کے مکان سے، جسے پولیس نے پہلے سے گھیرے میں لے لیا تھا، دو پولیس افسروں اور چند مسلح سپاہیوں کی معیت میں موٹر کار میں اسی میل دور بیتول کے جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ چار چار سال کی نظربندی اور جلاوطنی کے بعد ہم نے اسٹیٹ قیدی کی حیثیت سے جیل کے اندر سات مہینے اور گزارے تھے کہ اچانک دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخر میں حکومت کی طرف سے

---

[۱۳] ۱۵ اپریل ۱۹۱۵ء کو ڈھائی ماہ کی رخصت پر دہلی سے اپنے وطن روانہ ہوئے۔ [۱۴] قاضی عبدالغفار اور سید جالب دہلوی۔ [۱۵] نظربندی کا یہ حکم ۲۳ اپریل ۱۹۱۵ء کو ملا۔ [۱۶] ۱۴ مئی ۱۹۱۵ء کو بروز جمعہ۔ [۱۷] ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء کا یہ حکم نامہ ۱۶ مئی کو علی برادران پر تعمیل کیا گیا اور ۱۶ مئی ۱۹۱۵ء کو بعد نماز جمعہ علی برادران مہرولی کے لیے روانہ ہوئے، جہاں انھیں نظربند کیا گیا تھا۔ [۱۸] ۸ جون ۱۹۱۹ء

بذریعہ تار "لائن کلیر" (راستہ صاف ہے) کا پیغام ملا اور اس کے چند ہی گھنٹے بعد ہم پہلے کی طرح ایک بار پھر آزاد تھے[20] اور بسرعت تمام امرتسر کی طرف، جہاں کہ انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ اور نئی نئی ہوئی خلافت کانفرنس کے اپنے اپنے اجلاس ہو رہے تھے یا ہونے والے تھے، جا رہے تھے۔

ہمیں امرتسر پہنچے ابھی دو دن بھی نہیں ہوئے تھے[21] کہ میرے بھائی نے، جو خلافت کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کے لیے منتخب کیے گئے تھے، مجھ تک یہ چونکا دینے والی خبر پہنچائی کہ کانفرنس کے منتظمین کا اصرار ہے کہ میں یورپ جانے والے وفدِ خلافت کی قیادت کروں، چنانچہ ہوا یہ کہ ابھی ہمیں رہا ہوئے مشکل ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ میں اپنے تیس[22] ساتھیوں کے ہمراہ "آسٹرین لائڈ اسٹیمر Austrian Liyod Steamer" میں سوار سمندر میں سفر کرتا ہوا وینس کی طرف[23] جا رہا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ[24] جانے والے سامان کا بھی اس وقت پتہ چلا کہ جب جہاز کے اوپر میرے پرانے نوکر نے جو بچپن سے میرا ساتھی رہا ہے اور کچھ عرصے کے لیے مدرسے میں میرا ہم جماعت بھی رہ چکا ہے، مجھے اپنے بکسوں کی کنجیاں اور ان چیزوں کی فہرست دی، جن کی اس کے خیال میں مجھے یورپ میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں میں واپس ہندوستان پہنچا لیکن جیسا کہ میری بیوی اور بچیوں کو بعد میں معلوم ہوا کہ میں اپنے گھر نہ پہنچ سکا۔ مہاتما گاندھی، میرے بھائی اور میں پورے ہندوستان کے لیے مسلسل سفر پر رہے اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ بہت سے مہینوں کے بعد بھی دو یا تین دن متصل ایسے گذرے ہوں کہ ہم ایک جگہ رہے ہوں، چنانچہ ریل گاڑی ہی میرا گھر بن گئی۔ چنانچہ ہم نے کئی ماہ اسی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں سفر کرنے اکٹھے گزارے۔ ہم، مہاتما گاندھی اور اپنے ساتھی کارکنوں اور سکریٹریوں کی ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو والٹیر ریلوے اسٹیشن پر جب کہ ہم مدراس اور مالابار کے فساد زدہ علاقے کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے گرفتار

---

[20] ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہائی عمل میں آئی۔ [21] ۳۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو اجلاس مسلم لیگ (منعقدہ امرتسر) کو اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کو اجلاس کانگریس کو خطاب کیا۔ [22] مولانا سید سلیمان ندوی، مسٹر سید حسین (جو اس وقت بمبئی کرانیکل میں تھے) اور مسلم یونیورسٹی کے نامور اولڈ بوائے حسن محمد حیات (وفد کے سکریٹری)

[23] یہ وفد یکم فروری ۱۹۲۰ء کو غالباً لکھنؤ سے روانہ ہوا۔ [24] محمد حسین جو مولانا کی وفات کے بعد ان کی سب سے چھوٹی صاحبزادی گلنار بی، بیگم شعیب قریشی کی خدمت میں رہے۔

کر لیا گیا۔ اس وقت ہم پھر ایک دوسرے سے الگ ہوگئے، لیکن یہ بات میرے لیے تسکین بخش ہے، جس میں کچھ میری حیرانگی اور استعجاب بھی شامل ہے کہ اب میری بیوی بھی سفر کر رہی ہے اور وہ بھی پبلک مصارف پر۔ ~~حتیٰ~~ اور ان کا ہم سفر میرا بھتیجا اور داماد بحیثیت سکریٹری کے ہے اور انھوں نے جامعہ طبیہ اسلامیہ اور خلافت فنڈ کے لیے کافی بڑی رقمیں جمع کی ہیں۔

والٹیر اسٹیشن پر ایک ایسے وارنٹ کے ذریعہ میری گرفتاری، جس میں اس ضلع کے مجسٹریٹ نے جہاں میں اب تک کبھی نہیں گیا تھا، مجھ سے اچھے سلوک اور امن قائم رکھنے کے لیے ضمانت چاہی تھی۔ دراصل جیسا کہ بعد میں واقعات سے ثابت ہوا، ایک تدبیر تھی مجھے اس وقت تک روکے رکھنے کی، جب تک کہ ایک اور وارنٹ دور دراز کراچی سے یہ پہنچ جائے۔ چنانچہ میرے مدراس پہنچنے سے قبل ہی اور وہاں بار تو ابھی بہت دور تھا، مجھے پکڑ کر ایک مقامی جیل میں بند کر دیا گیا۔ اس واقعہ پر تین دن گزرے تھے کہ میرے خلاف مقدمے کی کارروائی واپس لے لی گئی اور جو ہی میں جیل سے باہر نکلا، احاطہ بمبئی کے ایک پولیس افسر نے کراچی سے جاری کردہ ایک وارنٹ پر مجھے گرفتار کر لیا۔ کراچی سے میرے خلاف یہ وارنٹ اس قرارداد کی بنا پر جاری کیا گیا تھا جو خلافت کانفرنس منعقدہ کراچی[25] نے میری زیر صدارت پاس کی تھی۔ میرے بھائی اور میرے علاوہ اس سلسلے میں پانچ اور[26] بھی کارکن، جن میں ایک بلند پائے کا مذہبی لیڈر ایک ہندو بھی تھا، ماخوذ تھے اور الزام یہ تھا کہ انھوں نے مسلمان فوجیوں کو حکومت کے خلاف ورغلایا ہے۔ ہم اس مقدمے میں عبور دریائے شور کی توقع کر رہے تھے لیکن جیوری نے، جس میں ایک یورپی، دو گوا کے عیسائی اور دو ہندو تھے، اس الزام سے ہمیں بالاتفاق بری قرار دیا، تاہم ایک سابق جہاز کے معمولی سے الزام میں جج نے چھ مسلمانوں کو دو دو سال قید بامشقت کی سزا دی اور ساتھ ہی ہندو ملزم کو بری کر دیا۔ ایک عرصے کے بعد اب کہیں جا کر کراچی جیل میں جائے امن ملی، جہاں کہ حکومت کی نظر میں "سٹرینگ کر نا چھوڑ دیتے ہیں" اور "خبرپروں" کی نظر میں تھکے ہوؤں کو کچھ آرام مل جاتا ہے۔

یہیں — موسم سرما کی طویل راتوں کے دوران میں مجھے یہ خیال آیا کہ جیل کی دن کی مشقت کے بعد

---

[25] مورخہ ۹ جولائی ۱۹۲۱ء [26] علی برادران کے علاوہ دوسرے پانچ حضرات کے نام یہ ہیں: (۱) مولانا حسین احمد مدنی (۲) ڈاکٹر سیف الدین کچلو (۳) مولوی نثار احمد (کانپوری) (۴) پیر غلام مجدد مٹیاروی (سندھی) اور (۵) سری سنکر اچاریہ جی (شاردا پیٹھ)

مجھے کچھ فراغت اور سکون و اطمینان مل جاتا ہے جس کی مجھے لکھنے کے لیے ضرورت تھی، چنانچہ میں نے ایسی کتابیں منگانے اور اپنے پیسوں سے لکھنے کا سامان خریدنے کی اجازت مانگی تاکہ تھوڑا بہت تصنیف و تالیف کا کام کر سکوں۔ جیل میں "بی" سزا کے چار پانچ مہینے گزر چکا تھا کہ مجھے ضروری اجازت مل گئی اور اس کے چند ماہ بعد مطلوبہ کتابوں کی فہرست بھی منظور کر لی گئی اور جن کتابوں کی مجھے ضرورت تھی، ان میں سے اکثر کتابیں بتدریج آنی شروع ہو گئیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیل کی مقررہ مشقت کرنے کے بعد سنجیدہ قسم کے ذہنی کام کرنے کے متعلق میں نے اپنی استعداد کا اس سے کہیں زیادہ فراخ دلی سے اندازہ لگایا تھا جتنی وہ تجربے کے بعد ثابت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ اس عرصے میں رسول اللہ کی سیرت مرتب کرنے کے علاوہ آپؐ کے اس پیغام کی تشریح بھی کر سکوں گا جو آپؐ انسانیت کے لیے لائے تھے۔ سیرت پر مولانا شبلی کی معرکۃ الآراء تصنیف پر مبنی ہوتی، گو جن حقوق کے لیے یہ دونوں کتابیں لکھی جائیں، ان کی ذہنی استعداد کا ان کی ترتیب میں ضروری لحاظ رکھا جاتا، چنانچہ میں نے بڑی کتاب کو پہلے شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے ہر شام کو مطالعہ کرنے لگا۔ یہ کام کافی حد تک میری طبیعت کے مناسب تھا، لیکن باہر کی دنیا سے خط و کتابت کرنے میں ایک قیدی کو جو مشکلات پیش آتی ہیں، نیز اس پر جو پابندیاں عائد ہوتی ہیں، ان کی وجہ سے جن کتابوں کی مجھے ضرورت تھی، وہ بہت دیر میں مجھے ملیں، چنانچہ جب میری سزائے قید میں ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا تو میں نے محسوس کیا کہ ان حالات میں جن میں کہ میں اس وقت ہوں، رسول صلعم کی سیرت کو مرتب کرنے جیسا کام سرانجام دینا ناممکن ہے۔

مولانا شبلی کی سیرت النبی کی دو جلدوں کے بعد اس وقت تک کوئی جلد شائع نہیں ہوئی تھی اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے زیر ترتیب جلد کا مسودہ منگوانا، گو اس قدر طویل مسافت کے باوجود اسے حفاظت بھیجا جا سکتا تھا، ممکن نہ تھا اور اس کی غیر موجودگی میرے لیے ایک کافی بڑی لائبریری تک رسائی جو اس سے کہیں بڑی ہوتی جتنی کہ موجودہ حالات میں میں فراہم کر سکتا تھا، ایک ناگزیر شرط تھی، مزید براں اس سلسلے میں ایسے اہل علم دوستوں سے جو مجھ سے زیادہ عربی جانتے ہوں، مستقل مشورہ کرنے کی بھی ضرورت تھی، ان اسباب کی بنا پر میں نے رسول اللہ کی سیرت مرتب کرنے کا خیال ترک کر دیا اور اسلام کی تشریح و توضیح کے نسبتاً کم حوصلہ مندانہ کام پر جو رسول اللہؐ کی سیرت سے کہیں زیادہ ذاتی نوعیت کا ہو سکتا تھا، اکتفا کرنے کا فیصلہ کیا۔

جب سے میں نے قرآن مجید کا مطالعہ شروع کیا ہے اس وقت سے اب تک میں نے اسلام کے بارے میں

مسلمانوں اور اس کے علاوہ اس کے ناقدوں کے نقطۂ نظر سے لکھا ہوا ادب بہت کافی پڑھا ہے لیکن اس وقت تک جو کچھ بھی میں نے پڑھا ہے، اس میں کسی چیز نے بھی میری نظروں میں اسلام کی اہمیت کو نہیں بدلا۔ قرآن مجید کا بنیادی موضوع اور اسی طرح جیسا کہ بعد میں مجھ پر منکشف ہوا، رسول اللہ صلعم کی صحیح احادیث کا بھی، خدا کی بادشاہت بہت Kingdom of God اور اس کے خلیفہ و نائب کی حیثیت سے انسان کی خدمت ہے، اور اس وقت سے لے کر اب تک جو کچھ میں نے پڑھا ہے، اس سے اسلام کے پیش کردہ حکومتِ الٰہی کے تصور ہی کی مزید تائید ہوتی ہے اور جیسا کہ میں اپنے ان شخصی تجربات کے بیان میں بالکل شروع ہی میں کہہ چکا ہوں کہ میں ایک ماہر کی حیثیت سے ماہروں کے لیے یہ کتاب نہیں لکھ رہا بلکہ ایک "معمولی آدمی" اپنے جیسے "معمولی آدمیوں" کے لیے لکھ رہا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ ایک غیر جانبدار غیر مسلم کے، جو اسی طرح اسلام کا مطالعہ کرے گا جیسے میں نے کیا ہے، میری طرح کے شخصی تجربات ہوں گے۔ میں دینیات کا عالم نہیں ہوں اور مجھے امید ہے کہ ایک عام غیر مسلم جو اس نیت سے مسلمانوں کے دینی معتقدات کا مطالعہ کرتا ہے کہ وہ ان معتقدات کو پیش کرنے والے کی بات کا انکار کرنے کے لیے ہمہ تن تیار رہے گا، اس کتاب کو اس جذبہ کے تحت پڑھنے کی کوشش نہیں کرے گا لیکن یہاں ایک بات کی صراحت کر دینا ضروری ہے۔ میں نہ اسلام کے مسلمہ عقائد کا مخالف ہوں نہ کوئی مدعی ہوں کہ میں اسلام کے متعلق ایسا نظریہ پیش کروں جو اب تک کبھی سننے میں نہیں آیا اور کوئی ایسی چیز جو خاص میری اپنی تخلیق ہو، اسے کروڑوں مسلمانوں کا عقیدہ قرار دے کر ان کے سر منڈھنے کی کوشش کروں۔ میرا راسخ الاعتقادی سے گہرا تعلق ہے اور یہ نہ صرف یہ کہ مجھے شک و شبہ کی نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ اس کے برعکس اس نے مجھے اپنے سینے سے بھی لگا رکھا ہے۔ البتہ بدقسمتی صرف یہ ہے کہ اس راسخ الاعتقادی نے اسلام کے زوال کے زمانے میں ان چیزوں پر زیادہ زور دیا، جو نسبتاً کم اہم تھیں اور ان کو زیادہ اہمیت نہیں دی جو اس کی مستحق تھیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مولانا محمد علی جوہر —— چند نقوش و تاثرات

میرے شعور و تعقل کا آغاز سنہ ۱۹۲۱، ۲۲ء سے ہوتا ہے، جب میری عمر مشکل سے ۸، ۹ سال کی تھی، انسانی شعور کا تعلق عمر، انسان کی اندرونی صلاحیتوں اور ذہانت ہی سے نہیں ہے، ماحول، واقعات اور خارجی دنیا سے بھی ہے، کبھی کوئی طوفانی بلاخیز کوئی حرصاعقہ اثر، کوئی فتنۂ عالم آشوب یا شہر آشوب کسی کم سن بچہ کے شعور کو قبل از وقت بیدار کر دیتا ہے، اور وہ کام کرتا ہے جو ماہ و سال کی گردش اور تعلیم و تربیت کی مسیحائی نہیں کرتی صورِ اسرافیل پر اگر مردے جی اٹھیں گے، تو ہنگامۂ رستخیز پر سوتوں کا جاگ جانا، شعور کا بیدار ہو جانا، اور بچوں کا بڑوں کے بہت سے احساسات اور گرد و پیش کی دنیا کو واقعات سے باخبر ہو جانا اور ان کا اپنے سن و فہم کے مطابق اپنے بزرگوں کے رنج و غم کا ادراک کرنا محل تعجب نہیں۔

کچھ ایسا ہی واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ جنہوں نے سنہ ۲۱، ۲۲ء کا زمانہ نہیں دیکھا ان کو کیا بتایا جائے کہ اس وقت ہندوستان کس طرح کوہ آتش فشاں بنا ہوا تھا، اتحادیوں کی فتح، سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف ان کے منصوبوں اور خلافت کو ختم کر دینے کی کوششوں کی خبر نے سارے ہندوستان میں آگ لگا رکھی تھی، مسجدوں، مجلسوں، مدرسوں، گھروں، دکانوں اور خلوت و جلوت کہیں گویا اس گفتگو کے سوا کوئی گفتگو نہ تھی، ہمارا شہر لکھنؤ جو شروع سے سیاسی تحریکوں کا بڑا مرکز رہا ہے۔ اس تحریک میں بھی پیش پیش تھا، اسی تحریک کے ایک بڑے رہنما مولانا عبدالباری صاحب، اسی شہر کے رہنے والے تھے، جن کا دولت خانہ محل سرائے فرنگی محل اس تحریک کے ہندو مسلم رہنماؤں کی لکھنؤ میں فرودگاہ تھی، اور خود گاندھی جی وہیں ٹھہرا کرتے تھے، اسی شہر میں چند سال پہلے مولانا شبلی نے اپنی وہ زلزلہ انگیز نظم

پڑھی تھی جو "ہنگامۂ بلقان" کے نام سے سارے ہندوستان میں مشہور ہوئی اور جس کے پہلے دو شعر یہ تھے ؎

خلافت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ ملک و ملت ہے عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

ہندوستان میں ہر چھوٹے بڑے بچے اور مرد و عورت کی زبان پر یہ شعر تھا ؎

بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو

معلوم نہیں یہ شعر کس کا تھا، لیکن اس کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ کم شعروں کو حاصل ہوئی ہوگی۔ مجھے یاد نہیں کہ اس شعر سے پہلے یہ محبوب نام کان میں پڑ چکا تھا یا یہی شعر اس کا ذریعہ تھا، بہرحال اس میں شک نہیں کہ اس پوری بارات کا دولہا محمد علی تھے۔ اور وہ اس وقت ہندوستان کے بے تاج بادشاہ معلوم ہوتے تھے۔ گھر سے نکلتا اور کسی عزیز کے یہاں امین آباد تک جانا ہوتا تو اس سڑک کے دونوں کناروں پر جس کے دونوں جانب پارک ہیں چھوٹے چھوٹے رسالے جن میں اس طرح کی نظمیں ہوتیں، تصویریں جن میں دکھایا گیا ہوتا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان رسہ کشی ہو رہی ہے، ہندوستانیوں کی ٹیم میں مولانا محمد علی اور سب کے آخر میں مولانا شوکت علی اپنے بھاری بھرکم جثہ کے ساتھ ہیں اور انہیں کا پلہ بھاری ہے، شہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت اٹھ گئی ہے، اور علی برادران اور گاندھی جی ہی کی حکومت ہے، پرنس آف ویلز کا لکھنؤ آنا بھی یاد ہے، میں کسی ضرورت سے گھر سے نکلا دیکھا تو شہر میں ہُو کا عالم ہے، بھرے بازار، چلتی ہوئی سڑکیں ویران پڑی ہیں، امین الدولہ پارک (جھنڈے والے پارک) میں ولایتی کپڑوں میں آگ لگائی جاتی تھی، جو لوگ ولایتی کپڑوں میں ملبوس ہوتے وہ راستہ چھوڑ کر چلتے، پھر ایک مرتبہ اسی شعور کے زمانے میں گاندھی جی اور علی برادران کی آمد بھی ہوئی، ایسا ہجوم ایسا جوش و خروش اور کسی لیڈر کی ایسی مقبولیت و محبوبیت نہ دیکھی، نہ دیکھنے کی امید ہے، ہمارے کئی عزیز انگریزی اسکولوں میں پڑھتے تھے، وہ تعلیم ترک کرکے اسکولوں سے نکل آئے، اور کسی نیشنل اسکول میں داخلہ لیا، جن لوگوں کو اعزازی یا امتیازی تمغے ملے تھے اور ان پر انگریز حکام کے نام یا انگریزی لکھی ہوئی تھی ان کو پاؤں سے روندتے، ایسے عزیزوں اور محلہ والوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے انگریزی لباس بلکہ انگریزی معاشرت ترک کرکے دیسی لباس اور ہندوستانی معاشرت اختیار کرلی، تحریک نیم دینی نیم سیاسی تھی مگر اس کا محرک جذبہ دینی تھا، اور اس کے قائد دینی مزاج اور دینی خدمات کے لوگ تھے، اس کی دلیلیں بھی مذہب سے لائی جاتی تھیں، اور خلافت کی حمایت کے ذریعہ مذہب اور مسلمانوں کی

عزت کو بچانے کا نعرہ دبا گیا تھا، اس لیے اس سے سویا ہوا مذہبی احساس جاگتا تھا، غیرت قومی انگڑائی لیتی تھی، اور خاکستر میں دبی ہوئی مجاہدانہ چنگاریاں سلگتی تھیں، کتنے بے نمازی نماز کے پابند ہو گئے، لوگوں نے داڑھیاں چھوڑ دیں، جیل جا کر کیسے آدمیوں کی زندگی سرتاسر بدل گئی، جو کہ علی برادران نے خود مغربیت سے اسلامیت کی طرف، جدید فیشن اور فراغت و تجمل سے فقر و درویشی اور سادگی و جفاکشی کی طرف ہجرت کی تھی۔ وہ "مسٹر" سے مولانا بن گئے تھے، اس لیے ہزاروں آدمی ان کی تقلید میں مغربی اور امیرانہ طرز معاشرت چھوڑ کر اس سطح پر اتر آئے تھے جو متوسط درجہ کے ہندوستانیوں کی تھی، اب وہ کوٹ پتلون کے بجائے کھدر کے کرتہ پاجامے میں نظر آنے لگے تھے لوگوں نے اس جدید تعلیم یافتہ آسودہ حال اور مغرب زدہ لوگوں کو جن کو سرکار میں قرب رسائی اور اچھے عہدہ میں ترقی و اعزاز کے سوا کوئی فکر اور دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی، مسلمانوں کی زبوں حالی، عالم اسلام کے زوال و نکبت، اور خلافت اسلامی کی دل شکستہ پر ہچکیوں سے روتے ہوئے دیکھا ہے، اور اس تبدیلی حال پر بڑے بڑے واقفوں کو کہتے ہوئے سنا ہے

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی؟

یہ سب تحریک خلافت کے رہنماؤں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی کی تقریروں، مضامین، نظموں، اور قربانیوں کا نتیجہ تھا، لیکن اس میں اصل روح مولانا محمد علی کی کام کر رہی تھی جو ایک "شعلۂ جوالہ" بنے ہوئے تھے، جس نے گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ پھر کر پورے ملک کو حرارت ایمانی اور جوش آزادی سے مخمور بنا دیا تھا، دراصل انھیں نے گاندھی جی کو ان کے گوشۂ عزلت سے نکالا اور ان کے ساتھ دورہ کر کے اور ان کی "جیکار" لگوا کر ان کو عوامی لیڈر اور ملک کا محبوب رہنما بنا دیا۔ تحریک خلافت و آزادئ وطن کے ساتھ، تحریک ترک موالات کو ضم کر کے غیر ملکی حکومت کے خلاف نفرت و بغاوت کی آگ بھڑکا دی، اور آزادئ وطن کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ سارے ملک یہاں تک کہ فوج و پولیس میں ایک جنبش اور مضبوط انگریزی حکومت میں ایک ارتعاش پیدا ہو گیا ہندو مسلم اتحاد کا سماں سارے ملک میں نظر آتا تھا، اور سب اس نشہ میں سرشار تھے، پھر بار بار جیل جا کر اور مہینوں اور برسوں وہاں رہ کر جیل جانے کو ایک ہنسی کھیل بنا دیا اور حکومت ہند کو ایک آزمائش میں مبتلا کر دیا۔

لیکن افسوس ہے کہ ۱۹۲۳ء میں جب وہ آخری بار جیل سے باہر آئے تو انگریزی حکومت (جس کی

جس وقت ایک یہودی النس وائسرائے لارڈ ریڈنگ کر رہا تھا، سازش کامیاب ہو چکی تھی، ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ شدھی سنگٹھن کی تحریک آندھی کی طرح چل رہی تھی۔ بڑے بڑے شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات اس طرح پھوٹ پڑے تھے، مولانا محمد علی نے اپنی اسی سادگی اور مردانگی سے ان کی مذمت کی جو ایک مسلمان کا شیوہ اور ایک بہادر سپاہی کا مزاج ہے، لیکن ان کے رحمی دل کو اس سے بڑی چوٹ لگی کہ تحریک آزادی کے ہندو رہنماؤں نے (بجز چند کو مستثنیٰ کرکے) اس صاف دماغ اور کھلے دل سے ان فسادات کی مذمت اور اپنے فرقہ کے احتساب حال پر تنقید نہیں کی اور وہ ان کے خلاف اس طرح صف آرا نہیں ہوئے جس کی وہ توقع رکھتے تھے۔ اس وقت سے مولانا محمد علی نے اس طرح سوچنا شروع کیا کہ ہندوستان کی قسمت ان کے ہم خیال اور ہم مذہب لوگوں ہی سے وابستہ ہے، اور رفتہ رفتہ انڈین نیشنل کانگریس سے وہ مایوس ہوتے چلے گئے اور انھوں نے اپنی سرگرمیوں کا میدان مسلمانوں کو بنایا۔

اللہ نے محمد علی کو وہ سب صلاحیتیں اور کمالات عطا فرمائے تھے جو ایسے رہنماؤں کے لیے ضروری ہیں جو ملکوں اور قوموں میں انقلاب لاتے ہیں، سوتی بستی جگاتے ہیں، اور مُردوں کو سہارے سے جِلا دیتے ہیں۔ خلوص کا ایک دریائے بیکراں، پارے کی سیمابی اور بجلیوں کی بیتابی، خطابت کی جادوگری، شخصیت کی دلآویزی، خلقی و فطری محبوبیت و وجیہی، اور سب سے بڑھ کر دل کی وہ چوٹ اور جگر کا وہ زخم جو اس درجہ میں (شیخ الہند مولانا محمود حسن کو مستثنیٰ کرکے) ان کے ساتھیوں میں سے کم کسی کے حصہ میں آیا تھا۔ یہی وہ احساس و یقین تھا جس نے ان سے یہ شعر کہلوائے جو ان کے حال کی سچی تصویر تھی ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے   پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو   خوش ہوں کہ وہ پیغامِ قضا میرے لیے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف   کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

پھر ان کی وہ قلندرانہ شان، اور مجذوبانہ ادا جس نے حق کہنے میں کبھی بڑے چھوٹے، دوست دشمن کی پروا نہیں کی اور جس کے نتیجہ میں وہ بعض اوقات میدان میں تنہا رہ گئے، لیکن انھوں نے اس تنہائی کی کبھی پروا نہ کی بلکہ اس کو وسیلۂ نجات اور شرطِ ایمان سمجھا اور ان کی زبان سے وہ (الہامی) شعر نکلا جو بڑے سے بڑے عارف و موحد کی زبان سے نکل سکتا ہے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے   یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

انھوں نے حق کہنے میں نہ اپنے شیخ طریقت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی پروا کی نہ اپنے سب سے محترم و محبوب شریک کار اور جنگ آزادی کے رفیق کار اور گاندھی جی کی، نہ اپنے بعض محسنوں اور کرم فرماؤں مہاراجہ محمود آباد وغیرہ کی، نہ اس وقت کی سب سے بڑی سلطنت (برطانیہ) کے وزیر اعظم اور عہدہ داروں مسٹر لائڈ جارج اور میکڈانلڈ وغیرہ کی نہ سب سے زیادہ قابل احترام سرزمین کے فرماں روا اور بانی سلطنت سلطان عبدالعزیز بن سعود کی۔ انھوں نے ہر جگہ حق بات کہی اور صاف اور بے لاگ کہی۔ اقبال کے اس شعر کے وہ صحیح طور پر مصداق تھے ؎

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی   اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی!

وہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے ملی خصائص اور مزاج کا نقطۂ عروج تھے، عقل پر محبت کی فرمانروائی، شمع کی جاں گدازی اور پروانہ کی جاں نثاری، ذات نبوی سے عشق و شیفتگی، عالم اسلام و ملت اسلامیہ کی حد سے بڑھی ہوئی فکر، عواقب و نتائج سے بے پروائی "حاتم دگراں و گدائے خویشتن" کی پرانی خو، فقیری میں شاہانہ خیالات، احتیاج میں خودداری و عزت نفس، استغنا اور دولت کی حالت میں خاکساری و انکساری وہ حضرت علی کے مقولہ " احذروا صولة الكريم اذا جاع واللئيم اذا شبع "[1] کی صحیح تصویر تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ ان جیسا مخلص، جری اور نڈر، بہادر اور حق پرست عاشق اسلام قائد اس ملت کو اس صدی میں نہیں ملا۔ لیکن بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ انھوں نے ایک ایسے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور اس کو اپنی سحر انگیز شخصیت کی توانائیوں اور قائدانہ صلاحیتوں کا محور بنایا تھا، جس کی زمام کار ان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ملک کے باہر سات سمندر پار ایک ایسی جماعت و فرد کے ہاتھ میں تھی جو ان کے مشوروں کا تابع اور ان کی ہدایتوں کا پابند نہ تھا، بلکہ اپنے مصالح اور مغربی طاقتوں کے چشم و ابرو کا غلام تھا، یعنی مسئلہ خلافت جس کو کمال اتاترک نے اتحادیوں کے اشارہ اور خاص طور پر برطانیہ کے مشورہ اور ہدایت پر یک جنبش لب یا گردش قلم ختم کر دیا۔ اور سارا عالم اسلام خاص طور پر ہندوستان کا مجروح و ستم رسیدہ مسلمان دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

پھر جب ہندوستان کے مسائل میں ان کی رہنمائی اور قیادت کا وقت آیا تو وہ اپنی بہترین توانائیاں صرف کر چکے تھے، ان کا دل زخموں سے چور چور تھا، اور ان کا جسم بیماریوں سے نڈھال و نزار، ملت کی خود دہ گیری، حساب طلبی، تنقید و ملامت، اندرونی انتشار، بیرونی مخالفت اور ساتھیوں کی بے وفائی سے ان کا

---

[1] شریف آدمی کے دبدبہ اور طنطنہ سے ڈرو جب وہ بھوکا ہو، اور سفلہ طبیعت کی علوحش سے ہوشیار رہو جب وہ شکم سیر ہو

پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا، وہ اپنی جوانی، طاقت و ہمت کے زمانے میں جن لوگوں کے ساتھ تھے اور جنہوں نے اس ملک کو برباد کرنے کے پیمان کے ساتھ قربانیاں دی تھیں، ان کو بعض تلخ تجربوں اور واقعات کی بنا پر چھوڑ چکے تھے اور اب جن لوگوں کی انھوں نے رفاقت اختیار کی تھی یا جو ان کے گرد جمع ہو گئے تھے، وہ ان کے خلوص، جذبۂ قربانی، قابلیت اور بلند عزائم میں ان سے کوئی نسبت نہیں رکھتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ "یوسف بے کارواں" بن رہ گئے۔

آخر میں پھر ان کی مضطرب روح اور بے چین طبیعت نے اپنا جوہر دکھایا اور اس نے اپنے مرکز اصلی کی طرف پرواز کی۔ ۱۹۳۰-۳۱ء کی گول میز کانفرنس لندن میں وہ شیر کی طرح گرجے اور بلبل کی طرح چہکے اور اس وقت ایک ہندوستان جانے سے انکار کر دیا جب تک ان کو اس ملک کی آزادی کا مکمل پروانہ نہ مل جائے۔ وہیں (۴ جنوری ۱۹۳۱ء) ان کے طائر روح نے قفس عنصری سے پرواز کی، مفتی اعظم فلسطین الحاج سید امین الحسینی کی دعوت و تحریک پر ان کی نعش فلسطین لے جائی گئی، اور ان کے جسم خاکی کو سرزمین انبیاء اور معراج نبوی کی پہلی منزل بیت المقدس کے ایک گوشہ میں جگہ ملی، اقبالؒ نے خوب کہا ہے ؎

خاک قدس او را بہ آغوش تمنا در گرفت — سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

اور ان کا یہ کہنا بھی صحیح نکلا ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر — یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مجھے مولانا کی چند بار زیارت حاصل ہوئی، ایک مرتبہ میں نے ان کو ندوۃ العلماء کے جلسہ کانپور منعقدہ ۱۹۲ء میں قریب سے دیکھا۔ ایک مرتبہ امین آباد پارک میں سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر ان کی تقریر سنی۔ ایک مرتبہ امین الدولہ پارک میں ان کو اپنے عربی لباس میں ایک غیر مسلم دوست سے انگریزی میں گفتگو کرتے ہوئے قریب سے سنا۔ وہ ہر طرح سے ملت کے سردار معلوم ہوتے تھے۔ بلند و بالا قد، پر گوشت اور موزوں جسم، متناسب اعضا، باوقار نورانی چہرہ، کھدر کے لباس پر عربی عبا۔ سر پر انور کیپ جس پر ہلال کا قومی نشان، ان کو تصویر میں تو ہزاروں بار دیکھا تھا مجسم، زندہ اور متحرک شکل میں بھی کئی بار دیکھا۔

ان کی والدہ مرحومہ جو بی اماں کے نام سے سارے ہندوستان میں مشہور تھیں اپنے دورہ میں رائے بریلی بھی آئیں، سنہ ۲۳ء کا کوئی مہینہ تھا فروری کے بعد کا، اس لیے کہ ۲ فروری سنہ ۱۹۲۳ء میں میرے والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب کا انتقال ہوا تھا، اور بی اماں مرحومہ پرسہ کو والدہ صاحبہ سے ملنے جو عدت میں تھیں ہمارے

گھر تشریف لائیں۔ وہ ایک چوکی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور خاندان کے بزرگ اس کو اٹھائے ہوئے تھے، یہ منظر ابھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

۳۰ جولائی ۱۹۵۱ء کو جب بیت المقدس میں پہلی بار حاضری ہوئی تو بڑی محبت و عقیدت کے ساتھ ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا جو مسجد اقصیٰ کے احاطہ ہی میں نیچے کے حجروں میں سے ایک حجرہ میں تھی۔ وہاں ان کی قبر پر تہیہ کا ایک شعر ہمارے ایک ہندوستانی بزرگ دوست فاروقی صاحب مقیم قاہرہ کا لکھا ہوا آویزاں دیکھا جو لسان الغیب سے نکلا ہوا واقعہ کی سچی تصویر تھا ؎

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلائی بہار   مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

دنیا کی حافظہ کی کوتاہی، حقائق سے چشم پوشی اور زود فراموشی کی ایسی مثالیں کم ملیں گی جیسی ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ لکھنے والوں اور ہندوستانی عوام نے تحریک آزادی کے جانباز سپاہی اور اس کے ایک قافلہ سالار محمد علی کے معاملہ میں پیش کی۔ بعض مصنفین نے جن کی خورد بین اور دوربیں نگاہوں سے چھوٹے چھوٹے واقعات اور غیر اہم اشخاص کو بھی فراموش نہیں کیا، یا تو مولانا محمد علی کو یکسر نظر انداز کر دیا، یا ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑنے والوں کی بزم میں ان کو بادل ناخواستہ اور کہیں کنارے پر جگہ دی۔ ان کے ساتھ اور ان کے ماتحت کام کرنے والوں اور ان کا ان کی زندگی میں ادب و احترام کرنے والوں نے بھی ان کے ساتھ فراخ دلی کا معاملہ نہیں کیا، خود ان کی ملت کا طرز عمل بھی ان کے ساتھ کچھ زیادہ حق شناسی اور منت پذیری کا نہیں رہا، اور یہ ملت بھی اپنی "زندہ فراموشی" و "مردہ پرستی" میں بدنامی کی حد تک نامور ہونے کے باوجود ان کے نام کو زندہ اور تابندہ نہ رکھ سکی۔ غنیمت ہے کہ ان کی پیدائش پر سو برس گذرنے کے موقع پر اس کو اپنی کوتاہی کا احساس ہوا اور اس پورے تحتی براعظم میں جا بجا ان کی صدی منانے اور ان کے کارناموں کو دہرانے اور ان کی یادگاریں قائم کرنے کی تحریک پیدا ہو گئی ہے، خدا کرے اس سے اس کوتاہی کی تلافی ہو سکے جو ان کے معاملہ میں اس وقت تک پیش آتی رہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد علی کو بہت کم لوگوں نے پہچانا اور اس میں بھی شبہ ہے کہ انھوں نے خود بھی پہچانا یا نہیں، اور یہ کوئی عیب نہیں، ایک ایسی مختلف الحیثیات اور جامع صفات ہستی کی تعریف ہے جس کا ہر پہلو مرکزی اور بنیادی معلوم ہوتا ہے۔ اور تماشائی تصویر حیرت بن کر کہتا ہے ؎

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست!

یہ واقعہ بہت سے مالکیوں کے ساتھ پیش آیا ہے کہ ان کے کمالات کی کثرت و تنوع ان کے حقیقی کمالات کے لیے حجاب بن گیا، اور بعض اوقات وہ کسی آخر تک فیصلہ نہ کر سکے کہ ان کا جوہر اصلی کیا ہے، اور ان کو اسی توانائیوں اور صلاحیتوں کو کس نقطہ پر مرکوز کر دینا چاہیے، ان کی انگریزی زبان پر اہل زبان کی سی قدرت اور کسی انگریز ادیب کے بقول " برکلے کی زبان اور میکالے کا قلم " صحافت میں جو اپنی بے اصولی کے لیے بدنام ہے، اصول پسندی، راست گفتاری، اہم مجلسوں اور نازک موقعوں پر حاضر دماغی و حاضر جوابی، جابر طاقتوں اور عالی مقتدر لوگوں کے سامنے کلمۂ حق کا اظہار، قوت ایمانی و عشق رسول اسلام کے ساتھ وفاداری اور ملت کا درد، اور سب سے بڑھ کر دینی حمیت اور اسلامی غیرت، کس چیز کو سراہا جائے، اور کس کو ان کا امتیازی وصف قرار دیا جائے، بحیثیت شاعر کے بھی ان کا مقام بلند ہے اور اس قابل کہ اسے کو مستقل موضوع بنایا جائے، زبان کی سادگی، کلام کی تاثیر، جذبات کی گہرائی۔ ان کا کلام بھی (اگر یہ ادبی نہ ہو تو خواجہ میر درد کی طرح) سراپا انتخاب اور "پیغام سروش" ہے۔

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم کے ان اشعار میں جو لکھے ان کے مرثیہ کے طور پر کہے ہیں بڑی حد تک اس حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے، اور انہیں پر اس مختصر سے مقالہ کو ختم کیا جاتا ہے ؎

بدین مصطفیٰ دلدادہ بودی — فدائے ملت جانانہ بودی
بہ بزم ما رئیس عشق بازاں — بہ رزم دشمناں فرزانہ بودی
دل بودی معززے بے نوائے — بہ حال بیکساں سامانہ بودی
سیاست را نقاب چہرہ کردی — دگر نہ عاشق مستانہ بودی
سیاست ہمی بر حسن پاکے — ز آتش حسود بیگانہ بودی
چہ دانستی کجا سوزم بسوزم — تو شمع دیں را پروانہ بودی
مایاں ہا ز تو زورے و شورے — کجا با ہمت مردانہ بودی
رمیدی از رہ اغیار تا یار — عجب مستے عجب دیوانہ بودی!

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

مولانا محمد علی ـــــــ کچھ یادیں

میں دس گیارہ سال کا تھا ایک دن دیکھا کہ گاؤں[1] کی مسجد میں بہت سے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی طویل نظر بندی کے بعد رہا ہوئے ہیں اس خوشی میں یہ جلسہ ہو رہا ہے یہ پہلا موقع تھا کہ میرے کان میں علی برادران کا نام پڑا اس کے کچھ عرصہ کے بعد ایک تقریب کے سلسلے میں لکھنؤ جانا ہوا کچھ ساتھیوں کے ساتھ امین آباد کی سیر کو گیا چوراہے پر اخبار فروش طرح طرح کی خبریں بلند آواز سے سنا رہے تھے کچھ لوگ چھوٹی چھوٹی کتابیں پکار پکار کر فروخت کر رہے تھے کوئی کہہ رہا تھا "یونس کی کرکری" کسی طرف سے آواز آرہی تھی "لوٹ گئے مائی لارڈ گنگڑ دوں کوں" کوئی صدا لگا رہا تھا "بہار جیل خانہ" میں نے بھی دو تین کتابیں خریدیں انھیں میں ایک کتاب "صدائے خاتون" تھی اس میں مولانا محمد علی کی والدہ "بی اماں" کی زبان سے اپنے بیٹے کو خلافت پر قربان ہو جانے کی ہدایت کی گئی تھی کتاب منظوم تھی ایک شعر یاد رہ گیا جو اس وقت بچے بچے کی زبان پر تھا ؎

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ تحریک خلافت اور ترک موالات کے شباب کا زمانہ تھا ہندو مسلم اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ایسی فضا شاید ہی ملک میں کبھی ہوئی ہو۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد مولانا محمد علی مولانا شوکت علی اور ان کے ساتھ ڈاکٹر کچلو مولانا حسین احمد مدنی، مولانا نثار احمد کانپوری اور پیر غلام مجدد سندھی بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیے گئے پھر گرفتاریوں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا بڑے بڑے لیڈروں کے علاوہ لاکھوں عوام بھی جیلوں میں پہنچا دیے گئے سارے ملک میں عجب جوش و خروش کا عالم تھا بچہ بچہ قربانی کے لیے تیار تھا۔ مولانا محمد علی اور ان کے ساتھیوں

---

[1] تھولینڈی ضلع رائے بریلی

کو دو دو سال کی سزا دی گئی۔ اس زمانہ میں ایک چھوٹی سی منظوم کتاب "ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو" بہت رائج تھی۔

اس طرح میں مولانا محمد علی کے نام اور کارناموں سے کچھ واقف ہو گیا ہمارے اسکول کے ماسٹر بھی آزادی کی تحریک سے متاثر تھے ان میں مولوی ولی محمد اور ماسٹر گوری سنکر خاص طور پر قابل ذکر ہیں ماسٹر گوری ستنہ تاریخ کے سبق میں انگریزوں کے خلاف دل کا غبار نکالتے تھے اور مولوی ولی محمد اور ڈرنگ میں آزادی کا جذبہ لڑکوں کے دلوں میں پیدا کرتے تھے مڈل اسکول سے فارغ ہو کر میں ندوۃ میں داخل ہوا لکھنؤ آنے کے بعد بڑے بڑے جلسے دیکھنے کو ملے اور مولانا محمد علی کی کئی تقریریں سننے کا موقع ملا۔ اس زمانہ میں ندوہ کے طلبا اور اساتذہ تحریک خلافت سے خاص طور پر متاثر تھے مولانا عبدالودود جیراجپوری مقامی خلافت کمیٹی کے سکریٹری تھے مولانا عبدالرحمٰن نگرامی اور مولانا محمد سلیم بڑی سرگرمی سے کام کرتے تھے طلبہ میں احمد حبیب شاہ اور مولوی حفیظ الدین ناظم الاصلاح خاص طور سے قابل ذکر ہیں

خلافت اور کانگریس کے جلسے شہر میں آئے دن ہوتے رہتے تھے ممتاز لیڈر دارالعلوم ندوہ میں آیا کرتے تھے مولانا محمد علی علامہ شبلی کے شاگرد تھے مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی سے بھی بڑا تعلق تھا اس لیے وہ خاص طور سے ندوہ آتے تھے اور طلبہ کو خطاب کرتے تھے۔ ایک مرتبہ طلبہ کی انجمن الاصلاح کی طرف سے رہنمایانِ قوم کو پر تکلف عصرانہ دیا گیا اس موقع پر مولانا محمد علی نے فرمایا کہ یہ شاندار دعوت ندوہ کے شایان شان نہیں ہے یہاں تو نان شعیر (جو کی روٹی) بھنے ہوئے چنے اور مونگ پھلی کے دانے کافی ہیں کتاب المعائنہ پر بھی یہی لکھ دیا دوسری مرتبہ جب تشریف لائے تو طلبہ نے اس ہدایت پر پورا عمل کیا اتفاق سے مولانا کو اس وقت کانپور جانا پڑا اور دوسرے لیڈروں کو یہ روکھی پھیکی غذا حلق سے اتارنی پڑی آخر میں انجمن کے ناظم مولوی محمد شکیل عباسی نے معذرت کی اور کہا کہ ہم لوگوں کا یہ معمول نہ تھا کہ مہمانوں کے کام و دہن کو آزمائش میں مبتلا کریں مگر مولانا محمد علی کے حکم کی تعمیل میں یہ کرنا پڑا۔

۲۳ء میں مولانا کانگریس کی صدر منتخب ہوئے ان کا کوکناڈا کا خطبۂ صدارت طوالت کے باوجود دلچسپ اور پر اثر تھا اور گھر گھر اس کا چرچا تھا یہ سال ان کی بڑی مصروفیت کا تھا ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے بجائے نا چاقی شروع ہو گئی تھی انگریزی حکومت کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پھر بروئے عمل تھی اور ہندو مسلمان جو پہلے شیر و شکر تھے اب دست و گریباں تھے اور ملک میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے مولانا محمد علی اور ان کے خلافتی اور کانگریسی دوستوں نے اس صورت حال کو بدلنے کی کوشش کی مگر یہ آگ بجھائے نہ بجھی اور ہندوستان

کے بڑے بڑے شہر فسادات کی زد میں آگئے* ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ بھی اس میں مبتلا ہو گیا اور چار دن تک قتل و غارت کا ہنگامہ بپا رہا ان حالات سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے ۲۱ دن کے برت کا اعلان کر دیا ان کے ضعف کی بنا پر مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور دوسرے لیڈروں نے ان کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ راضی نہیں ہوئے اور ۲۱ دن پورے کرنے کے بعد برت ختم کیا اس برت کے بعد کچھ عرصہ کے لیے فساد رک گئے مگر لڑانے والوں نے
۱۲۵ ایک دوسرے کے خلاف جو جذبات پیدا کر دئے تھے ان کی بنا پر رہ رہ کر ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔

ہندو مسلم اختلافات کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ خود مسلمانوں کے درمیان جھگڑے شروع ہو گئے، پہلی جنگ عظیم میں ترک انگریزوں کے خلاف جرمنوں کے ساتھ تھے تمام مصر، فلسطین، عراق اور حجاز یہ سب علاقے ترکی حکومت کے ماتحت تھے ترک فرماں روا خلیفہ کہلاتا تھا اس بنا پر تمام دنیا کے مسلمانوں پر اس کا اثر تھا۔ لیکن انگریزوں کے اشارہ پر عرب صوبوں نے بغاوت کر دی اس کی وجہ سے ترکوں کو شکست ہوئی اس بغاوت کی قیادت حجاز کے گورنر شریف حسین اور ان کے لڑکوں نے کی اس حرکت کی بنا پر مسلمانانِ ہند ان سے بہت ناراض تھے لیکن احتجاج کے سوا ان کے بس میں کیا تھا اتفاق ایسا کہ ترکوں کی شکست کے سات برس بعد نجد کے فرماں روا سلطان ابن سعود نے شریف حسین کو شکست دے کر حجاز خالی کرا لیا اس سے مسلمانوں کو بڑی مسرت ہوئی مگر انگریزوں کے اشارہ پر ابن سعود کے خلاف وہابیت کا پروپیگنڈہ کیا گیا تھا، رائٹر نے یہ خبر بھیج دی کہ مدینہ منورہ کے محاصرہ کے دوران سعودی فوجوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر پر گولہ باری کی اس سے سارے ملک میں آگ لگ گئی خلافت کمیٹی نے اعلان کیا کہ خبر غلط ہے مگر فتنہ بڑھتا ہی رہا مولانا محمد علی اور ان کے ساتھیوں کے خلاف ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا مگر مولانا نے بڑی ہمت سے اس کا مقابلہ کیا یہ وقت بڑا نازک تھا لوگ ان کی جان کے درپے تھے میں نے لکھنؤ میں یہ حالات خود دیکھے ہیں رفاہِ عام اور ممتاز دار الیتامیٰ کے جلسہ میں مولانا محمد علی کو تقریر نہیں کرنے دی گئی بعض تعلقہ داروں اور بدعت نوازوں نے ہزاروں لٹھ بند مولانا کے خلاف جمع کر دیے تھے مگر جب مولانا ان لوگوں کے سامنے آئے اور سر جھکا کر کہا مارنا چاہتے ہو تو مارو تو کسی نے ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں کی اور محمد علی زندہ باد کے نعرے بلند ہو گئے۔ یہ حالات صرف لکھنؤ ہی میں نہ تھے بلکہ سارے ملک میں یہی ہنگامے برپا تھے مگر مولانا نے ان غوغائیوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ پامردی کے ساتھ ان کو صحیح حالات سے باخبر کرتے رہے۔

ان حالات میں جب کہ شدھی سنگھٹن، تبلیغ و تنظیم اور شریفی و سعودی ہنگامے برپا تھے خلافت اور

کانگریس کے بھی بعض لوگ مخالف ہو گئے۔

اسی فضا میں کان پور میں خلافت اور کانگریس کے اجلاس ہوئے خلافت کانفرنس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد اور کانگریس کی مسز سروجنی نائیڈو تھیں میں ان جلسوں میں موجود تھا مولانا کے لیے یہ وقت خاصا نازک تھا مگر انھوں نے حق کی خاطر دوستوں اور دشمنوں سبھی کا مقابلہ کیا کانگریس اور خلافت کانفرنس دونوں میں ان کی متعدد تقریریں ہوئیں مولانا بڑے خطیب نہ تھے مگر ان کا خلوص اپنا لوہا منوا لیتا تھا معلومات کی فراوانی اور خیالات کی روانی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کئی کئی گھنٹے بولتے تھے مگر مجمع برابر گوش برآواز رہتا تھا۔

سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے شریف حسین کو شکست دینے کے بعد اعلان کیا تھا کہ میں حجاز میں حکومت کے لیے نہیں بلکہ تطہیر کے لیے آیا ہوں عالم اسلام کے لوگ جس طرح چاہیں یہاں کا انتظام کریں لیکن بعد کو اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ مولانا محمد علی خاندانی بادشاہت کے سخت مخالف تھے وہ ملوکیت کو قیصر و کسریٰ کی سنت سمجھتے تھے اور منہاج خلافت راشدہ پر حکومت قائم کرنا چاہتے تھے ان کے ذہن میں خلافت راشدہ کا واضح نقشہ تھا۔ سلطان کے اس اعلان سے ان کو بہت ناگواری ہوئی اور جس شد و مد سے وہ ان کی موافقت کر رہے تھے اسی شدت سے مخالفت کرنے لگے مکہ معظمہ میں جو موتمر اسلامی منعقد ہوئی اس میں انھوں نے خاندانی بادشاہت کی سخت مخالفت کی مگر نہ سلطان نے اپنا ارادہ بدلا نہ دوسری مسلم حکومتوں نے مولانا کی تائید میں کوئی قدم اٹھایا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کا منصوبہ بروئے کار نہ آسکا انھوں نے دنیائے اسلام کے نمائندوں کو بار بار توجہ دلائی مگر کوئی اس مہم میں شریک نہ ہوا۔

حجاز میں جمہوری حکومت اور خلافت اسلامی قائم نہ ہو سکی مگر ہندوستان میں نئے اختلافات پیدا ہوگئے خود خلافت کمیٹی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی کل ہند مرکزی خلافت کے جلسے بڑے ہنگامہ خیز ہوتے تھے ان جلسوں کے دیکھنے کا مجھے موقع ملا ہے سالہا سال کے ساتھی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے تقریباً دو سال یہ ہنگامے برپا رہے اور مسلمانوں کی قوت آپس میں ٹکرا کر چور چور ہوتی رہی مولانا ان حالات سے بہت دلگیر تھے مگر ان کی کوششوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا بلکہ خود ان کے اوپر چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھار ہوتی رہتی تھی، ان پریشانیوں میں صحت بھی بگڑتی جا رہی تھی ذیابیطس کے دیرینہ مریض تھے اور بھی طرح طرح کی بیماریاں سر اٹھا رہی تھیں۔

مسلمانوں کے ان باہمی اختلافات کے ساتھ ہندو مسلم تنازعات کا بھی سلسلہ جاری تھا جن کی وجہ سے

آزادی کی جدوجہد میں دشواری ہو رہی تھی اب یہ مسئلہ بھی زیر بحث آنے لگا تھا کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا پوزیشن ہوگی، حکومت برطانیہ چاہتی تھی کہ یہ مسئلہ اتنا ابھر جائے کہ آزادی کی جدوجہد کمزور ہو جائے اور ملک میں اختلافات کی خلیج اتنی وسیع ہو جائے کہ اس کا پر کرنا ناممکن ہو جائے مولانا محمد علی آزادی کامل کے طلبگار تھے وہ ملک کو اس جال سے نکالنا چاہتے تھے جو انگریزوں نے چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ آزادی سے محروم اور کاروبارِ سلطنت سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے لیڈر ایسے اوہام میں مبتلا تھے جن کی کوئی حقیقت نہ تھی ہندو رہنماؤں کو یہ خطرہ تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد مسلمانوں کو پاس کے مسلم ممالک سے مدد مل جائے گی اور ہندوستان میں مسلم راج قائم ہو جائے گا۔ پنڈت مدن موہن مالوی جیسے جہاں دیدہ لیڈر افغانستان کے ہونے سے خائف تھے پرانی تاریخ پڑھ کر ان کے ذہن میں محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کے حملوں کا خیال آ جاتا تھا اور نہیں سمجھتے تھے کہ افغانستان کی کیسی کمزور حالت ہے اس کو اپنا وجود قائم رکھنا دشوار ہے ہندوستان پر حملہ کا خیال بھی اس کے دل میں نہیں آ سکتا اس سائنسی دور میں تلوار کیا کر سکتی ہے لیکن ناواقفیت کی وجہ سے لوگوں کا خوف دور نہیں ہوتا تھا آزادی کے بعد جب حالات سے براہ راست واقفیت ہوئی تو لوگوں کی غلط فہمی پر ہنسی آتی ہے لیکن اس وقت حالات کی صحیح تصویر سامنے نہیں تھی اور لوگ اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا تھے اس بنا پر آزادی کامل کے بجائے نوآبادیاتی طرز کی ایسی حکومت چاہتے تھے جس میں ہندوستان کی حفاظت انگریزوں کے ذمہ رہے مولانا محمد علی نے بارہا اعلان کیا کہ اگر آزادی کے بعد افغانستان کی طرف سے حملہ ہوا تو مسلمان ملک کا ساتھ دیں گے اور میں پہلا مسلمان ہوں گا جو افغانیوں کے مقابلہ میں نکلوں گا کانگریس کے دوسرے صاحب نظر لیڈروں نے بھی سمجھایا اور کہا کہ جب ہندوستانی انگریزوں جیسی طاقتور قوم کو شکست دے کر آزادی کامل حاصل کر لیں تو پھر افغانستان سے نپٹنا کیا دشوار ہوگا مگر اکثریت کے دل میں یہ بات اترتی نہیں تھی اور وہ انگریزوں سے بالکل آزاد ہونا نہیں چاہتے تھے۔

ایک طرف ہندوؤں کے خوف کا یہ حال تھا اور دوسری طرف مسلمانوں پر ہندوؤں کا ہوا سوار تھا وہ سوچتے تھے کہ انگریزوں کے جانے کے بعد اکثریت ہمیں فنا کر دے گی مولانا محمد علی ان سے کہتے تھے کہ تم کس غلط خیال میں مبتلا ہو اتنی بڑی قوم کو ہندو کس طرح ختم کر دیں گے لیکن برطانوی حکومت کے ہوا خواہ برابر اس کا پروپیگنڈہ کرتے تھے اور ادھر ادھر جو فسادات ہوتے تھے ان کا ذکر کر کے مسلمانوں کو خوف زدہ کرتے تھے اس غلط اندیشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بھی انگریزوں سے بالکل بے تعلقی کو پسند نہیں کرتے تھے اور برطانوی

حکومت کے زیر سایہ اپنی حفاظت کے خواہشگار تھے مولانا محمد علی اور ان کے بہادر رفقاء جو آزادی کامل کے طلبگار تھے لوگوں کے اس وہم کو دور کرنا چاہتے تھے مگر حالات کچھ اس طرح کے تھے کہ کوئی ان کا مشورہ قبول نہیں کرتا تھا۔

آخر کار مولانا نے یہ رائے قائم کی کہ محض نصیحت اور ہمت افزائی سے کام نہیں چلے گا بلکہ آزاد ہندوستان میں دونوں قوموں کی کیا پوزیشن ہوگی اس کا واضح خاکہ بنانا پڑے گا اور باہمی معاہدے سے ہندوستان کا ایسا دستور بنانا پڑے گا جس سے سب مطمئن ہو جائیں اور کسی کو مستقبل میں کوئی خطرہ محسوس نہ ہو۔ غور و فکر کے بعد ان کے سامنے یہ حقیقت آئی کہ صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور باقی صوبوں میں ہندو اکثریت میں ہیں اس کو سامنے رکھ کر انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ ہندوستان کا نظام حکومت وفاقی بنایا جائے صوبوں کو اندرونی معاملات میں پورے اختیارات دیے جائیں صوبہ سرحد اور بلوچستان کو دوسرے ہندوستانی صوبوں کی طرح حقوق دیے جائیں، سندھ کو احاطہ بمبئی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنایا جائے اور پنجاب و بنگال میں آبادی کے تناسب سے مجالس قانون ساز کے لیے نشستیں محفوظ کی جائیں مرکز کو باہمی مفاہمت سے کل اسی قسم کے امور مثلاً تعلقات خارجہ، دفاع، کرنسی، ریلوے، ڈاک و تار اور بین الاقوامی تجارت وغیرہ معاملات سپرد کیے جائیں اور باقی اندرونی معاملات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں مرکزی مجلس قانون ساز یعنی پارلیمنٹ میں مسلمانوں کو تہائی نشستیں دی جائیں اور ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے انتخابات مخلوط ہوں۔

ان تجاویز پر بحث غور کر چکے تو یہ اسکیم اخبارات میں شائع کی پھر مختلف لیڈروں کے ساتھ تبادلہ خیالات کیا جب فضا سازگار معلوم ہوئی تو مختلف مکاتب فکر کے مسلمان رہنماؤں کو ۱۹۲۶ء میں شملہ میں جمع کیا اور سمجھا بجھا کر ان سے یہ تجاویز منظور کرالیں۔ کانگریس کے لیڈروں سے بھی انفرادی طور پر بات کر چکے تھے اب انھوں نے بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ میں اس اسکیم کو پیش کیا اس وقت سری نواس آئنگر پریسیڈنٹ تھے وہ کھلے ہوئے دل کے آدمی تھے گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو وغیرہ تمام لیڈروں نے اسے پسند کیا اور سب کی تائید سے یہ اسکیم منظور ہو گئی کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں مدراس میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا اس میں بھی یہ اسکیم منظور ہو گئی پنڈت مدن موہن مالوی نے بھی اس کی تائید کی مولانا اس کامیابی سے بہت خوش ہوئے اور امید بندھی کہ آزادی کی منزل قریب آگئی ہے۔

اسی زمانہ میں وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ، جنھیں مولانا بروکن ہیڈ کہا کرتے تھے، نے طنز و تعریض سے پر تقریر کی تھی اور کہا تھا کہ اگر ہندوستانی آزادی چاہتے ہیں تو ملک کا دستور کیوں نہیں بنا کر پیش کرتے ہیں دراصل

ان کے درمیان ایسے اختلافات ہیں کہ وہ کسی دستور پر متفق نہیں ہو سکتے ہندوستانی رہنماؤں نے اس اندازِ تقریر کو بہت ناپسند کیا اور کانگریس نے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک دستور ساز کمیٹی بنادی جس میں مختلف فرقوں کے نمائندے شامل تھے اس کمیٹی نے غور و فکر اور طویل صلاح و مشورہ کے بعد ایک دستور مرتب کیا جو نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہے اس پر غور کرنے کے لیے لکھنؤ میں ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی ڈاکٹر انصاری اس اجلاس کے صدر تھے قیصر باغ کی بارہ دری میں یہ کانفرنس ہوئی تھی راقم الحروف اس زمانہ میں ندوۃ العلماء میں زیر تعلیم تھا چند دوستوں کے ساتھ تماشائی کے طور پر کانفرنس کی کارروائی دیکھنے کا موقع مل گیا تھا اس کانفرنس سے پہلے مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ ممتاز دارالیتامی کے قریب ایک عمارت میں ہوا مولانا محمد علی اس زمانہ میں علاج کی غرض سے یورپ گئے تھے خلافت کا جلسہ مولانا شوکت علی کی رہنمائی میں ہو رہا تھا نہرو رپورٹ سے مولانا شوکت علی کو بنیادی اختلاف تو یہ تھا کہ آزادیٔ کامل کے بجائے اس میں نوآبادیاتی طرز حکومت پر اکتفا کر لیا گیا ہے لیکن یہ اختلاف صرف نظری تھا عملی طور پر پنجاب اور بنگال کا مسئلہ پیچیدہ تھا مسلمان چاہتے تھے کہ آبادی کے تناسب سے ان کی نشستیں مجلس قانون ساز میں محفوظ کی جائیں پنجاب میں سکھ اپنی خاص اہمیت کی بنا پر کچھ مراعات کے طالب تھے ہندو اپنی نشستوں کی کمی کی وجہ سے گھبرا رہے تھے اسی طرح بنگال میں یورپین اپنی مخصوص اہمیت کی بنا پر تناسب سے زائد نشستوں کے طالب تھے اور ہندو اپنی برتر پوزیشن سے نیچے اترنے کو تیار نہ تھے مسلمانوں کی اکثریت زیادہ نہ تھی پنجاب میں اس وقت ۵۶ فی صد اور بنگال میں ۵۴ فی صد تھے اس لیے وہ اپنی نشستوں میں اتنی کمی پر تیار نہ تھے کہ ان کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائے جب باہمی گفت و شنید سے یہ مسئلہ طے نہ ہو سکا تو نہرو رپورٹ میں اس کا حل یہ نکالا گیا کہ پنجاب اور بنگال دونوں صوبوں میں نشستوں کا تحفظ ختم کر دیا جائے اور ہر فرقہ کو اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی جدوجہد سے جتنی نشستیں حاصل کر سکے حاصل کرے مگر مسلمان اس پر راضی نہ تھے وہ کہتے تھے کہ پنجاب اور بنگال دونوں صوبوں میں ان کی حالت ایسی نہیں ہے کہ مالی اور تعلیمی اعتبار سے مضبوط فرقوں کے مقابلے میں وہ اپنی اکثریت قائم رکھ سکیں نہرو رپورٹ کے مرتبین اور ان کے ہم نواؤں نے اس خطرہ کا علاج یہ تجویز کیا کہ اس صورت کو صرف دس سال کے لیے منظور کر لیا جائے دس سال کے تجربہ کے بعد پھر نظر ثانی ہو سکتی ہے مگر مسلمان اس سے مطمئن نہیں ہوئے خلافت کمیٹی کے جلسہ میں مولانا شوکت علی نے پنجاب اور بنگال کے ممبروں سے کہا کہ آپ لوگ اس پر غور کر لیں جو فیصلہ آپ کا ہوگا ہم لوگ اس کی تائید کریں گے لیکن بنگالی اور پنجابی مسلمان دونوں نشستوں کے عدم تحفظ پر راضی نہیں ہوئے پھر گنگا پرشاد ہال میں عام جلسہ

ہوا اس میں بھی پنجاب اور بنگال کے مسلمان باشندوں نے ایسی ناپسندیدگی کا برملا اعلان کیا۔ راقم الحروف مرکزی خلافت کمیٹی اور کانگریس کا رکن تھا، وہاں کے جلسۂ عام دونوں جگہ سارے مباحثہ میں موجود تھا۔ پنجاب کے بعض لیڈروں نے تو یہاں تک کہا کہ اگر یہ تجویز منظور کر لی گئی تو خون کے دریا بہہ جائیں گے۔

کچھ سربرآوردہ مسلمان ایسے بھی تھے جو ان اندیشوں کو بے بنیاد سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ مسلمان بہرحال اپنی اکثریت برقرار رکھیں گے اس لیے دس سال کے عدم تحفظ کے ساتھ اس حق کو تسلیم کر لینا چاہیے اس مدت کے ختم ہونے کے بعد حکومت برطانیہ کے سامنے ہندوستان کی طرف سے متفقہ مطالبہ پیش کیا جا سکے گا اس سے حصول آزادی کے قوی امکانات پیدا ہو جائیں گے ان مسلمان رہنماؤں نے پنجاب اور بنگال کے مسلمان لیڈروں سے رات میں مزید گفتگو کی اور کسی طرح سمجھا بجھا کر ان کو راضی کر لیا۔ صبح دس بجے کے قریب جب آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا تو مولانا شوکت علی نے مجلس خلافت کی طرف سے نہرو رپورٹ کے مرتبین کو ان کی کوشش پر مبارکباد دی اور کہا آپ لوگوں نے لارڈ برکن ہیڈ کے چیلنج کا خوب جواب دیا البتہ آزادی کامل کے بجائے درجہ نوآبادیات پر رضامند ہو کر ذرا کمزوری دکھائی۔ اس کے بعد پنجاب اور بنگال کے مسئلہ کا ذکر کیا اور کہا کہ بہ نسبت آبادی کے مطابق نشستوں کا تعین ہونا چاہیے تھا اس کے ساتھ انھوں نے مجلس خلافت کی تجویز سنائی۔ اس پر پورے پنجاب کے بعض مسلمان رہنماؤں نے مولانا سے سوال کیا کہ آپ کی ذاتی رائے ہے یا مجلس خلافت کی، مولانا نے کہا کہ مجلس خلافت نے یہ طے کیا ہے اس پر ایک صاحب نے جو کل تک نہرو رپورٹ کی عدم تحفظ نشست والی دفعہ کے سخت مخالف تھے کھڑے ہو کر کہا لیکن ہم لوگوں کی یہ رائے نہیں ہے ہم نشستوں کے عدم تحفظ پر راضی ہیں ظاہر ہے کہ اس طرز عمل پر مولانا شوکت علی کو بہت ناگواری ہوئی اور مخالفت کی بنیاد پڑ گئی۔ آل پارٹیز کانفرنس کی کارروائی جس طرح ہوتی رہی اس سے مولانا شوکت علی اور ان کے ہم خیال اصحاب کی ناگواری میں اضافہ ہوتا رہا اور سارے ملک میں مخالفت کا بازار گرم ہو گیا پنجاب اور بنگال کے وہ لیڈر جنہوں نے مولانا کے علی الرغم نشستوں کے عدم تحفظ کی تجویز منظور کی تھی ان کا مسلمانوں پر وہ اثر نہ تھا جو مولانا شوکت علی اور ان کے دوستوں کا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اندر نہرو رپورٹ سے سخت بیزاری پیدا ہوئی اور کسی تدبیر سے وہ اس سے متفق نہ ہو سکے۔

مولانا محمد علی اس زمانہ میں علاج کی غرض سے یورپ میں تھے ان کو وہاں ان واقعات کی اطلاع ہوئی مگر وہ حالات سے مایوس نہیں ہوئے اور جب یورپ سے واپس ہوئے تو بمبئی میں اخبار نویسوں کے سوال کے

جواب میں کہا کہ شام راج سے رام راج بہتر ہے اس سے ان کی وطن دوستی اور حریت پسندی ظاہر ہوتی ہے ۱۹۲۶ء
میں ڈاکٹر انصاری کا دورِ صدارت ختم ہو گیا اور پنڈت موتی لال نہرو نئے سال کے لیے صدر منتخب ہوئے۔ کلکتہ
میں کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا تو مولانا محمد علی اس میں شریک ہوئے اور نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں اپنے خیالات
پیش کیے مگر لوگوں نے حالات کا صحیح اندازہ نہیں کیا نہ اس اثر کو سمجھ پائے جو علی برادران مسلمانوں کی رائے عامہ
پر رکھتے تھے اور تھوڑے سے ان مسلمان لیڈروں کے بھروسہ پر جو مسلم عوام پر زیادہ اثر نہ رکھتے تھے مولانا محمد علی
کی باتوں پر دھیان نہ دیا بلکہ چشم دید شاہدوں کا بیان ہے کہ بعض لوگوں نے محمد علی کی تقریر پر ہوٹنگ کی۔ اس
طرزِ عمل نے ناگواری میں اضافہ کر دیا اور مصالحت کے دروازے بند ہو گئے۔ وہ محمد علی جنھوں نے ساحلِ بمبئی پر
قدم رکھتے ہی نہرو رپورٹ کے سلسلے میں شکوک و شبہات کے جواب میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ شام راج سے
رام راج بہتر ہے اب ایسے آزردہ، دلگیر اور مایوس ہوئے کہ نہرو رپورٹ کے خلاف سارے ملک میں ایسی آگ
لگا دی کہ اسے ختم کرنے کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ لاہور کانگریس نے پنڈت جواہر لال نہرو کی
صدارت میں آزادیٔ کامل کا اعلان کر کے نہرو رپورٹ کو ختم کر دیا۔

یہ سب کچھ ہو گیا لیکن ہندوستان کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال مولانا محمد علی کے دل سے نہیں نکلا اور
ان تجاویز کو جنھیں شملہ کانفرنس میں مسلمان لیڈروں نے منظور کیا تھا پھر جنھیں بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی
نے پاس کیا تھا اور جن کی مدراس کانگریس کے کھلے اجلاس نے تصدیق کی تھی نہرو رپورٹ نے اس اصول پر انھیں
اختیار کیا تھا۔ مولانا محمد علی ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کا یہی حل سمجھتے تھے انھوں نے بار بار اس خیال
کا اظہار کیا اور جب لندن میں ہندوستان کے دستوری مسائل طے کرنے کے لیے گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تو
اس کے سامنے بھی انھوں نے یہ تجاویز رکھیں وہ بڑے اخلاص کے ساتھ یہ یقین رکھتے تھے کہ یہ تجاویز منظور ہو جائیں
تو ہندوستان کی ساری الجھنیں سلجھ جائیں گی اس خیال پر انھیں ایسا وثوق تھا کہ شدید بیماری کے باوجود وہ
گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے مرض الموت میں ان تجاویز کی منظوری کی کوشش کی اور ایک ایسی مدلل اور پر اثر
تحریر لکھی جس نے ہر طبقہ کو متاثر کیا لیکن افسوس ہے کہ کچھ حکمرانوں کی ساحری اور کچھ محکوموں کی کج دلی اور کوتاہ
نظری نے مولانا کی اس مخلصانہ کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا ورنہ ملک نہ تقسیم ہوتا نہ عداوت و دشمنی کی وہ
فضا پیدا ہوتی جس نے سارے ملک میں خون کے دریا بہا دیے۔

محمد علیؒ کی یاد میں

سید محفوظ علی بدایونی جنھیں لوگ محبت اور احترام سے "میر صاحب" کہتے تھے، مولانا محمد علی مرحوم کے دوستوں میں تھے اور ایسے دوست کہ جتنا وہ مولانا کو جانتے اور سمجھتے تھے، شاید کوئی اور نہ جانتا اور سمجھتا ہو۔ میر صاحب ۳ مئی ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے، مولانا محمد علی کا سنِ پیدائش ۱۸۷۸ء ہے، گویا میر صاحب مولانا صاحب سے کوئی آٹھ برس بڑے تھے۔ میر صاحب نے لکھا ہے کہ "محمد علی کا اور میرا ساتھ سب سے پہلے ۱۸۸۸ء میں ہوا جب ان کی عمر دس برس کی تھی اور وہ ذوالفقار بھائی، نوازش مرحوم اور شوکت لیے ان حقیقی بھائیوں اور امتیاز اور امجد اپنے عزیزوں کے ساتھ بریلی اسکول میں پڑھنے آئے اور بورڈنگ ہاؤس میں میرے کمرے سے دو کمرے چھوڑ کر مقیم ہوئے۔" مولانا مرحوم نے کل باون ۵۲ برس کی عمر پائی، میر صاحب کے قول کے مطابق اس باون برس میں سے ۱۲ برس نکال کر ۴۰ برس کی "مولانا کی کتاب زندگی" پوری میرے پیش نظر ہے، بلکہ اس کے اکثر باب میرے سامنے لکھے گئے ہیں۔" ایک ایسے "محرم راز" کے قلم سے جس کی خدا ترسی، شرافت نفسی، شائستگی، وضعداری، متانت اور معاملات کی صفائی کی شہادت مولانا ضیا احمد بدایونی جیسے ثقہ بزرگ نے دی ہو، مولانا محمد علی کے اوصاف حسنہ کا بیان کتنا معتبر ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو خدا ترسی، متانت اور شائستگی کے معنی و مفہوم سے خوب واقف ہیں، مولانا بڑے نہ ہوتے تو میر صاحب جیسا دیانت دار اور فرائض شرعیہ کا سختی سے پابند شخص وہ سب کچھ نہ لکھتا جو اس نے اپنے دوست کی یاد میں جسے وہ اپنا بھائی سمجھتا تھا، لکھا ہے۔

یہاں یہ مقصود نہیں ہے کہ میر صاحب کے حالاتِ زندگی لکھے جائیں یا ان کے اخلاق حمیدہ بیان

---

۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا محمد علی کے انتقال پر سید محفوظ علی نے اس عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو اس وقت کے کئی اخباروں اور رسالوں میں چھپا تھا۔ اس مضمون کے چند ٹکڑے "تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را" کے مصداق رسالہ جامعہ کے اس خصوصی نمبر میں شائع کیے جا رہے ہیں۔

کی جائیں، ہاں ان کے بارے میں ان کے معاصرین کی، بڑے ہوں یا چھوٹے، رائے ضرور قلمبند کروں گا کہ اس سے اس شخص کی عظمت کا کچھ پتہ ضرور چل جائے گا جس نے "اپنے عزیز بھائی (مولانا محمد علی) کی تربت پر محبت کے پھول" چڑھائے تھے۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"مولانا محمد علی کو سید صاحب سے جو دلی شغف تھا وہ شروع سے آخر تک قائم رہا "کامریڈ" اور "ہمدرد" کا خواب دونوں نے مل کر دیکھا تھا اور اس کی تعبیر و تشکیل میں دونوں شریک رہے۔ ایک صحرا کو نکل گیا، دوسرا اہالیوں کے گلی کوچوں میں بھی رسوا نہ ہوا۔ مولانا محمد علی کے مزاج میں جو بے پایاں شدت اور حرارت تھی، جس نے ان کو ہمیشہ نعل در آتش رکھا، جس کی وجہ سے کوئی شخص مولانا کے ساتھ یکسوئی اور استقلال کے ساتھ کام نہ کر سکتا تھا اور جس تپش و طوفان کے بالآخر وہ خود نذر ہو گئے، اس نے سید محفوظ علی کو کبھی مسر ل نہیں کیا۔ سید محفوظ علی نے اس مہر نیمروز سے روشنی اور حرارت بھی اکتساب نہ کی۔ محفوظ علی اپنے نظام شمسی خود تھے۔"

غلام رسول مہر رقم طراز ہیں:-

"مجھے سید محفوظ علی مرحوم بدایونی کی زیارت کا شرف حاصل نہ ہوا، لیکن مولانا ظفر علی خاں مرحوم، مولانا محمد علی مرحوم، شعیب قریشی مرحوم اور بہت سے اکابر و احباب کی زبانی ان کے اوصاف و محاسن سنتا رہا۔ ان کے بعض مضامین و مقالات مختلف رسالوں میں پڑھے میرا تاثر یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے بہترین لکھنے والوں میں سے تھے۔"

میر صاحب کے انتقال پر مولانا عبدالماجد دریابادی کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

"سید محفوظ علی اپنے دور کے بڑے اچھے لکھنے والوں میں تھے اور شوخ نگاری و ظرافت کے ایک طرز خاص کے موجد تھے۔ ظرافت ذرا اونچے اور علمی قسم کی تھی۔ عوام کی سطح سے بلند، حلم اور طینت دونوں کا جوہر خاص شرافت تھی۔ ہر ایک کے ہمدرد و غمخوار، بڑے سلیح جو، ذاتی زندگی میں سخت متشرع اور پختہ دیندار ....

"بچپن میں محمد علی کے اساد شفیق رہے اور جب وہ بڑے ہوئے تو ان کے رفیق۔ علی برادران کے حلقے کی ایک ممتاز شخصیت اور ان کے دور کی ایک اہم یادگار رخصت ہو گئی"

"مرحوم بڑے ہی مخلص، بڑے ہی شریف، وضعدار اور سچے دین دار تھے، اور ساتھ ہی بڑے محتاط ادیب وصاحبِ قلم اور نکتہ رس و متوازن نقاد اور بڑے ہی خوش ذوق مذاق سخن، چہرہ ایسا مولوی مگر کسی کو گمان بھی اس کے گریجویٹ ہونے کا نہ ہوتا ہے"

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے

" میر محفوظ علی علم و آگہی میں اپنی ذات سے ایک دائرۃ المعارف یا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ مذہب، تاریخ، ادب، شاعری، لغت، فلسفہ کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر ان کی پوری نظر نہ ہو اور کوئی موضوع نہ تھا جس پر وہ اعتماد کے ساتھ گفتگو نہ کر سکتے ہوں۔ وہ خود اپنی وضع قطع سے مشرقی روایات کے زندہ نمونہ تھے اور اپنی تحریروں میں ان اقدار کے فروغ پر زور دیتے تھے جو ان کے خیال میں ان روایات کی اساس ہیں . . . "

غرض کہ سید محفوظ علی خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، وہ ایک بڑے انسان تھے کبھی شہرت نہ چاہی چاہتے تو شہرت ان کے قدم چومتی، خود عائد کردہ گمنامی کو بھی وہ ایک اخلاقی نصب العین تصور کرتے تھے، یہ بھی ایثار اور ضبط نفس کی ایک صورت ہے، ایسے بے نفس مرد حق آگاہ نے اپنے دوست کی یاد میں جب لکھا تو وہی لکھا جسے وہ برحق سمجھتا تھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں میر صاحب کے مراتب بلند سے بلند تر ہوتے رہیں۔

مدیر

محمد علی اوائل عمر میں بظاہر ان جذبات عالیہ سے بیگانہ نظر آتے تھے جنھوں نے آگے چل کر محمد علی کو محمد علی بنا دیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ ذرہ جو بیابان اور وہ قطرہ جو سمندر بن کر ساری دنیا کو اسے حدود کی پہنائی اور اپنے ساحل کو آغوش میں سمیٹ لینے والا تھا، شروع ہی سے ان کے دل کے کسی غیر آباد گوشے میں خاموش پرورش پا رہا تھا۔

جب وہ ولایت کو روانہ ہوئے تو ان کے دماغ پر عقل مآل اندیش کا قبضہ مگر ان کے دل پر عشق مطلق ناشناس کا غلبہ تھا اور ان کے مستقبل کی تشکیل میں دونوں کی رقابت و منافست کارفرما تھی۔ عقل کی رائے

تھی کہ وہ مسٹر ایم۔ علی آئی سی ایس بنائے جائیں مگر عشق کی صلاح کہ رئیس الاحرار مولانا حاجی محمد علی بنیں۔ عقل کی مرضی تھی کہ وہ انصاف کی کرسی پر بٹھائے جائیں مگر عشق کی ہوسی کہ الزام کے کٹہرے میں کھڑے ہوں عقل نے انھیں سزا دینے کا طریقہ مگر عشق نے سزا پانے کا سلیقہ سکھانا چاہا عقل نے انھیں جج کا جبہ اور وزارت کا خلعت مگر عشق نے جیل کا کرتا اور حج کا احرام پہنانا چاہا۔ عقل کا مشورہ تھا کہ وہ بریڈلا اور انگرسال کے زمرہ ساگردی میں مگر عشق کا حکم کہ اویس اور بلال کے حلقہ غلامی میں آئیں۔ غرض کہ عقل کا فیصلہ تھا کہ وہ یزید مگر عشق کا فتویٰ کہ سہمد ہوں اس کشاکش میں پایان کار عشق ہی کامیاب ہوا یعنی محمد علی سول سروس کے امتحان میں ناکامیاب ہوئے۔ اس میدان کی پہلی صبح اور اس مکتب کا پہلا سبق تھا۔ آگے آگے دیکھئے۔ اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را۔

۱۴ر جنوری ۱۹۱۰ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں

" تمہارے جانے کے بعد یہ ہوا کہ کونسل نے بالاتفاق رائے فیصلہ کیا کہ اموں کی کاشت میں کمی کے مسٹر محمد علی کسی طرح جواب دہ نہیں ہیں۔ اس کے بعد میں نے اپنی ترقی کی درخواست دی، ٹالم ٹولا ہوتی رہی۔ اس عرصہ میں مسٹر دت کا نزول ہوا۔ اوکھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ اُن کی رائے میری ترقی کے خلاف ہوئی اس لیے مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اس عرصے میں ٹائمز آف انڈیا میں چند مضامین میرے شائع ہوئے جن میں مسلمانوں کے حقوق کی پیروی کی گئی تھی اور مسٹر گوکھلے کی دوستی نما دشمنی کا پردہ فاش کیا گیا تھا۔ مسٹر دت سخت ناراض ہوئے اور میرا جواب طلب کیا گیا۔ میں نے جواب اس قدر دندان شکن دیا کہ کچھ بس نہ چلی۔ کونسل میں جواب پیش ہوا اور کچھ نتیجہ نکلا سوائے اس کے کہ ایک عام سرکلر شائع کیا جائے اور وہ بھی صرف یہ کہ سرکاری عہدہ داروں کو ایسے مضامین لکھنا مناسب نہیں ہیں جن کی وجہ سے مختلف مذاہب و قوم میں مخالفت پیدا ہو . . ریاست سے سخت بیزار ہوں لوکری سے بیزار ہوں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں "

آپ دیکھ رہے ہیں! ریاست سے بیزاری، نوکری سے بیزاری، یہاں تک کہ زندگی سے بیزاری! آخر یہ دنیا سے برداشتہ خاطری کیوں؟ کیا صاف نظر نہیں آتا کہ کوئی مصلحت ناشناس تعلقات کی بیڑیوں کو کاٹ کر، معلوم و معارف و مستعمل شاہ راہ سے جبراً ہٹا کر کسی نامعلوم و نادیدہ راستے پر چلیا اور کسی نئی جگہ پہنچانا چاہتا ہے؟ اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

اس کے بعد ملازمت سے لوضع رخصت لی جو استعفے کی محض نظر فریب شکل تھی مذہب و ملک کی خدمت کے لیے کمر باندھی کلکتے گئے۔ کامریڈ نکالا۔ دہلی آئے، کامریڈ کے ساتھ ہمدرد جاری کیا، جنگ طرابلس میں چندہ بھیجا، جنگ بلقان میں طبی مشن بھیجا، انجمن خدام کعبہ کی بنیاد ڈالی، مسجد کانپور کے سلسلے میں ولایت گئے، قید ہوئے، اخبار بند کرایا، گھر بار لٹایا، حاجی ہوئے اور آخر میں دارالکفر میں جان دے کر دارالامان اور مدینۃ الانبیاء میں زندگی جاوید پائی۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح "اندک اندک عشق در کار آمد بیگانہ رفت"۔

بڑودہ، بمبئی، کلکتہ اور دہلی میں مرحوم خفیف سی علالت میں بھی دو بار غیر میں مار کر کسی کی تربت رکھ لیے برسات کے دعاؤں میں خدا کا ہمیشگی شکریہ ادا کیا کرتے تھے خدا کی قدرت دیکھو کہ موت دیار غربت ہی میں آئی جہاں کیسی کی بزم رہ گئی کیونکہ سوائے چند خاص عزیزوں کے نہ وہاں ہم نشیں تھے نہ ہم زبان اور نہ تیمار دار رہے، نوحہ خوان مگر اس دیار غیر میں (بھی) عاشق کا جنازہ دھوم سے نکلا تھا . . .

اسلام کی نصرت کا جذبہ مرحوم کی طبیعت میں پہلے شوق بنا، پھر ولولہ ہوا، آخر میں جنون۔ یہی جنون تھا جو کامریڈ کے صفحوں پر اور جامع مسجد کے منبر پر، قلم سے اور زبان سے اہل احتساب کو دعوت گیر و دار دیا کرتا تھا

طفلانِ شہر بے خبر از دارِ جنونِ ما !

یا ایں جنوں ہنوز سر و دار سنگ نیست !

جنوں کی سرکار سے سب سے بڑا انعام جلعت بہ یار جو عطا ہوا وہ (١) ارادہ میں پہاڑ کا سا استقلال، (٢) طبیعت میں دریا کا سا بہاؤ اور (٣) جذبات میں طوفان کا سا جوش تھا اسی کی بدولت تو تھا کہ خدمت مذہب کی جو نوعیت ذہن میں آئی اس کی بجا آوری پوری استقامت و استقلال، نہایت تیزی و روانی اور شدید جوش و انہماک سے کی۔

قید و بند کی جو سختیاں جھیلنی پڑیں وہ نہ تو کسی دوسرے شخص کے اعمال و افعال کی پاداش میں تھیں نہ بہانہ جتا دیں کہ بلا علم و اطلاع نعتۃً سر پر آ پڑی ہوں بلکہ خود ان کی اپنی ہی تحریروں اور تقریروں کے جرائم کی سزائیں تھیں۔ اور یہ جرم وہ تھے جن کا ارتکاب انہوں نے کسی فوری جوش یا وقتی اشتعال کی حالت میں نہیں

بلکہ خوب سوچ سمجھ کر اور اچھی طرح جان بوجھ کر کیا تھا، چنانچہ ہر سزا بھگتنے اور ہر کڑی جھیلنے کے بعد ان کا رونگٹا رونگٹا یہی پکارتا تھا۔ ع

آں قدر رنجے کہ دل می خواست در پیکاں نہ بود

خدا کے خوف کے ساتھ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے بے خوفی، ایک مسلمان کی خصوصیت امتیازی اگر آج نہیں تو پہلے کسی زمانے میں تو تھی۔ دنیا کی بڑی طاقت سے ان کی بے خوفی کے واقعات تو دنیا بھر کے علم و ذہن میں ہوں گے مگر خدا کے خوف کے متعلق یہ آنکھیں آج اور اس وقت گواہی دینے کو موجود ہیں کہ ـــــ ماضی قریب میں نہیں جب کہ محمد علی کی ہیئت کذائی خشوع و خضوع کی قد آدم تصویر بن گئی تھی بلکہ ماضی بعید میں جب کہ سوٹ بوٹ، منڈی داڑھی اور قیصری مونچھیں بظاہر خدا سے بے خوفی کا مجسمہ بنی کرتی تھیں، فجر کی قضا نماز کے بعد سجدے کی جگہ کو تر ہوتے، دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو کانپتے، سائل کو دینے کے لیے جیب سے رقم کے ساتھ آنکھوں سے آنسو نکلتے دیکھا ہے۔ دل کے اسی گداز نے دکھا دیا کہ دنیا کے خریدار مسٹر محمد علی تو معمورۂ لندن سے خالی ہاتھ آئے۔ مگر دین کے طلبگار مولانا محمد علی خزانۂ مہر دلی سے جھولی بھرے گئے ؎

بستند رہِ جرعۂ آبے بہ سکندر
دریوزہ گرِ میکدہ صہبا بہ کدو بُرد

الٰہ العالمین! صدقہ اپنے حبیب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ و اصحابہ وسلم کا محمد علی کی مغفرت کر، انھیں اپنے جوارِ قرب میں جگہ دے، انھیں اپنے مقبول بندوں کے ساتھ محشور کر، مجھ نامہ سیاہ سراپا گناہ کا خاتمہ بخیر کر اور ہم سب مسلمانوں پر رحم فرما۔ آمین یا رب العالمین۔

معین الدین حارث

عقیدت کے چند آنسو

ساٹھ پینسٹھ سال پرانی بات ہے۔ میں اپنے گاؤں سوپارہ میں جو ممبئی سے قریب تھا ہیں
واقع ہے گاؤں کے مدرسے کا طالب علم تھا۔ ہمارے گاؤں میں اچھی خاصی مسلم آبادی تھی اور کئی مسجدیں
تھیں۔ ہمارے محلے کی مسجد جامع مسجد کہلاتی تھی۔ ہر جمعہ کو اس مسجد میں دو بس ایسے خوش پوش
دو جوان نظر آتے تھے جو اس بستی کے نہیں تھے بلکہ ہر ہفتے صرف نماز جمعہ ادا کرنے وہاں آیا کرتے تھے۔
دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ قریب ہی کے ریلوے اسٹیشن بھائندر سے آتے ہیں جہاں ان کا اسا
مان اور کاروبار ہے مگر اس جگہ نہ مسلم آبادی ہے اور نہ کوئی مسجد۔ یہ نوجوان خوش حال خوش پوش
اور تعلیم یافتہ تھے اور مذہب کے پاسدار بھی۔ اکثر مغربی لباس میں ملبوس ہوا کرتے تھے اور ان میں سے بڑے
بھائی کے کوٹ کے کالر پر ایک خوبصورت گول بیج BADGE لگا ہوا تھا جس پر سرخ رنگ میں ہلال بنا
ہوا تھا اور اس کے کنارے "نحن انصار الله" لکھا ہوا تھا۔ ہلال کے دائرے میں "خادم کعبہ" لکھا ہوا تھا۔

کسی صاحب کے یہ دریافت کرنے پر کہ یہ تمغہ کس بات کی علامت ہے انھوں نے بتایا کہ شوکت علی
اور محمد علی نام کے دو بھائی ہیں دونوں علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں ان میں سے چھوٹے محمد علی ولایت میں
بھی تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے اور ان کے اور ساتھیوں نے مل کے "خدام کعبہ"
کے نام سے ایک انجمن بنائی ہے جس کا مقصد خانۂ کعبہ کی حفاظت اور اللہ کے اس گھر کی زیارت
کے لیے جانے والے حاجیوں کی خدمت کرنا ہے اور جو صاحب اپنے کوٹ کے کالر پر خدام کعبہ کا
بیج لگائے ہوئے ہیں وہ اسی انجمن خدام کعبہ کے رضا کار ہیں۔

یہ تھا علی برادران سے میرا پہلا غائبانہ تعارف۔ اس کے بعد چند سال اور بیت گئے میں
گاؤں کے مدرسے کی ابتدائی تعلیم ختم کر کے مالوی تعلیم کے لیے روزانہ ریلوے ٹرین سے اپنے گاؤں

سے بمبئی جانے لگا تھا۔ یہ بڑا پرآشوب زمانہ تھا علی برادران جو ۱۴-۱۹۱۸ء کی پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں چھندواڑہ اور بیتول میں نظر بند رہے جنگ کے خاتمے پر رہا ہو چکے تھے ایک روز یہ خبر ملی کہ یہ دونوں بھائی بمبئی آرہے ہیں اور بوری بندر کے اسٹیشن پر شام کو ان کا استقبال ہوگا۔ اسکول کا وقت ختم ہوتے ہی میں بھی چند اور ساتھیوں کے ساتھ بوری بندر جا پہنچا۔ گاڑی کے آنے میں ابھی دیر تھی مگر اسٹیشن کے سارے پلیٹ فارم ہزاروں آدمیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ جب گاڑی اسٹیشن میں داخل ہوئی تو ساری فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ گاڑی کے رکتے ہی فرسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر دو نوجوان کھڑے دکھائی دئے۔ مغربی لباس پہنے ہوئے سر پر بالوں والی فرکیپ لگی ہوئی اور دونوں کے لباس پر وہی نحن انصار اللہ اور خادم کعبہ والا تمغہ لگا ہوا جو میں برسوں پہلے ایسے گاؤں میں ایک اور نوجوان کے کالر پر دیکھ چکا تھا۔ یہ تھی میرے لیے علی برادران کی پہلی دید۔

اسٹیشن پر شاندار استقبال کے بعد دونوں بھائی جلوس کے ساتھ اس جگہ لے جائے گئے جہاں ان کے قیام کا انتظام تھا۔ یہ زمانہ تحریک خلافت کے آغاز کا تھا آناً فاناً اس تحریک کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ اس تحریک میں سرکاری مدارس کے مقاطعے کا پروگرام بھی شامل تھا اس دور کے ہزاروں طلباء نے اس آواز پر لبیک کہا۔ میں نے بھی سرکاری اسکول کا مقاطعہ کر کے خلافت کمیٹی کے قائم کردہ ثانوی اسکول مصطفےٰ کمال پاشا ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ملحق تھا۔ دو تین سال بعد اسی اسکول سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے امتحان میٹرک میں کامیابی حاصل کی۔ یہ اسکول ڈونگری کے علاقے میں سلطان منشن میں تھا اور اسی عمارت کی بالائی منزل پر مرکزی خلافت کمیٹی کا دفتر تھا مولانا شوکت علی صاحب کا اسی جگہ مستقل قیام تھا اور مولانا محمد علی اور تحریک خلافت کے اور رہنما وقتاً فوقتاً وہاں آیا کرتے تھے اور ہم طلبا کو ان کی زیارت ہو جایا کرتی تھی۔ اسی زمانہ میں ناگپاڑہ کے علاقے میں مستان تالاب پر خلافت کے جلسے ہوا کرتے تھے اور ان جلسوں میں علی برادران، مولانا ابوالکلام آزاد اور تحریک خلافت کے اور لیڈروں کی تقریریں سننے کا بھی موقع ملا کرتا تھا۔

ابھی دونوں علی برادران ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ان کے اور ساتھیوں پر کراچی میں مقدمہ ہوا اور وہ دو دو سال قید با مشقت کی سزا پا کر جیلوں میں بند کر دیے گئے اس قید و بند سے ان کی جب رہائی ہوئی تو میں جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کے کالج میں داخلہ لے چکا تھا ادھر مولانا محمد علی نے دہلی سے اسا اردو روزنامہ ہمدرد اور

انگریزی ہفتہ وار "کامریڈ" پھر جاری کر دیا تھا ان کی بڑی صاحب زادی آمنہ مرحومہ شدید علالت کی وجہ سے علیگڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کرایہ کی عمارتوں میں سے ڈگی کوٹھی میں لائی گئی تھیں اور مولانا محمد علی کا قیام بھی انہی کے ساتھ تھا اسی زمانے میں مولانا محمد علی انڈین نیشنل کانگریس کے کوکناڈا اجلاس کے صدر منتخب ہوئے اور انہوں نے اپنا بیشتر خطبہ صدارت علی گڑھ میں تیار کر کے وہیں سے کوکناڈا گئے۔ بمار آمنہ کا علی گڑھ میں انتقال ہوا اور جسم علی گڑھ کالج سے چند سال قبل علی برادران نے پولیس کی امداد سے نکالا گیا تھا اسی کے قبرستان میں مرحومہ کو سپرد خاک کیا گیا۔

۱۹۲۵ء میں گرمی کی تعطیلات شروع ہونے سے پہلے جامعہ میں یہ اعلان ہوا کہ جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کیا جا رہا ہے اور جن طلبا کو اپنا سلسلہ تعلیم جامعہ میں جاری رکھنا ہے وہ چھٹیوں کے بعد بجائے علی گڑھ کے دہلی آ جائیں میں بی کالج کی تعلیم کے دو سال علی گڑھ میں پورے کر چکا تھا آخری دو سال کا کورس پورا کرنے کے لیے چھٹیوں کے بعد دہلی گیا جہاں قرولباغ کے علاقے میں کرایہ کی کوٹھیوں میں جامعہ کے ساتھ میں مدرسہ اور کالج بھی تھا اور ان عمارتوں کے بالمقابل لطیف منزل نامی ایک بڑی لمبی چوڑی عمارت میں کالج کے طلبا کا ہوسٹل تھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی علی گڑھ سے دہلی کو منتقلی مولانا محمد علی کو ناپسند تھی اور ان دنوں اسی وجہ سے جامعہ سے کچھ ناراض بھی ہو گئے تھے مگر ان کی یہ ناراضگی زیادہ عرصہ قائم نہ رہی اور جامعہ کے بانی کی حیثیت سے اس ادارے سے انھیں جو تعلق تھا، قومی تعلیم کے تحفظ سے جو دل چسپی تھی اور جامعہ کے کارکنوں علما کے ساتھ انھیں جو تعلق تھا، وہ ان کی عارضی ناراضگی پر غالب آئی اور چونکہ ان کا قیام پرانی دہلی میں کوچہ چیلان میں تھا وہ اپنے دن بھر کے کام اور دیگر مصروفیات کے بعد اکثر اوقات شام کے وقت تانگے پر قرولباغ آ جایا کرتے تھے اور جامعہ کے کسب خانے کے چھوٹے سے ہال میں طلبا کے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتے تھے مولانا محمد علی کی اس طرح آمد جامعہ کے طلبا کے لیے نوید مسرت بن جاتی تھی اور وہ پروانہ وار ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے تھے اور ان کے درس اور مواعظ سے مستفید ہوا کرتے تھے۔

مولانا محمد علی مرحوم کو قریب سے دیکھنے کا اور ان کی باتیں سننے کا یہ موقع ان کی دلآویز شخصیت ان کا علم و فضل اسلام کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت قرآن مجید اور احادیث نبوی سے ان کا ربط اور سیرت نبوی اور تاریخ اسلام پر ان کی گہری نظر کا وہ نمونہ پیش کیا کرتا تھا جس کی یاد کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ مولانا محمد علی

خود اچھے شاعر تھے اور شعر و سخن سے گہری دلچسپی رکھتے تھے قدیم شعرا میں ان کے محبوب شاعر غالب تھے اور خود اپنے دور کے شعرا میں اقبال کی شاعری کا ان پر غیر معمولی اثر تھا اور اپنی تقریروں میں وہ غالب کے اشعار اور اقبال کی مثنوی اسرار خودی و رموز بے خودی سے فارسی کلام اس انداز سے چست کرتے تھے کہ سامعین کے دلوں میں گھر کر جاتا تھا اور ان کی تقریروں میں اور زیادہ زور اور اثر پیدا کرنے کا باعث بن جاتا تھا۔

قرول باغ میں جامعہ کی ان یادگار صحبتوں کے علاوہ مولانا محمد علی کی تقریریں سننے کا ایک اور موقع بھی اس زمانے میں فراہم ہوگیا تھا اور وہ ہر جمعہ کو ان کا بیان تھا جو وہ پابندی کے ساتھ بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں شاہجہانی دور کے منبر کے قریب بیٹھ کر کیا کرتے تھے ان کی طول بیانی کی عادت کی وجہ سے بعض اوقات بیان کا یہ سلسلہ اتنا طول کھینچتا تھا کہ عصر کی نماز کا وقت آجاتا تھا مگر اس طول بیانی کے باوجود ان کے بیانات اس قدر دلآویز اور علم و ادب کی چاشنی سے اتنے مملو ہوتے تھے کہ سننے والوں پر بار نہیں گزرتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس دو سال کی مدت میں میں نے شاید ہی ان کے اس قسم کے بیانات سے مستفید ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیا ہو۔

مولانا محمد علی پر ان دنوں مذہبی رنگ بہت زیادہ غالب تھا اور اس لیے ان کی ہر تقریر کلام مجید کی تفسیر احادیث نبوی کی تشریح اور سیرت نبوی پر تبصرہ ہوا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ وہ وقتاً فوقتاً اہم سیاسی مسائل پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے مگر وقت کے سیاسی مسائل سے بحث کرتے وقت بھی وہ اپنے سامعین کو یہ یاد دلاتے رہتے تھے کہ بحیثیت مسلمان کے ان کا نقطۂ نظر اس باب میں کیا ہونا چاہیے قرآن و حدیث کے حوالے اور سیرت نبوی اور اسلام کے دور اول کی تاریخ ہر وقت ان کے پیش نظر رہتی تھی اور اسی کی روشنی میں وہ وقت کے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ تقریر کا موضوع خواہ کوئی بھی ہو اور بات کتنی بھی طویل کیوں نہ رہی ہو ان کے بیان کے خاتمے پر سامعین پر، طلبا کا گروہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہتا تھا کہ ان کے بیان سے اس کے علم و معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

اسی زمانے میں جو مولانا محمد علی کی زندگی کا آخری دور تھا بعض ایسے علمی اور سیاسی معرکے پیش آئے جن پر مولانا محمد علی کا اپنے پرانے رفقائے کار کے ساتھ شدید اختلاف ہوا اور چونکہ انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ روزنامہ ہمدرد کی صورت میں حاصل تھا اس لیے ایسے معرکوں میں وہ اپنی بات بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کر سکتے تھے اور کرتے بھی تھے۔

۱۹۲۴ء میں اتاترک مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں خلافتِ عثمانی کا خاتمہ، حجاز میں آلِ سعود کے ہاتھوں شریف حسین کی شکست اور مکہ مکرمہ میں موتمر اسلامی کا انعقاد یہ اس دور کے اہم سیاسی واقعات تھے ملکی امور میں سرحد کی سرزمین میں آئینی یا علاقہ غیر میں چند قادیانی مبلغین کا قبائلیوں کے ہاتھوں ارتداد کے الزام میں سنگسار کیا جانا اور اس پر ایک طویل مذہبی بحث کا چھڑ جانا تھا انہی دنوں خواجہ حسن نظامی مرحوم سے بھی مولانا محمد علی کی قلمی جنگ چھڑ گئی جو ہفتوں جاری رہی۔ ہمدرد میں مولانا محمد علی کی تحریروں کا جواب خواجہ حسن نظامی اپنے پندرہ روزہ منادی میں دیتے رہے اور اس کو ناکافی سمجھ کر ان کے اور طرفدار بھی اس بحث میں کود پڑے تو دوسری طرف سے منادی کے جواب میں "سادی" اور "اَنادی" جیسے پرچے شائع ہونے شروع ہوئے اور ہفتوں کی اس قلمی جنگ کے بعد یہ میدان بھی پوری طرح مولانا محمد علی مرحوم کے ہاتھ رہا۔

اپنی طالب علمی کے دور میں اور بالخصوص جامعہ ملیہ کی طالب علمی کے زمانے میں مولانا محمد علی کی ذات سے اور ان کی تحریروں کے مطالعے اور تقریروں کی سماعت سے استفادہ کا جو موقع ملا وہ میری طالب علمانہ زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ ان دنوں کی یاد پوری نصف صدی گذر جانے کے بعد آج بھی تازہ ہے جیسی اس وقت تھی اس قسم کے تجربات کا اس دور کے طلبا کی کردار سازی میں بھی بڑا دخل رہا اور ان میں بعض بلند اقدار کو اپنانے کا وہ جذبہ پیدا ہوا جو ان کے مستقبل کو بنانے اور سنوارنے میں مددگار ثابت ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض امور میں اور سیاسی مباحث میں ان سے اختلاف ہو جانے پر بھی ان کے لیے دل میں عقیدت و احترام کا جو جذبہ تھا اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔

اس یادگار دور کے قابلِ ذکر واقعات کی تفصیل بہت طویل ہو سکتی ہے مگر طوالت سے بچنے کی خاطر صرف دو ایک واقعات کے ذکر پر اکتفا کرنا ہوگا۔

مولانا محمد علی مرحوم غالب کے اشعار ٹھیک موقع پر اس طرح استعمال کرتے تھے کہ نہ صرف ان کی تقریروں کا زور بڑھ جاتا تھا بلکہ بعض اوقات وہ پورا معرکہ جیت لیتے تھے۔ ایک بار دہلی کی جامع مسجد میں ان کی تقریر سے پہلے یہ خبر ہوئی تھی کہ آج اگر مولانا نے لب کشائی کی تو ہنگامہ ہوگا۔ خود مولانا کو اس کی اطلاع ہو چکی تھی وہ حسبِ معمول نماز جمعہ میں شریک ہوئے اور بعد نماز منبر کے پاس بیٹھ کر پورے اطمینان کے ساتھ غالب کے اس مشہور شعر سے اپنی تقریر شروع کی ؎

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

ظاہر ہے کہ اس شعر کے پڑھنے کے بعد سارا مجمع مولانا کی گرفت میں آگیا تھا اور ایسی حالت میں ہنسنے کو روکنے کی جرات کون کر سکتا تھا۔

ایک اور موقع پر تاریخ اسلام کے دور اول کی اسلامی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے اور اپنے سامعین کے دل گرمانے کے لئے اندلس پر جواں سال مسلم سپہ سالار طارق کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے ؎

طارق چوں بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطا ست
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم
ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا روا ست
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ما ست

اس واقعے پر پوری نصف صدی گذر جانے کے بعد بھی جب کبھی جامع مسجد دہلی میں حاضری اور نماز جمعہ کی ادائگی کا اتفاق ہوتا ہے جب اس تاریخی منبر پر نظر پڑتی ہے تو میری آنکھوں میں مولانا محمد علی کی تصویر پھر جاتی ہے اور کانوں میں ان کی وہ بھرائی ہوئی آواز گونجنے لگتی ہے جس میں انھوں نے اقبال کے یہ اشعار سنائے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد آتا ہے کہ جب آخری شعر کے لفظ "خندید" پر پہنچے تھے تو ان کے اپنے چہرے پر ایک عجب مسکراہٹ لہرائی تھی اور "دست خویش بہ شمشیر برد" کہتے ہوئے ان کا دایاں ہاتھ بائیں طرف گیا تھا اور ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ بھی میاں سے شمشیر باہر لا رہے ہیں۔

مولانا محمد علی احرار ہند کے رؤسا میں سے تھے اور اسی بنا پر رئیس الاحرار کہلاتے تھے ان کے انتقال پر بھی اب تقریباً نصف صدی گذر چکی ہے۔ وہ محمد علی جنھوں نے گول میز کانفرنس کی اپنی یادگار تقریر میں برطانوی حکومت سے اپنے وطن عزیز کے لیے آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں غلامی کی حالت میں اپنے وطن واپس جانا نہیں چاہتا۔ وہ واقعی اس سفر سے واپس نہیں آئے بلکہ قیام لندن ہی

میں سفر آخرت اختیار کیا اور بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کے احاطے میں دفن ہونے کی سعادت انھیں نصیب ہوئی۔

سنہ [illegible] میں جب حکومت ہند کے حج ڈیلی گیشن کے رکن کی حیثیت سے حجاز مقدس جانے کا اتفاق ہوا تو حج کے بعد میں نے مشرق وسطیٰ کے چند ممالک کا سفر کیا اور قبلۂ اول کی زیارت کے شوق میں بیت المقدس میں حاضری دی، وہاں کے ہفتہ بھر کے قیام اور مسجد اقصیٰ میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد مولانا محمد علی کی قبر پر فاتحہ خوانی کی سعادت حاصل کی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ان کی قبر جس کمرے میں ہے اس کی دیوار پر ان کے کسی عقیدت مند نے انہی کا یہ مصرعہ لکھا ہے ؎

مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

کہا جاتا ہے کہ یہ مصرعہ ہندوستانی انقلابی فاروقی صاحب نے لکھا ہے جو برسوں قاہرہ میں مقیم رہے اور وہیں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ سنہ [illegible]ء میں سفر یورپ سے واپسی پر چند ہفتے قاہرہ میں گذارنے کا اتفاق ہوا تو ہندوستان کے اس انقلابی سے کئی بار ملاقات ہوئی اور انہی کے ساتھ آزادی ہند کے ایک اور مجاہد اور قاہرہ میں آزاد ہند کے پہلے سفیر سید حسین مرحوم کی قبر پر فاتحہ خوانی کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ اسی قیام قاہرہ میں مراکش کی آزادی کے لیے فرانس اور اسپین کے خلاف مسلسل جہاد کرنے والے بطل جلیل امیر عبدالکریم ریفی سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو پورے اکیس سال فرانس کی حراست میں گذارنے کے بعد جب وہ پانی کے جہاز سے کود کر مصر کے ساحل پر آن پہنچے اور اس وقت کی مصری حکومت نے انھیں پناہ دے دی تو قاہرہ میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کی تھی۔

اس طرح یہ تاریخی واقعات اور تجربات جنھوں نے حافظے کی روح پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں ہمیشہ یاد آتے رہیں گے اور یہ سلسلہ زندگی کے آخری لمحات تک جاری رہے گا۔ جب یہ واقعات اور انہی کے ساتھ اس دور کی وہ بلند و بالا شخصیتیں یاد آتی ہیں جنھوں نے اپنی ساری قوتیں آزادیٔ ہند کے حصول کی خاطر صرف کیں تو زبان پر ان کے لیے دعائے مغفرت جاری ہو جاتی ہے۔

آزادیٔ ہند کے ان مجاہدین کے سالار قافلہ مولانا محمد علی مرحوم تھے جن کی صد سالہ سالگرہ ہمارے دلوں میں ان کی اور ان کے ساتھ اس گذرے ہوئے قافلے کی اور بلند و بالا شخصیتوں کی یاد تازہ کرتی ہے گذرنے والے گذر چکے اللہ تعالیٰ ان کو جو ابھی باقی ہیں اور اس نئی نسل کو جس نے خواہ انھیں دیکھا نہ ہو مگر جن کا ذکر

سا ہوگا یہ توفیق دے کہ وہ ان کی زندگیوں کا مطالعہ کریں اور ان کی خوبیاں اپنے اندر جس حد تک بھی ممکن ہو پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ولادت تو مادر زاد ہوتی ہے لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی۔ عام طور پر موت اپنا انتخاب خود کرتی ہے لیکن محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں کو ایک حقیقت بنا دیا۔ سنگین اور صالح!

محمد علی کی زندگی اور موت دونوں ان کی انفرادی اور شخصی افتاد طبع کی ایک جلوہ گری تھی اور شخصیت کی اسی جلوہ گری کا نام آرٹ ہے — صحیح اور گراں مایہ!

محمد علی کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز تھے۔ کس کی زندگی میں نہیں ہوئے، لیکن ان کی موت نے ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو پُر شوکت بنا دیا۔

محمد علی کی ذہانت اور فطانت کہاں ملے گی۔ وہ تیغ اصیل تھی جو رزم میں بے پناہ تھی اور بزم میں ایک جلوہ گری۔

کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے، بولتے تو معلوم ہوتا کہ ابوالہول کی آواز اہرام مصری سے ٹکرا رہی ہے، لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کروپ کے کارخانے میں توپیں ڈھلنے والی ہیں یا بھرتا ہیماں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔ میں نے ان کو اسٹیج پر آتے اور بولتے ہوئے سنا ہے اور خود محمد علی کو داد دینے سے پہلے انیس کو داد دی ہے:

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے!

پروفیسر رشید احمد صدیقی (گنج ہائے گراں مایہ)

جناب رانا جنگ بہادر سنگھ
ترجمہ - جناب شہاب الدین انصاری

مولانا محمد علی
ایک دلآویز قدآور شخصیت

[جناب رانا جنگ بہادر سنگھ جامعہ ملیہ کے قدیم طالب علم اور مولانا محمد علی کے عقیدت مند شاگرد ہیں۔ موصوف نے مولانا محمد علی پر انگریزی میں ایک طویل مضمون لکھا تھا جو نومبر ۱۹۷۶ء میں انگریزی کے موقر ہفتہ وار اخبار "ریڈینس" میں تین قسطوں میں شائع ہوا تھا، اس کا ترجمہ ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ چونکہ مضمون کافی طویل ہے اس لیے کچھ حصے حذف کر دیے گئے ہیں۔ [ادارہ]

ی نوجوانی کے ایام میں جن قدآور سیاسی شخصیتوں کی قربت کا فخر مجھے حاصل رہا ہے ان میں سب سے آور شخصیت مولانا محمد علی کی تھی۔ سر پر ہلال سے مزین ٹوپی، لمبی عبا پہنے ہوئے ایک باوقار جسم پر جوش ما ڑھی کے ساتھ مولانا ایک ایسی تصویر معلوم ہوتے تھے جو خلفائے راشدین کے دور کی کسی البم سے نکالی گئی تحریک خلافت کے ایک معمار قائد کی شخصیت کے لیے ان کا بھاری بھرکم جسم اور لباس دونوں موزوں نے انھوں نے اسلامی شریعت اور روایات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ قیادت کی داریوں کو سنبھالنے کے لیے روحانی طور پر تیار تھے وہ ان رجعت پسند "ملاؤں" سے مختلف تھے کی صلاحیت ان کی تنگ نظری کا شکار ہو جاتی ہے آکسفورڈ کے ایک ذہین گریجویٹ ہونے کے ناطے مغربی افکار اور انگریزی ادب سے بخوبی واقف تھے اور اس وجہ سے ان کے نظریات اور خیالات پر یق عقلیت پسندی کی چھاپ تھی۔

اگر ان کی ٹوپی میں چاند لگا ہوا تھا تو ان کے ہاتھوں میں ترنگا جھنڈا بھی تھا ملک میں آزادی کی تحریک

کے عظیم رہنما مہاتما گاندھی خلافت کی تحریک کی حمایت کر رہے تھے تحریک آزادی کو ترکی میں دوبارہ خلافت قائم کرنے کی تحریک کے ساتھ فطری مناسبت تھی کیونکہ دونوں کا ہدف برطانوی سامراج تھا مولانا کی ذات میں سامراج دشمن جذبات اور امنگوں کے ملاپ کا نمونہ بھی جس میں دو مختلف محرکات شامل تھے۔ اور جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو علیحدگی پسندی کے رجحانات سے الگ کر کے انہیں قومی زندگی کے دھارے میں کھینچ لیا تھا۔ اس طرح ہندو مسلم اتحاد کی دیرینہ خواہش کے پورا ہونے کے ساتھ ساتھ آزادی کے حصول کے لیے مشترک تحریک کا آغاز ہوا۔

اتحاد کے اس دور میں مولانا محمد علی اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کی شخصیتیں باہمی میل جول کا سب سے ممتاز ستون تھیں اگرچہ بعد کے سالوں میں پیدا ہونے والے حالات کے دباؤ کے باعث یہ اتحاد قائم نہ رہ سکا۔ شوکت علی دیکھنے میں محمد علی سے بھی زیادہ پرشکوہ شخصیت کے مالک تھے علی برادران کی حیثیت مہاتما گاندھی کی انگریزوں کے غلبہ کے خلاف لڑی گئی جنگ میں بڑی اہم تھی۔ چنانچہ گاندھی جی یہ کہتے ہوئے کبھی نہ تھکتے تھے کہ وہ علی برادران کی جیب میں ہیں علی برادران کا قوم پرست قوتوں کی صف میں موجود ہونے کا تصور بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ بلکہ پلیٹ فارم پر مہاتما گاندھی کا اپنے منحنی جسم کے ساتھ قوی الجثہ علی برادران کے درمیان موجودگی کا منظر ایک ایسی شمع کا تھا جو ہر طرح سے محفوظ رہ کر روشنی اور قوت کا انعکاس کر رہی ہو اس طوفانی دور میں میرے لیے یہ منظر بڑا ہی دلچسپ تھا۔

میں مہاتما گاندھی کی ۱۹۱۹ء کی تحریک میں اپنے میٹریکولیشن کے امتحان کے دنوں میں ہی شریک ہو گیا تھا۔ کائستھ پاٹھ شالہ کالج میں تین سال گذارنے کے بعد ۱۹۲۲ء میں شہر کے تمام کانگریسی لیڈروں جن میں نہرو خاندان کے افراد بھی شامل تھے، کی گرفتاری نے میرے دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دیا۔ میں نے عدم تعاون کیا اور اپنے ساتھ بہت سے نوجوانوں کو لے کر سیاست کے میدان میں جو ستیہ گرہ کے نعروں سے گونج رہا تھا پہنچ گیا ہم ستیہ گرہی جو جیل سے باہر تھے ابھی جدوجہد کے لیے تیار ہی تھے کہ چوری چورا کے قریب ایک اتفاقی تشدد کے واقعہ سے متاثر ہو کر مہاتما گاندھی نے لگام کھینچ لی اور تحریک یکایک بند ہو گئی۔ میرے دل میں اگرچہ دوبارہ تعلیم شروع کرنے کی خواہش موجود تھی لیکن عملی سیاست میں کود پڑنے کے بعد گاندھی جی کے حکم کی وجہ سے ہم مجبور تھے کہ بدیسی حکومت کے ذریعہ چلنے والے تعلیمی اداروں میں دوبارہ واپس نہ جائیں میں نے اپنے لیے ایک مناسب کالج کی تلاش میں ان قومی کالجوں پر نظر ڈالی جو کانگریس کی تحریک پر

اور اس کی نگرانی میں ملک میں قائم کئے گئے تھے اور کاشی ودیا پیٹھ میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ڈاکٹر بھگوان داس اور اچاریہ نریندر دیو سے جو اس کے روح رواں تھے اپنی بے پناہ عقیدت کے باوجود میں بنارس میں کچھ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ وہاں کے ماحول میں کچھ ایسی بات تھی جو مجھے پریشان کر رہی تھی۔ ہمارے قدیم رشیوں نے جن اقدار کو جنم دیا ہے وہ اپنی جگہ درست سہی لیکن ہماری فطرت ہے کہ اوپری پرت سے مطمئن ہونے کے بجائے حقیقت کی تہ کو تلاش کریں۔ کاشی میں مختصر قیام کے بعد میں علی گڈھ چلا آیا جہاں مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بی۔ اے کی کلاس میں داخلہ مل گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ بہت سے انقلابات سے گذر کر اب نئی دہلی میں اوکھلا میں اپنے مستقل مستقر پر آ گیا ہے۔

مولانا محمد علی کے قریب آنے کا شرف مجھے علی گڈھ ہی میں حاصل ہوا۔ اس قومی درسگاہ کے چانسلر طب یونانی کے مشہور طبیب اور محب وطن حکیم اجمل خاں تھے۔ مولانا اس کے صرف شیخ الجامعہ نہ تھے ان کا شمار اس قومی تعلیم گاہ کے بانیوں میں ہوتا تھا بلکہ اس کے خاص بانی وہی تھے کیونکہ یہ مولانا کی گولہ باری تھی جس نے علی گڈھ یونیورسٹی کی دیواروں میں، جو رجعت پسند علیگڈھ کی گڑھ تھی، رخنے ڈال دیئے تھے اور یہاں سے طالب علموں کو ابھرتی ہوئی ہندوستانی قوم پرستی کے دائرہ میں کھینچ رہی تھی۔

جامعہ وہ جگہ تھی جہاں مجھے اپنے مستقبل کو ایک جرنلسٹ کے سانچے میں ڈھالنے کی سہولت ملی۔ مولانا خود ایک مثالی صحافی تھے اور غالباً انہی کی سربراہی میں صحافت کا ایک شعبہ کھولا گیا تھا۔ مسٹر اپسن (Mr. Upson) ایک نومسلم اینگلو انڈین اس شعبے کے پروفیسر تھے اور ایک پارسی جن کا نام مسٹر تھا ان کے معاون تھے۔ میں نے جو مضامین اپنے لئے منتخب کئے تھے ان میں صحافت بھی تھی کیونکہ یہ میری افتادِ طبع کے مطابق تھا۔ مجھے انگریزی اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھنے کا شوق تھا۔ انگریزی میں میرے مضامین اور ایک نظم کالج کے میگزین میں اور دوسری جگہوں پر چھپ چکے تھے میرے ہندی مضامین مختصر کہانیاں اور نظمیں ملک کے ممتاز ہندی جرائد میں جگہ پا چکی تھیں۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کے التوا میں پڑنے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخل ہونے کے بیچ کی مختصر مدت میں لکھا ہوا میرا ایک سیاسی ناول بنارس کی ایک فرم نے چھاپا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میری زندگی اعلیٰ مقاصد سے معمور رہے کیونکہ مجھے احساس تھا کہ اس کے بغیر یہ ایک پرفریب اور ناکام زندگی ہوگی اور میں چاہتا تھا کہ میرا قلم جو ابھی تک ایک ناتجربہ کار قلم تھا ایک پختہ کار مصنف کا قلم بن کر میرے اس نصب العین کے حصول کا ذریعہ بن جائے۔ جامعہ ملیہ میں مجھے احساس ہوا کہ

اپنے خواب کو حقیقت کا جامہ پہنانے کا ذریعہ مجھے مل گیا تھا۔

مولانا محمد علی کی صحبت کی مقناطیسیت نے جامعہ میں چند بہترین اور لائق ترین استادوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ ان میں عبدالمجید خواجہ تھے جو مولانا کی عدم موجودگی میں شیخ الجامعہ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، کیلاٹ صاحب، ماہر صاحب اور آکسفورڈ یا کیمبرج کے سند یافتہ حبیب صاحب تھے یہ اساتذہ جدید تعلیمی رجحانات کے حامل تھے۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی مخالفت میں قائم کیے گئے تعلیمی اداروں میں ایک غیر صحت مند اور رجعت پسندانہ ماحول ابھر رہا تھا جامعہ ملیہ کے اساتذہ میں جدید تعلیمی رجحانات اس بات کی ضمانت تھے کہ یہاں وہ ماحول نہیں ابھر سکے گا۔ جامعہ کے طالب علموں نے تحریک آزادی اور بعد کی قومی زندگی میں جو نمایاں رول ادا کیا اور زندگی کی جن اعلیٰ منزلوں پر پہنچے اس میں جہاں ان کی اپنی صلاحیتوں کو دخل تھا وہیں جامعہ کے ایک بامقصد طریقۂ تعلیم کا بھی اثر تھا۔

جامعہ میں طالب علمی کے دور میں بھی میں ایک فعال صحافی تھا اور لکھنؤ سے چھپنے والے ایک انگریزی روزنامہ میں سیاسی جدوجہد اور واقعات کی رپورٹیں بھیجا کرتا تھا۔ مولانا محمد علی کا انجمن اتحاد کے جلسے میں طلبا کے بھرے مجمع کے بیچ عظیم اعتدال پسند لیڈر سری نواس شاستری کے ساتھ کامیاب مباحثہ کا جس کا چشم دید گواہ تھا۔ دونوں انگریزی زبان و ادب کے ماہر تسلیم کئے جاتے تھے اور بے پناہ مقرر تھے۔ اسی طرح میں مدن موہن مالویہ جیسے پختہ کار لیڈر کا سوالات کی بوچھاڑ سے زچ ہونا دیکھ چکا تھا وہ علیگڑھ کے حلقہ سے کانگریس کی مخالفت میں کھڑے ہوئے لیڈر سیٹھ ہردے ناتھ کنزرو کی حمایت میں تقریر کر رہے تھے۔ میں نے اس واقعہ کی رپورٹ اخبار کو بھیجی تھی۔ مالویہ جی کی ہزیمت کی خبر جلی عنوان سے صفحہ اول پر چھپی تھی۔ محمد علی کی قیادت میں جامعہ کا علی گڈھ میں اتنا اثر تھا کہ کوئی بھی کانگریس مخالف پروپگنڈہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

مولانا محمد علی کے کام کرنے کے مخصوص طریقہ کار سے میری واقفیت جامعہ ملیہ کی طالب علمی کے زمانے میں ہوئی انھیں جوش و اضطرار کی حالت میں کام کرنے کی عادت تھی تلون مزاجی میں چھپی ہوئی بے پناہ تخلیقی قوت مجھے رجھاتی ہے مولانا کے کام کرنے کے طریقہ سے متاثر ہونا میرے لیے قدرتی بات تھی۔ ان کی تخلیقی قوت کے آخر وقت میں رونما ہونے کی ایک بہترین مثال ان کے اس خطبہ کی تیاری تھی جو انھوں نے ۱۹۲۳ء میں کوکناڈا میں ہونے والے کانگریس سیشن کے صدر منتخب ہونے کے بعد لکھا تھا۔

آج جب میں اس واقعہ پر غور کرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ ابتدائی دنوں میں مولانا نے کس طرح اپنا وقت ضائع کیا اور جب وقت گذر گیا تو اسے مٹھیوں میں پکڑنے کی ریس شروع کی۔ وہ ہیجانی انداز سے کام کر رہے تھے اور ہم لوگ جو انھیں اضطراری کیفیت میں قلم گھسیٹتے دیکھ رہے تھے انگشت بدنداں تھے کہ باوجود اپنی تمام تر کاوشوں کے ایک مختصر وقت میں یہ کیونکر کام کو مکمل کرسکیں گے۔ لیکن اپنے بے پناہ حافظہ اور زورِ فصاحت کے سہارے وہ اپنا خطبہ انگریزی زبان میں وقت پر تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے لیکن ابھی اس کا اردو اور ہندی ترجمہ ہمارے تین ساتھیوں یوسف حسین خاں صاحب، سعید انصاری صاحب اور سنسکرت زبان کے پروفیسر سوریہ کانت شاستری صاحب کو مکمل کرنا باقی تھا۔[1]

ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ تینوں ساتھی خوش قسمتی سے ہنوز حیات ہیں[2] تینوں تعلیم حاصل کرنے ملک سے باہر گئے وہاں کی جامعات سے اعلیٰ تعلیمی اسناد حاصل کیں اور ملک میں واپس آکر تعلیمی میدان میں اسم عام حاصل کیا۔ تینوں اپنی زندگی کے باقی دن ایک بامقصد انداز سے گذار رہے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی شخص پچھلے کارناموں پر زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ مجھے بھی ایک امریکن یونیورسٹی سے داخلہ کی یقین دہانی موصول ہوئی تھی لیکن پیسے کی کمی کے باعث میں امریکہ نہیں جاسکا۔ جامعہ کی سند جسے برطانوی حکومت تسلیم نہیں کرتی تھی یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں وقار کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ ہاں بعد کی بلکہ یوں کہیا

---

[1] مولانا نے مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم کو اپنے خطبے کے اردو ترجمے کے لیے علی گڑھ طلب فرمایا تھا، وہ ۱۴ر دسمبر (۱۹۲۳ء) کی رات میں علی گڑھ پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ "خطبۂ صدارت ابھی تک صرف نصف ہو پایا ہے۔" وہ لکھتے ہیں "مولانا کو ۲۴ر کو کوکناڈا پہنچنا لازمی اور اس کے لیے علی گڑھ سے ۲۰ر کو شب میں براہ دہلی روانہ ہونا لازمی، درمیان ۱۵ر کی صبح تک تصحیح و نظرثانی سو الگ رہا، مسودہ کی تکمیل تک ابھی ۵۰ فیصدی باقی، طباعت اور پھر ترجموں کے مرحلوں کا ذکر ہی نہیں۔" (محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق (حصہ اول) صفحہ ۱۴۳)

[2] ترجمے کے بارے میں مولانا دریاآبادی نے لکھا ہے کہ: "جامعہ ہی کے چند ہونہار اور سینیر طلبہ کے درمیان ایڈریس کے مختلف اجزا تقسیم کر دیے گئے، نظرثانی اور اصلاح کا کام اس خاکسار اور میر محفوظ علی کے سر رہا، اصل ترجمہ ان ہی بیچاروں نے کیا، ہم لوگ نظرثانی تک رہے اور وہ بھی جی کھول کر نہ کرسکے۔" (ایضاً صفحہ ۱۴۶)

[3] افسوس کہ اس اردو ترجمے کی اشاعت سے قبل ان تینوں میں سے ایک ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کا ۱۲ر فروری ۱۹۷۹ء کو انتقال ہوگیا۔ (مدیر معاون)

چاہیے کہ بہت بعد کی زندگی میں اہم مقاصد کے تحت میں درجنوں بار بیرونی ملکوں میں گیا اور میرے یہ سفر میرے لیے بے حد معلوماتی تھے۔

مولانا کے خطبہ کا ہندی ترجمہ سڈال میں اس وقت پہنچا جب کہ مولانا انگریزی خطبہ کا بیشتر حصہ پڑھ چکے تھے۔ خطبے کے کاغذات سیاہی کی وجہ سے گیلے تھے اور اچھی طرح سلے ہوئے نہیں تھے جس کی وجہ سے ان کا تقسیم کرنا مشکل ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ خطبے نے جس میں مولانا کا وسعت مطالعہ اور ان کی علمیت جھلک رہی تھی بڑے پیمانہ پر خراج تحسین وصول کیا۔ کانگریس کے خطبۂ صدارت کی تاریخ میں یہ طویل ترین خطبہ صدارت تھا۔ اس کے باوجود اس کا انداز اور اس میں موجود مواد ایسے پرکشش تھے کہ حاضرین نے شروع سے آخر تک توجہ سے سنا۔ آزادی کی جنگ کی شدت قدرے کم کر دینے کی رائے غالب ہوتی جا رہی تھی اس لیے کوکناڈا سے واپس آکر مولانا نے اپنے مشہور انگریزی ہفتہ وار اخبار کامریڈ کو دوبارہ جاری کرنے کی ضرورت پر شدت کے ساتھ سوچنا شروع کر دیا تھا جیسے ہی مجھے یہ خبر ملی میرے اندر اس اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں کام کرنے اور مولانا کی نگرانی میں صحافت کی عملی تربیت حاصل کرنے کی خواہش جاگ اٹھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ کاتب تقدیر نے ازراہ شفقت یہ لکھ دیا تھا کہ میری یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔

جامعہ سے بی۔ اے کرنے کے بعد میں اخبار میں سب ایڈیٹر کی آسامی کی تلاش میں تھا اور انگریزی روزناموں کے مدیروں کو درخواستیں بھیج چکا تھا۔ ان میں ہندوستان ٹائمس کے ایڈیٹر سردار کے ایم پانیکر بھی تھے۔ جامعہ کے ایک ہونہار طالب علم کی حیثیت سے میں نے مولانا کے دل میں بھی گھر کر لیا تھا۔ اس لیے میں نے ان سے بھی گذارش کی۔ لیکن مولانا اور سردار پانیکر دونوں کے اتفاقی جواب نے مجھے ایک عجیب الجھن میں گرفتار کر دیا۔ پانیکر صاحب نے سب ایڈیٹری کی پیشکش ۱۲۵ ماہانہ پر کی تھی۔ جبکہ مولانا پچاس روپیہ ماہانہ کا وظیفہ دے رہے تھے اس زمانے میں جہاں وہ تنخواہ کافی تھی، وظیفہ کی رقم بھی خاطر خواہ تھی لیکن دونوں کے درمیان فرق غیر معمولی تھا۔ اس کے باوجود مجھے اپنا انتخاب کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی میں نے وظیفہ کی تھوڑی رقم کو بڑی تنخواہ پر ترجیح دی کیونکہ وظیفہ کے ساتھ ساتھ مجھے مولانا محمد علی جیسی باوقار سیاسی شخصیت کی رہنمائی اور سرپرستی حاصل ہو رہی تھی

کامریڈ کے ساتھ ساتھ دہلی سے ۱۹۲۴ء میں مولانا نے اپنے دوسرے اتنے ہی مقبول اخبار، اردو

روزنامہ ہمدرد کو بھی جاری کیا "کامریڈ" اس سے پہلے کلکتہ سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ ان دنوں جسے دہلی شہر کہتے ہیں تو اس سے مراد فصیل کے اندر کا شہر تھا۔ نئی دہلی ابھی مستقبل کی کوکھ میں تھا۔ دریا گنج کے علاقہ میں چیلوں کی ایک بڑی کوٹھی میں مولانا نے اخبار کا دفتر اور پریس قائم کیا۔ کوٹھی میں ایک وسیع صحن بھی تھا۔ مولانا مع اپنے خاندان کے اسی کوٹھی میں فروکش ہو گئے۔

۱۹۲۶ء کی دہلی میں فاصلے بہت کم تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ لوگ پیدل جا سکتے تھے۔ جو لوگ پیدل نہیں چل سکتے تھے اُن کی خاص سواری تانگہ تھی۔ تانگے کی بہت سی قسمیں ہوتی تھیں۔ اگر بڑے بھائی شوکت علی کو کہیں جانا ہوتا تھا تو ملازم کو ایسا تانگہ تلاش کرنے کی ہدایت کی جاتی تھی جس کی پچھلی سیٹ کھلی ہوئی اور کشادہ اور جس کی کمانیاں مضبوط ہوں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جلد پہنچنے کا واحد راستہ ٹرام تھی۔

مولانا کو کسی کام کو نظم کے ساتھ کرنے کی عادت نہ تھی جس کی وجہ سے مجھے اکثر "کامریڈ" کے دفتر سے دن میں دو بار آنا جانا پڑتا تھا۔ میں ہر بار یہ فاصلہ پیدل ہی طے کرتا تھا۔ دوپہر کا کھانا میں راستے کے ایک ڈھابے میں کھانا کھاتا اور رات کا کھانا، جو دودھ ڈبل روٹی پر مشتمل ہوتا تھا میں ایک حلوائی کی دوکان سے لیتا تھا۔ چونکہ اخبار کی ضرورت کی وجہ سے اکثر رات میں جاگنا پڑتا تھا اس لیے میرے لیے یہ غذا بہت مناسب تھی۔ مولانا کے مسحور کن برتاؤ اور حصول مقصد کے جذبہ کی سرشاری کی بدولت مجھے یہ تنگدستی اور سختی جو میں نے اپنے اوپر عائد کر لی تھی، گوارا تھی۔

"کامریڈ" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شرکت کی غرض سے دہلی پہنچنے پر چند روز کے لیے میں اپنے ایک جامعی دوست ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا کے پاس ٹھہرا۔ ڈاکٹر ٹوپا عثمانیہ یونیورسٹی کے رجسٹرار کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر حال ہی میں مرحوم ہوئے ہیں۔ میرا قیام سیتا رام بازار میں ایک دوکان کے اوپری حصہ پر تھا۔ میرے مکان کے ٹھیک سامنے سڑک کی دوسری جانب میرے جامعہ کے دوسرے کشمیری دوست کیلاس ناتھ کول کا مکان تھا۔ کیلاس ناتھ کول پنڈت نہرو کے رشتے کے بھائی تھے جنھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور یکے بعد دیگرے ممتاز عہدہ جات انجام دینے کے بعد اب کانپور کی زرعی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ کول صاحب کی والدہ مجھ سے بڑی محبت کرتی تھیں انھوں نے اپنی محبت کی نشانی کے طور پر مجھے اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی رضائی کی شکل میں ایک بیش قیمت تحفہ دیا تھا۔ برسوں بعد جب

میری پنجابی بیوی تحریک ستیہ گرہ میں حصہ لینے پر گرفتار ہو کر لاہور کے اسی جیل میں رکھی گئیں تھیں۔ پنڈت نہرو کی ساس تھیں اس عظیم المرتبت خاتون نے میری اہلیہ سے میری خیریت معلوم کی۔ میری بیوی نے انھیں بتایا کہ میں نے ان کی دی ہوئی دلائی کو بڑے شوق اور بڑے جتن سے سنبھال کر رکھا ہے۔

شروع کے دنوں کی پریشانیوں کے بعد کامریڈ اور ہمدرد پوری آب و تاب کے ساتھ نکلنے لگے۔

کانگریس پارٹی اس وقت چینجرز و نو چینجرز دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ چینجرز کے جانب کانگریس کے بڑے لیڈر موتی لال نہرو تھے اس جماعت میں پارٹی کے اور بھی چوٹی کے لیڈر شامل تھے۔ وہ برطانوی سامراج کے خلاف لڑی جانے والی جنگ عوامی محاذ کے ساتھ ساتھ پارلیمانی محاذ پر بھی لڑنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے کانگریس کے اندر ایک جماعت سوراج پارٹی کے نام سے قائم کی تھی۔ نو چینجرز کو مہاتما گاندھی کی رہبری کا وقار حاصل تھا اور وہ ایک دوسرے محاذ کو کھولنا بے سود سمجھتے تھے۔ انھوں نے ستیہ گرہ پر آس لگا رکھی تھی۔

مولانا محمد علی "نو چینج" کی پالیسی کے بڑی فصاحت کے ساتھ وضاحت کرنے والوں میں تھے اور نو چینجرز کے پرجوش قائد تھے مولانا کے اخبار نے نو چینجرز کے ترجمان کی حیثیت سے ان کی بڑی خدمات انجام دیں۔ قلم تیر کی طرح لگا سکتا ہے اور زخم بھی بھر سکتا ہے۔ اپنے حریفوں کو تیر کر لگانے کے واسطے اپنے قلم کو بے رحمی سے استعمال کرنے میں مولانا نے ذرا بھی تامل نہیں کیا۔ اسی طرح اپنے حلیفوں کے زخموں پر پھایا رکھنے سے بھی انھوں نے دریغ نہیں کیا۔ قلم کو کب زہر میں ڈبولیں، کب امرت میں، یہ فن انھیں آتا تھا وہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں پیکر تراشی اور فقرہ بازی کے ماہر تھے اور انھیں ہر طرح توڑ مروڑ لیتے تھے۔ میں انھیں کامریڈ کو ادبی مینا کاری سے سجاتے دیکھ چکا تھا۔ ایسے شہ پارے ہوتے تھے جن میں فارسی کے اشعار انگریزی کے قالب میں نگینہ کی طرح جڑے ہوتے تھے۔ اور ایسے جاندار جملے بھی ساخت کرتے دیکھ چکا تھا جن کی چوٹ وہ اپنے حریف پر انتہائی بے رحمی سے مارتے تھے۔

ہندوستان ٹائمز کے اسسٹنٹ ایڈیٹر جی، سی، راگھون نے ایک بار ان پر تنقید میں بے احتیاطی کرکے انھیں سخت برافروختہ کر دیا۔ جواب میں مولانا نے کامریڈ میں ایک شعلہ بار سخت نوٹ لکھا اور اس میں بیچارے راگھون کو سعلہ پر دراز اور دروغ گو کہہ ڈالا۔ مولانا کے تیر بارعب و غضب نے راگھون کے پندار کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اسی طرح ایک دوسرے موقع پر چند انگریز صحافی مولانا سے ملاقات کرنے آئے اور ان کی

صحافت سے سخت اندوہ گیں ہوئے۔ واپس جاکر ایک رپورٹ میں انھوں دونوں بھائیوں کا ذکر "خوبصورت شیطان"
کے نام سے کیا۔ ان کی اس رپورٹ کے پیچھے ان کی بدطینتی اور ناشکری صاف جھلک رہی تھی۔ نتیجہ میں وہ
مولانا کی غضب سے بھری ہوئی جوابی تنقید کا ہدف ہے۔ مولانا ان پر جھپٹے اور اپنے برّاں قلم کو جو تلوار ہی جیسا
کی طرح استعمال کر گئے دونوں کی تکا بوٹی کر دی۔ مخلصانہ معاندانہ تنقید کو تو وہ کبھی کبھی برداشت کر لیتے تھے
لیکن کسی ایسی تنقید کو جو ان پر بدنیتی سے کی گئی ہو وہ نہیں برداشت کرتے تھے۔

مولانا کی نجی اور عوامی دونوں زندگیاں ان کی ذہانت کی روشنی، ان کی جذباتیت اور رنگینی سے
معمور تھیں۔ لیکن ان کی یہ صفات کبھی ان کے لیے سدِ راہ نہیں ثابت ہوئیں۔ ان کی بوالعجبی جہاں
کچھ لوگوں کو ان سے برگشتہ کر دیتی ہے وہاں ان کے لیے اوروں کے دل میں محبت پیدا کر دیتی تھی، لیکن
سیاسی و سماجی سطح پر ان کی بد احتیاطی اور تلوّن مزاجی نے آخری دنوں میں ان کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں
بڑی غلط فہمی پیدا کر دی۔ اعلیٰ مقاصد کے لیے ان کی بے داغ ایمانداری اور وطن کے لیے ناقابل تردید
وفاداری کے باوجود ان کا اثر کم ہوتا گیا اور وہ تنہا رہ گئے۔ لیکن یہ گفتگو بعد میں آئے گی۔

کامریڈ اور ہمدرد کے دفتر میں ان کے کام کرنے کے انداز یا سدی اوقات کی جانب ان کی بے پروائی
اور بے ضابطگی نے آہستہ آہستہ ادارہ کو کمزور کر دیا۔ اسی طرح گھر کے اندر ان کے لاابالی پن اور اصولِ
حفظانِ صحت اور کھانے پینے میں احتیاط کے لیے ایک حقارت آمیز لاپروائی نے دھیرے دھیرے ان
کی صحت کو خراب کر دیا۔ ان میں غالباً انسانی صفات کا عنصر ضرورت سے زیادہ تھا اس لیے وہ سلیقہ سے
جیسے کہ مشین کی طرح کام نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے مزاج میں بچوں سے مشابہ اضطراری کیفیت تھی۔
گاندھی جی جب بھی ان کے گھر آتے تو وہ فوراً صدمات میں تمام چیزوں کو پسِ پشت ڈال کر گاندھی جی کو خوش آمدید
کہنے کے لیے ان کا دوڑ پڑنا قدرتی بات تھی۔ ایک بار گاندھی جی کا غالباً ڈاکٹر انصاری کے گھر سے پیدل چل کر
آنا مجھے یاد ہے۔ اگر ان کے لکھنے کے کمرے میں کبوتر گھس آتے تو سامنے پڑے اخبار کے کام کے ڈھیر کو چھوڑ
کر تے اور فاؤنٹین پین کی سب کبوتر کی جانب اس طرح کر لیتے گویا بندوق ہو جس سے گولی مار دیں گے اور
ان کے پیچھے دوڑے اور چلائے "نکل جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا"۔ اسی طرح ایک بار ہجوم کا رستے اڈیٹر
کی کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور بانس کے زینے پر چڑھے رنگ کرنے والوں کے ہاتھ سے برش چھین کر انہیں
رنگ کرنے کا طریقہ بتانے لگے۔ نتیجہ میں دیوار پر ایک بڑا سا دھبہ پڑ گیا۔ یہ تمام حرکتیں ان کی بچوں کی سی

سیمابی کیفیت کا مظہر تھیں اور ان کی بھاری ذمہ داریوں کی ادائگی میں آڑے آتی تھیں۔ لیکن مزاج کی اسی خصوصیت نے انھیں ہم لوگوں کی نظروں میں عزیز کر دیا تھا

ان کی مرعوب کن عبا کے پیچھے جسے وہ پہنے رہتے تھے ایک سادہ دل انسان تھا، جس میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کی علامت بھی اور جو اپنے کو ناتوان اور عام انسانوں میں شمار کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ میں نے ان کے اس پہلو کا مظاہرہ کئی بار دیکھا لیکن یہاں قارئین کے سامنے وہ مثال پیش کروں گا جو میرے جامعہ کے پرانے دوست یوسف حسین خاں نے دی ہے کیونکہ وہ ان کی شخصیت کے اس دلنشیں پہلو کو نہایت واضح انداز میں پیش کرتی ہے۔

مولانا محمد علی، یوسف حسین اور میرے ایک اور جامعی دوست اشرف کے ساتھ لندن میں ایک فلم دیکھنے گئے۔ فلم کی کہانی میں ایک عرب کردار کو ابھارا گیا تھا۔ مولانا اپنے پرانے انداز میں جبہ و عبا سے آراستہ تھے فلم میں وقفہ کے دوران جب وہ ہلکے ناشتہ کے لیے باہر نکلے تو چند شوخ نوخیز دوشیزاؤں نے مولانا کو کسی عرب ملک کا شیخ سمجھ کر ان کا محاصرہ کر لیا اور ان پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ مولانا ان سے زندہ دلی کے ساتھ گفتگو میں مگن ہو گئے۔ وہ ان سے نہایت بے تکلفی کے ساتھ لندن کی مقامی زبان میں بات کر رہے تھے جو انھوں نے یہ زبان اپنے آکسفورڈ کے قیام کے دوران شاہی انگریزی کے ساتھ سیکھی ہوگی اس موقع پر مولانا نے اپنے لباس کی سنجیدگی کو پس پشت ڈال کر ان چہکتی ہوئی لڑکیوں سے ایک نوجوان کی طرح بے تکلفی سے گفتگو کی یہ قصہ ان کے کامریڈ کے بعد کے دور کا ہے جب وہ لندن آرام اور علاج کی خاطر گئے تھے ان کی عظیم شخصیت انھیں ایک مکمل انسان بنے رہنے کی راہ میں کبھی مانع نہیں ہوئی۔

ان کی شخصیت کا اتنا ہی دلچسپ پہلو ایک اور ہے ایک بگڑے ہوئے بچے کی طرح وہ اپنے کھانے پر کسی قسم کی پابندی برداشت نہیں کر سکتے تھے وہ ذیابیطس کے مریض تھے اور ان کے خون میں شکر کی مقدار خطرے کے نشان تک پہنچ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے انھیں میٹھی چیزیں کھانے سے سختی کے ساتھ منع کر رکھا تھا۔ لیکن اشرف کو جو لندن میں ان کے میزبان تھے ان کے بستر کے نیچے چاکلیٹ کے ٹکڑے ملے جو مولانا چپکے چپکے کھاتے تھے غالباً مولانا کا خیال تھا کہ کسی خواہش کو زیر کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے پورا کر دیا جائے۔

مولانا محمد علی بہت خوش خوراک تھے اور لذیذ کھانے ان کی بڑی کمزوری، چنانچہ ڈاکٹروں کو کبھی یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ ان کی بتائی ہوئی خوراک کی ہدایات پر عمل ہوگا۔ بیماری کا شدید حملہ بھی ان کو

کھانے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ ذیابیطس کے مریض تھے لیکن ان کے دسترخوان پر کسی پابندی کی تلاش لاحاصل تھی۔ انھیں ورزش سے بھی نفرت تھی۔

کھانے کے معاملے میں مستقل بد احتیاطی کے ساتھ ساتھ وہ کام کرنے کے طریقے میں بھی بہت بد احتیاط تھے۔ خود اپنے لیے وہ ایک سخت گیر انسان تھے اور بغیر بیچ میں آرام کیے ہوئے کام کرتے تھے۔ بذات خود یہ کوئی بری بات نہیں تھی جتنا پریشان کن ان کا کام کرنے کا انداز تھا جو ادارہ کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہو رہا تھا۔ شروع میں انھوں نے کام کو نہایت نظم و ضبط کے ساتھ کیا چنانچہ ایک مختصر وقفہ میں کام ریڈ خود کفیل ہو گیا۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد ہی مدیر کی ذمہ داریوں کو وہ اپنی متلون مزاجی کے ساتھ ادا کرنے لگے۔ ان کے مزاج کا اثر سب سے زیادہ ان کے انگریزی ہفتہ وار پر پڑا جسے وہ تن تنہا چلا رہے تھے۔ اپنے اردو روزنامے سمدرد کے لیے بھی وہ کبھی کبھار اداریہ لکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن وہ ان کی مستقل اور مکمل توجہ کا محتاج نہیں تھا کیونکہ اس کا مدیر ایک لائق شخص تھا اور اس کا ادارتی عملہ بھی لائق اشخاص پر مشتمل تھا۔ اس میں ہمارے دوست جعفری صاحب بھی شریک تھے جو جامعہ کے ہونہار گریجویٹ تھے۔

مولانا کے دفتر میں ایک کلیدی عہدہ پر ایک دوسرے جامعی متمکن تھے۔ یہ پارسی تھے اور ان کا نام ماسٹر تھا۔ وہ کامریڈ پریس کے منیجر کے عہدہ پر فائز تھے یہ صاحب مولانا کی خوش دوقی سے پوری طرح واقف تھے اور اسی نگرانی میں عمدہ کاغذ اور چھپائی کا بندوبست کر دیتے تھے۔ لیکن مولانا کی لاابالی کا جو دباؤ پریس پر پڑ رہا تھا اس کی وجہ سے پریس کو قابو میں رکھنا مشکل اور اخراجات کو پہلے سے متعین کردہ حدود میں رکھنا ناممکن تھا۔ دن میں مولانا اکثر غیر ادارتی ذمہ داریوں میں الجھے رہتے تھے کانفرنس میں شریک ہوتے، جلسوں میں تقریریں کرتے اور ملک کے مختلف مقامات کے دورے کرتے تھے یہاں مجھے ان کا لیجسلیٹیو اسمبلی جانے کا مشہور واقعہ یاد آتا ہے۔ وہ لوچیمبر کے بہترین حامیوں میں شمار ہوتے تھے چنانچہ اسمبلی کے اسپیکر وٹھل بھائی پٹیل نے جو اس دور کے کانگریس کے چیمبر نز گروہ میں ممتاز شخص تصور کیے جاتے تھے، اسمبلی کی کارروائی شروع ہونے سے ذرا پہلے جب مولانا کو اوپر ممتاز سامعین کی گیلری میں فروکش دیکھا تو انھیں مولانا کو چھیڑنے کا خیال آیا۔ وہ تیز آواز میں تاکہ صاف سنائی دے بولے "آپ جبکہ آپ یہاں تک آ گئے ہیں کیوں نہ اتر کر ہمارے ساتھ شریک ہو جائیے"۔ مولانا نے برجستہ جواب دیا "میں یہاں سے تمہاری پستی کا مشاہدہ کر رہا ہوں" اور فوراً پہلی منزل سے ان کی طنزیہ مسکراہٹ چمک اٹھی۔

مولانا کا دن کا وقت باہر کی مصروفیتوں کی نذر ہوتا۔ اور وقت کی کمی کو پورا کرنے کے لیے وہ کامریڈ کے پریس کے اسٹاف کو رات میں بلاتے۔ اس وقت وہ چھت پر دری بچھا کر لیٹ جاتے اور انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ صفحہ پر صفحہ لکھ لکھ کر کمپوزنگ کے کمرے میں بھیجے جاتے تھے۔ نتیجہ میں پروف کی کاپیوں میں کافی ردوبدل بھی جاتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ پریس میں اجالا ہونے تک بجلی جلتی رہتی کمپوزیٹروں اور مشین چلانے والوں کو مقررہ تنخواہ ان کے معین اوقات میں کام کرنے کے لیے دی جاتی تھی لیکن اس وقت وہ لوگ بیٹھ کر گوشت کھیر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انھیں زائد اوقات میں کام کرنے کا معقول معاوضہ ملتا تھا۔ میرا دفتر میں دو گھنٹے اوقات میں کام کرنے کا کامریڈ کے تحت کوئی بار نہیں تھا۔ سخت حالات میری تربیت کا وسیلہ تھے اور میں مستقبل کے پیش نظر آنے والا سرمایہ لگا رہا تھا جس کی بدولت مجھے بعد کی زندگی میں بڑا منافع ہوا۔

ابتدائی دنوں میں میرا خاص کام پروف پڑھنا تھا۔ میں کاغذ کے بڑے بڑے سٹرلوں سے پریس ہال میں بستر بنا کر اس پر لیٹ جاتا تھا۔ پروف دیکھنے کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے موقع ملتے ہی میں سو بھی لیتا تھا کیونکہ دن میں بھی ڈیوٹی پر میری حاضری ضروری تھی۔ آج کل کے حوصلہ مند صحافیوں کے لیے یہ طریقہ کار بے سود معلوم ہوگا۔ لیکن میں مولانا کی ماہرانہ نگرانی میں گرامر، اوقاف اور محاوروں کے بہت سے لطیف نکتے سمجھ لیتا تھا۔ کبھی کبھی یہ دیکھنے کے لیے کہ میرے ایڈیٹوریل نوٹ چھپنے کے لائق ہیں یا نہیں میں انھیں لکھ کر دیتا تھا۔ کبھی نوٹ ردی کی ٹوکری میں ملتے تھے لیکن پھینکنے سے پہلے وہ بڑی شفقت کے ساتھ مجھے طلب فرماتے "اور کیا اور کیوں کر لکھا جائے" کے بارے میں مفید ہدایات دیتے تھے۔ اور آخر میں جب کبھی میں ایسا کوئی نوٹ کامریڈ میں چھپا ہوا دیکھتا تو خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ بے شک میرے نوٹ میں کچھ ترمیم و تنسیخ ہوتی تھی۔ کامریڈ پر مولانا کی شخصیت کی گہری چھاپ تھی۔ ان لوگوں کے نزدیک بھی جو انگریزی محاورات اور صرف و نحو کے ماہر تھے، مولانا کے انگریزی مضامین ادب پاروں میں شمار ہوتے تھے۔ یہاں پر یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ایک بار میں نے ایک نظم قومیت کے جذبات سے سرشار ایسی ایک انگریزی کی نظم دی اور اس پر ان کی رائے مانگی۔ ان کا ردعمل فوری لیکن مشفقانہ تھا۔ انھوں نے کچھ اس طرح کی بات کہی۔ "خدا کے لیے نظمیں نہ لکھو اور اگر لکھنا ہی ہے تو اپنی مادری زبان میں لکھو۔" مولانا کا خیال تھا کہ انگریزی نثر پر ہی ملکہ حاصل کر لینا کافی ہے اپنی صحافت کی زندگی کے ابتدائی دور میں جب کہ میرے دماغ میں اثر پذیری کی صلاحیت موجود تھی انگریزی زبان کے ماہر اور اردو کے مشہور شاعر کی جانب سے اس صلاح کا قدرتاً مجھ پر گہرا اثر پڑا۔ مولانا کے اشعار جنہیں وہ

جوہر کے تخلص سے لکھا کرتے تھے ادیبوں کے حلقے سے خراج تحسین حاصل کر چکے تھے۔

مولانا کے تھکا دینے والے طریقۂ کار کے دور سے گزرنا میرے لیے بہت مفید تھا۔ زندگی کے سنگلاخ اور لمبے عرصے کے کام کی مناسبت اور قوت برداشت کے امتحان کے ذریعہ میں بنایا جا رہا تھا۔ لیکن سولہ سولہ اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے ڈیوٹی پر رہنا کوئی مذاق نہ تھا اور پھر جب یہ ڈیوٹی قلم گھسیٹنے کی ہو۔ اس کا سب سے معروف رسائی پہلو یہ تھا کہ مولانا کی صحت اور کامریڈ کا مستقبل دونوں غلط اوقات کار اور بے ضابطگی کی وجہ سے خطرے میں پڑتے جا رہے تھے۔ بلاشبہ کامریڈ کا حلقہ وسیع تھا اور سیاسی رجحانات رکھنے والوں میں مولانا کے شائقین کی تعداد بہت وسیع تھی۔ جذباتی عدم توازن کے باوجود علمی حلقوں میں لوگ ان کے معترف تھے اور ادب کے رسیا انھیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن یہ سب باتیں کامریڈ کی زندگی کا ذمہ کیوں کر لے سکتی تھیں جب کہ اس کی اشاعت میں پابندی کا فقدان تھا کوئی دل جو پابندی سے حرکت نہ کرتا ہو کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔

آخرکار اشاعت کی بے ضابطگی اب اتنی باضابطہ ہو گئی کہ ہفتہ وار کامریڈ پندرہ روزہ ہوا پھر ماہانہ اور آخر میں غالباً سہ ماہی۔ مولانا نے ان افسوس ناک حالات کے لیے قارئین سے معذرت کرتے ہوئے لکھا کہ وہ پابندی اوقات پر قادر نہیں ہیں کیونکہ "انھیں صرف تاریخ نگاری ہی نہیں تاریخ سازی بھی کرنی ہے۔" دراصل ان کے لکھنے کا یہ بے مثال انداز تھا۔ بعد میں جب حالات اور زیادہ خراب ہوئے تو انھوں نے اخبار میں ایک طویل مضمون لکھا جس میں اپنی خرابی صحت کو اشاعت میں بے قاعدگی کا اصل ذمہ دار ٹھہرایا اور قارئین کو یقین دہانی کے لیے انھوں نے اپنے خون اور پیشاب کی ڈاکٹری رپورٹ کے تفصیلی نتائج بھی چھاپ دیے۔

کام کرنے کے طریقہ کی بے قاعدگی اور بے ضابطگی سے جب مجھ سے مضبوط کاٹھی کے آدمی کی جو ابھی اپنی جوانی کے ابتدائی دور میں تھا صحت متاثر ہو رہی تھی تو مولانا کی صحت کا بتدریج گرتے جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ لیکن مولانا نے میرے چہرے پر بیماری اور تھکاوٹ کے آثار جلدی ہی دیکھ لیے۔ وہ ایک اتنی عظیم شخصیت تھے کہ انھوں نے فوراً مجھے انگریزی طریقہ علاج کے مشہور معالج ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور پھر طب یونانی کے عظیم طبیب حکیم اجمل خاں کے پاس اعلیٰ طبی معائنہ اور علاج کے لیے بھیجا۔ مجھے ان لوگوں کے علاج سے خاطر خواہ فائدہ ہوا لیکن مولانا مطمئن نہیں تھے انھوں نے مجھے کسی پہاڑی مقام

پر جاکر آرام کرنے اور صحت بہتر بنانے کا مشورہ دیا۔ ان کی اس محبت اور عالی ظرفی سے میں بہت متاثر ہوا۔ رخصت کے ایام میں مجھے ان کا ایک خط ملا جس میں مجھے اپنی صحت کی دیکھ بھال کرنے کی تاکید تھی۔ ایک ایسے شخص کی طرف سے جو اپنی صحت کی جانب سے لاپرواہ ہو یہ ہدایت بڑی پراثر تھی۔ خط میں ماسٹر کے چھوڑ کر چلے جانے کی بھی اطلاع تھی۔ مولانا نے لکھا تھا کہ "خس کم جہاں پاک" لیکن میرے لیے یہ بات کامریڈ کے وسائل کے مسلسل گھٹتے رہنے کی وجہ سے پیدا شدہ مخدوش حالات کی جانب اشارہ تھی۔ شروع میں مولانا نے اپنے ساتھ جامعہ سے اپسن (Upson) کو بھی لانا چاہا تھا تاکہ وہ کامریڈ میں مولانا کی نیابت کر سکیں۔ اپسن جو ادھیڑ عمر کے تھے بڑے لائق صحافی تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ آجاتے تو مولانا کے ایڈیٹوریل بوجھ کو بڑی حد تک ہلکا کر دیتے اور کامریڈ کی اشاعت میں پابندی بھی پیدا کر دیتے۔ لیکن میں اب جب ان واقعات پر غور کر رہا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اپسن نہیں آئے تو اچھا ہی ہوا۔ وہ مولانا کے لیے بہت مہنگے ثابت ہوتے اور مولانا یہ سوچ کر اپنی زندگی اجیرن کر لیتے کہ اس سے نجات کیونکر ہو۔

کسی کو نوکری سے نکال دینا مولانا کے لیے بڑا مشکل کام تھا۔ اپنی صحت کی بازیابی کے بعد واپس آنے پر میں نے دیکھا کہ حالات بد سے بدتر ہو چکے تھے۔ انتظامی ڈھانچے میں بڑی دراڑ اور وسیع ہو چکی تھی۔ مولانا جیسی شخصیت کا سون بھی ہل چکا تھا۔ مولانا پر جو عوامل مضرت رساں اثر ڈال رہے تھے ان میں اندرونی حالات کے دباؤ کے ساتھ ملک میں سیاسی اور سماجی اتھل پتھل کا دباؤ بھی شامل تھا۔ میں مولانا کا بے حد معتقد تھا اور میری ان کے تئیں وفاداری اتنی مستحکم تھی کہ میں کامریڈ کے ساتھ مضبوطی سے چپکا رہا۔ مولانا مستقل طور پر بضد تھے کہ مستقبل کو میں جس طرح سنوارنا چاہتا تھا اس کی راہ میں کامریڈ روکاوٹ نہیں بننا چاہتا اور جیسے ہی مجھے کہیں اور بہتر مواقع حاصل ہوں مجھے ضرور چلا جانا چاہیے آخرکار ۱۹۲۵ء میں میں لاہور میں دیوان چمن لال کے ہفتہ وار اخبار "نیشن" کی ادارت سنبھالنے کے لیے میں نے بے دلی کے ساتھ کامریڈ کو خیرباد کہا۔ میرے لیے یہ علیحدگی زہرناک تھی لیکن مولانا کی دعائیں شریک حال تھیں۔

اب جب کہ میں مولانا کے اس قلمی خاکہ کو آخری شکل دے رہا ہوں مجھے اس کے اطمینان بخش ہونے پر شبہ ہے۔ مولانا کی شخصیت اتنی گوناگوں اور تابناک تھی کہ اس کے مختلف پہلوؤں کا سچا اور صحیح خاکہ بنانا صرف ایک بڑے فنکار کے بس کی بات ہے۔ کامریڈ سے میرے علیحدہ ہونے سے پہلے ہی سے ہندوستان کے سیاسی افق پر بڑی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا یہ افراتفری اور پیچیدہ ہوتی گئی۔

سوراج پارٹی کے ممبروں اور کٹر کانگریسیوں کی باہمی آویزش اکثر خطرناک روپ اختیار کر لیتی تھی۔ اس کے علاوہ کانگریس میں ایک کٹر دقیانوسی عنصر تھا جس کے لیڈر مدن موہن مالویہ تھے۔ یہ لوگ سوراج پارٹی کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے اور ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ مولانا کی کانگریس سے ناراضگی تو اسی وقت سے شروع ہو چکی تھی جب وہ اس کے باقاعدہ ممبر تھے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے خلافت کو ختم کر کے خلافت تحریک کے بادبانوں سے ہوا پہلے ہی نکال دی تھی۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے پوری دنیائے اسلام کے ہیرو کی حیثیت سے منظر عام پر آ گئے تھے۔ مسلمانوں کے لیے ان کے الفاظ قانون کی حیثیت رکھتے تھے اور کوئی مسلمان ان کی مخالفت میں آواز نہیں اٹھا سکتا تھا۔

خلافت تحریک کے مردہ ہو جانے سے ہندو مسلم اتحاد کا سب سے مضبوط عنصر ختم ہو گیا۔ عام مسلمانوں کا کانگریس کی حمایت میں جوش و خروش اپنے عروج پر پہنچ کر نفی میں بدل گیا۔ نیشنلسٹ مسلمانوں میں اختلافات رونما ہو گئے۔ جس کی ایک علامت احرار تحریک تھی۔ لیکن اس سے زیادہ اہل علامت یہ بات ہوئی کہ رجعت پسندی جو سرد پڑ چکی تھی بہت جلد دوبارہ نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی کی لہر خطرناک انداز میں ابھری اور تفرقہ بندی کے رجحانات قومی تحریک کی تمام بنیادی کامیابیوں کے لیے سنگین خطرہ بن گئے۔ شدھی اور تبلیغ کی مضرت رساں تحریکوں کے باعث جو جنونی انداز پھیل رہی تھیں ہندو و مسلمان دونوں کے لیے وہ پیالہ جس میں انھوں نے اتحاد کے سنہرے دور میں مل کر پی لیا تھا، زہر ہلاہل سے بھرا ہوا پیالہ بن گیا۔ وہی سوامی شردھانند جنھوں نے ایک زمانے میں علما کی دعوت پر جامع مسجد کے منبر سے مسلمانوں کے ایک بڑے جلسے کو خطاب کیا تھا ایک جنونی کے ہاتھوں اپنے گھر پر قتل کر دیے گئے۔ حالات کی کیا ستم ظریفی تھی کہ مولانا محمد علی قاتل کی مدافعت میں شریک ہوئے۔ نتیجہ میں نیشنلسٹ ہندو حلقوں میں بھی ان کے خلاف غصہ کے جذبات پیدا ہوئے۔ یہ بات میرے لیے باعث رنج ہے کہ حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ زندگی میں پہلی بار مجھے کسی ارتکاب جرم کے بغیر مولانا کے غصہ کا ہدف بننا پڑا۔

یہ بات اوپر آ چکی ہے کہ راجا جنگ بہادر صاحب نے کامریڈ سے الگ ہو کر لاہور کے ہفتہ وار نیشن کی ایڈیٹری سنبھال لی تھی۔ یہ دیوان نیس مل کا اخبار تھا۔ اس میں ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا ("The Maulana Shows His Teeth") مولانا محمد علی نے

اس تعلق خاطر کی بنا پر جو انھیں رانا صاحب سے تھا، فوراً ایک خط لکھا اور ان سے جواب طلب کیا۔ مولانا کو صحافت کی اخلاقیات کا پورا احترام تھا، اس لیے انھوں نے یہ نہیں پوچھا کہ مضمون نگار کون تھا۔ صرف یہ کہا کہ رانا صاحب ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری سے گریز نہیں کر سکتے تھے۔ رانا صاحب نے مضمون نگار کا نام نہیں بتایا اور اپنے جواب میں اسے تسلیم کرتے ہوئے کہ "جنس" میں جو کچھ چھپا ہے اس کے وہی ذمہ دار ہیں، انھوں نے تمام آداب و احترام کو ملحوظ رکھا۔ (انھوں نے افسوس کیا ہے کہ اس خط کی نقل ان کے پاس نہیں ہے۔)

مضمون دیوان چمن لال کا لکھا ہوا تھا جو موتی لال نہرو کے بڑے زبردست حامی تھے۔ اب جب کہ مولانا اور دیوان صاحب اس دنیا میں نہیں رہے، رانا صاحب نے اس راز کو افشا کرنا نامناسب نہیں سمجھا ہے۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اگر وہ اس وقت قدرے پختہ کار اور ہوشیار ہوتے تو مضمون کا عنوان بدل دیتے اور اس طرح وہ ڈنک باقی نہ رہتا جس سے مولانا کو تکلیف پہنچی۔ ان کا خیال ہے کہ دیوان چمن لال بھی تبدیلی عنوان کے لیے تیار ہو جاتے۔

رانا صاحب نے اپنی صفائی میں جو کچھ جواب تحریر کیا تھا اس سے مولانا محمد علی کے مجروح دل کو تسکین نہ ملی۔ اس کے جواب میں مولانا نے انھیں اپنے بستر علالت سے، غصہ سے بھرا ایک طویل خط لکھا، رانا صاحب نے پھر اس کا جواب بھیجا۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ مولانا نے رانا صاحب کے دلائل کو کتنا درخور اعتنا سمجھا، مولانا کے لیے ان کے دل میں محبت اور احترام کا جو جذبہ تھا (بقول ان کے) اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ رانا صاحب نے لکھا ہے کہ قسمت نے اس قد آور شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ طوفان خیز سیاست کے ہچکولوں میں ان کی کشتی لنگرگاہ سے دور جا پڑی، لیکن یہ مولانا کی بڑائی تھی کہ اگرچہ وہ کانگریس کی طرف سے بدظن ہو گئے تھے، گاندھی جی سے ان کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا اور مسلم لیگ کے قریب بھی وہ نہیں پھٹکے۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں حب الوطنی کے جذبہ سے معمور ان کی تقریر درحقیقت عالم نزع کا نغمہ تھا۔ اپنے وطن سے دور بیت المقدس میں

ایک ٹوٹے ہوئے دل کی آخری دھڑکن ملک کے سیاسی پس منظر کو سامنے رکھئے تو کہہ سکتے ہیں کہ [illegible] ایک ایسے ریگستان میں واقع ہوئی جہاں ان کے لیے کوئی چھوٹا سا نخلستان بھی نہیں تھا۔

رانا صاحب کا خیال ہے کہ مولانا کی سیاسی زندگی کا المیہ ان کی گہری جذباتیت تھی ان کے لیے تو یہ ناگزیر تھی، لیکن اکثر اس کی وجہ سے ان کی رائے میں توازن باقی نہیں رہتا تھا۔ جذباتیت انہیں ایک مخصوص سمت میں ڈھکیل لے جاتی تھی۔ اسی کے سبب ایک خاص وقت میں مولانا کا یہ رجحان بھی ہو جاتا تھا کہ وہ دوسری حقیقتوں کی طرف سے منہ موڑ کر کسی ایک ہی حد سے بامقصد کے ساتھ اپنے پورے وجود کو وابستہ کر لیتے تھے۔ اسی وجہ سے کبھی کبھی لوگوں کو ان کی نیت سے متعلق غلط فہمی پیدا ہو جاتی تھی۔ بسا اوقات ان کی پرجوش فکر انہیں اغوا کر لیتی تھی اور ان کی سیاسی و سماجی ذمہ داریوں اور اس عالم میں ان کی سرگرمیوں کے مابین کوئی مطابقت نہیں رہ پاتی تھی ــــ اس لیے دوسری ایسی شخصیتوں کی طرح جو درد و الم سے معمور ہوں، مولانا کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے وقت لوگوں میں محبت و ہمدردی کا جذبہ ہونا چاہیے اور ان کو سمجھنے میں اسی جذبہ سے کام لینا چاہیے اور اس بات کو ہرگز نظرانداز نہ کرنا چاہیے کہ ایسے کڑے وقت میں جب کہ کسی میں برطانوی سامراج کی عظیم قوت کو کھلم کھلا للکارنے کی ہمت نہ ہوئی اور جب کہ ابھی قومی تحریک اپنی ابتدائی منزلوں میں تھی، اس دلکش اور حسین شخصیت کی خدمات اور قربانیاں کیسی عظیم اور کتنی بے پناہ تھیں۔

رانا صاحب کے نام مولانا محمد علی کے طویل خط کا ترجمہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، طوالت کے خیال سے یہاں نہیں دیا جا رہا ہے۔ قارئین جامعہ میں سے جو اسے پڑھنا چاہتے ہوں وہ (Mainstream) کی ۲۷ نومبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں اسے دیکھ سکتے ہیں۔ اس خط میں رانا صاحب سے شکایت ہے ان فرقہ پرست اخباروں کی جو سوامی شردھانند کے قتل کے سلسلے میں مولانا پر تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا الزام لگا رہے تھے۔ مولانا نے سوامی جی کے قتل پر نفرت کا اظہار کیا تھا اور قاتل کے فعل کو غیر اسلامی فعل بتایا تھا۔ انھوں نے یہ سب لکھ کر رانا صاحب سے شکوہ کیا ہے کہ وہ تو مولانا کو سمجھتے تھے۔ رانا صاحب کی خواہش

تھی کہ جس طرح حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار انصاری نے اپنے آپ کو اس واقعہ میں الجھنے سے بچا لیا تھا، کاش مولانا بھی اس متنازعہ فیہ واقعہ کی الجھنوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتے۔ ظاہر ہے کہ رانا صاحب کی یہ خواہش اس وجہ سے تھی کہ انہیں مولانا سے حقیقی محبت اور بے پناہ عقیدت تھی۔ موصوف نے راقم الحروف سے بھی گفتگوؤں میں بارہا مولانا سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے، میں نے دیکھا ہے کہ جب وہ مولانا کا ذکر کرتے ہیں تو دورانِ گفتگو ان کی آنکھیں اکثر نم ہو جاتی ہیں۔ ایک انسان کا ایک انسان سے، ایک شاگرد کا اپنے استاد سے، مذہب و ملت کے کسی امتیاز کے بغیر محبت کا یہ رشتہ وہ رشتہ ہے جو اس دور میں بہت ہی کمیاب ہے۔]

(طلوع)

ہندوستان جدید میں جو انگریزی تعلیم اور مغربی خیالات کا مولد ہے، مولانا محمد علی مرحوم "عجیب و غریب" شخص ہوئے ہیں۔ وہ مختلف، متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے، لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے

وہ انگریزی کا بہت بڑا ادیب، زبردست انشا پرداز اور اعلیٰ درجے کا مقرر تھا لیکن جب لکھنے اور بولنے پر آجاتا تو اعتدال اور تناسب دونوں نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے اور انمول جواہر پاروں کے ساتھ کنکر اور روڑے بھی بے تکلف چلے آتے تھے۔ وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا یکا دشمن تھا لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولہ ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ .."

مولوی عبدالحق (چند ہم عصر صفحہ ۱۵۲)

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل

مولانا محمد علی کی سیاسی زندگی

تاریخ میں ایسی شخصیتیں بہت کم گذری ہیں جن کی ذات گوناگوں کمالات اور متعدد صفات کا مجموعہ رہی ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کا شمار ایسے ہی عظیم لوگوں میں ہوتا ہے۔ موصوف ایک اچھے سیاست داں، ماہر نقاد، بہترین صحافی، اعلیٰ درجے کے انشاء پرداز، کامیاب شاعر اور سحر بیاں مقرر تھے۔ رشید احمد صدیقی کے بیان کے مطابق (جب وہ) "بولتے تو معلوم ہوتا ابوالہول کی آواز اہرام مصری سے ٹکرا رہی ہے۔ لکھتے تو معلوم ہوتا کرپ کے کارخانے میں توپیں ڈھل رہی ہیں یا میر شاہ جہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔" ان کی موت پر ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا ہے اس سے ان کی شخصیت کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا۔ اس کی زبان برک کی زبان تھی اور اس کا قلم میکالے کا قلم تھا"

ان کے اوصاف و کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے جب مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار عاجز آگئے تو بے ساختہ یہ کہہ کر اپنا قلم روک لیا کہ،

میں اس کے حق میں اس کے سوا اور کیا کہوں ہندوستاں میں آپ وہ اپنی مثال تھا

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا محمد علی جوہر نہایت دلیر، بے باک اور حریت پسند انسان تھے، وہ حق بات کا بلا خوف و خطر اعلان کرتے تھے، انھیں ملت اسلامیہ سے بے حد عشق تھا، وہ اسلام کے سچے عاشق اور جاں باز سپاہی تھے۔ انھوں نے اس کی خدمت کے لیے اپنی تمام زندگی وقف کردی تھی، وہ مسلمانوں کو مصیبت زدہ پاکر بے قرار ہو جاتے تھے اور ظلم کے ہر وار کے مقابل اپنے سینے کو سپر کے طور پر

پیش کر دیتے تھے۔ انھوں نے آزادی کی لڑائی لڑتے لڑتے میدانِ جنگ ہی میں اپنی جان دے دی اور پوری زندگی ایک بہادر سپاہی کی طرح انگریزوں سے مقابلہ کرتے رہے۔ آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے وہ جیل گئے، اور حکومت کی سختیاں برداشت کیں۔ انھوں نے دشمنی مول لی مگر غیروں کی غلامی میں رہنا گوارہ نہیں کیا۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ غلامی کو لعنت سمجھتے تھے چنانچہ کہتے ہیں :

"اسلام کے مطابق انسان صرف اللہ کی غلامی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ انسان ایک دوسرے کے غلام نہیں ہو سکتے۔ خدا وحدہٗ لاشریک کی غلامی نے ہر قسم کی قید و بند سے آزاد کر دیا ہے۔"

وہ ہمیشہ اسی اصول پر جنگِ آزادی لڑتے رہے اور کسی بھی وقت اپنے قدم کو پیچھے نہیں ہٹایا۔ اسی طرح وہ ملوکیت کے بھی شدید مخالف تھے۔ گول میز کانفرنس میں اپنی تقریر کے دوران صدرِ جلسہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :

"میں طبعاً اور عقیدۃً جمہوریت پسند واقع ہوا ہوں میرے یہاں خانۂ تصورات میں شاہوں اور شہزادوں کا وجود نہیں ہے۔"

یہی وجہ تھی کہ وہ وطن کی کامل آزادی کے لیے ہمیشہ جدوجہد کرتے رہے اور اپنی تمام زندگی اسی مقصد کو حاصل کرنے میں گزار دی۔ گول میز کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ۔

"میں آپ سے مستعمراتی حکومت مانگنے نہیں آیا ہوں اور نہ میں اس کے حصول پر یقین رکھتا ہوں۔ صرف ایک چیز ہے جس کا میں عہد کر چکا ہوں اور وہ کامل آزادی ہے۔"

ہندوستان مختلف اکائیوں، تہذیبوں اور مذہبوں کا سنگم ہے یہاں دو ملتوں کے درمیان تصادم ایک معمولی سی بات ہے۔ مولانا کی دوررس نگاہوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر آزادی کو حاصل کرنا ناممکن ہے چنانچہ انھوں نے دونوں قوموں کے درمیان تعصب و نفرت کی خلیج کو پاٹنے کی بھرپور کوششیں کیں اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں لوگوں کو اتحاد و اتفاق کا درس دیا ان کا قول تھا :

"سب جانتے ہیں کہ میں اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھتا ہوں اور ہمارا مذہب بھی ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے"

دوسری جگہ کہتے ہیں :

"دوستو! میری دعا ہے کہ خدا ہندو مسلمانوں کو اپنے اتحاد و اتفاق کی ایک جھلک پھر نصیب کرے۔
میری دعا ہے کہ دونوں قومیں اتحاد کی وہ تصویر اور آزادی کا وہ منظر سامنے رکھیں جو اتحادِ قومی کی
فضا میں رکھ سکتے ہیں"

ان الفاظ میں کتنی حسرت، تڑپ اور درد ہے کاش! مولانا کی یہ آرزو پوری ہو جاتی تو ہندوستان
امن و آشتی کا گہوارہ بن جاتا:

"اے اتحاد تو ضرور آئے گا، آدمیوں کو باہم ملا دے گا اور قوموں کو متحد کر دے گا۔ لیکن
ہمارے سامنے نہیں جو تیرے انتظار کی تکلیف اٹھا رہے ہیں تو آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ لیکن
کب، ایک عرصے کی مصیبتوں، صبر آزما التواؤں، تکلیف و انتظار اور ہمت شکن انکار کے بعد"

غرض کہ ان کی تمام زندگی اسلام کی خدمت، آزادیٔ وطن کے حصول اور ملک میں اتحاد و اتفاق کی فضا قائم
کرنے میں گزری اور اسی جد و جہد میں انھوں نے اپنی جان جانِ آفریں کو سپرد کر دی۔ کیا خوب کہا ہے
شاعر حکیمی نے:

سلام ایسے مجاہد، نیک سیرت، پاک طینت پر
جو اپنی جان تک قربان کر دے ملک و ملت پر

انھیں طالب علمی کے زمانے ہی سے مضمون نگاری کا شوق تھا اس لیے ادب و شاعری پر اکثر
مضامین لکھا کرتے تھے جب شعور اور زیادہ پختہ ہوا تو غلامی کی لعنت ان کے لیے صدمات کا باعث
بن گئی اور ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ لہٰذا خالص سیاسی عنوان پر
مضامین لکھنا شروع کیا جو "ٹائمز آف انڈیا" میں شائع ہوئے ہیں۔ اس سے حکومت کو تشویش ہونے
لگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ ریاست بڑودہ کی ملازمت میں تھے۔ ریاست کی کونسل نے کوشش کی
کہ وہ اس قسم کے مضامین نہ لکھیں جس سے متاثر ہو کر انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ جب بیگم بھوپال
اور نواب جاورہ کو ان کے استعفے کی خبر ملی تو ان ریاستوں نے چیف سکریٹری اور وزارت کے عہدے
پیش کیے مگر انھوں نے ان عہدوں کو قبول نہیں کیا اور کلکتہ سے جنوری ۱۹۱۱ء میں انگریزی اخبار کامریڈ
جاری کیا یہیں سے ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ آتا ہے اور وہ سیاست کے میدان میں قدم رکھتے
ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں جب دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا تو کامریڈ بھی دہلی منتقل کر دیا گیا۔

۲۳؍فروری ۱۹۱۳ء کو اخبار ہمدرد بھی جاری کیا گیا۔ ان پرچوں کے ذریعہ سے مولانا نے ہندوستان میں آزادی کا علم بلند کیا۔ دراصل ان کا وجود صحافت کی تاریخ میں ایک عظیم الشان انقلاب کی حیثیت رکھتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جنگ بلقان عروج پر تھی اور مولانا کی توجہ اور مصروفیت کا مرکز تھی۔ اس سلسلے میں نہ صرف مضامین لکھے بلکہ ترکوں کی امداد کے لیے ہمدرد اور کامریڈ میں اپیل بھی شائع کی اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں زخمیوں کے علاج کے لیے ایک طبی وفد بھیجا۔ اسی زمانے میں ۳؍اگست ۱۹۱۳ء کو کانپور مچھلی بازار کی مسجد کا خونی حادثہ پیش آیا۔ مولانا اس واقعے سے تڑپ اٹھے۔ اور سر جیمس مسٹن گورنر صوبہ متحدہ سے خط و کتابت کی۔ جب کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو وزیر حسن کے ہمراہ انگلستان روانہ ہو گئے اور انہدام مسجد کے متعلق وزیر ہند اور ارکان کابینہ سے گفتگو کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سر جیمس لاؤتھ رکن مجلس وزیر ہند نے لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کو فوراً ہدایت کی کہ مسجد کے منہدم حصوں کو دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی جائے اور تمام مقدمات واپس لے لیے جائیں۔ اس کامیابی کے بعد مولانا محمد علی کو مسلمانوں میں بے انتہا مقبولیت حاصل ہو گئی اور جب دسمبر کے آخر میں وہ ہندوستان واپس آئے لوگوں کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔

ابھی جنگ بلقان کا سلسلہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اگست ۱۹۱۴ء کی ابتدا میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی جس میں ترکی نے اتحادیوں کے بالمقابل جرمنی کا ساتھ دیا۔ اس پر انگلستان کے چند اخباروں نے ترکوں کو مشورہ دیا کہ وہ اتحادیوں کا ساتھ دیں۔ لندن کے مشہور اخبار "ٹائمز" کا بھی یہی مشورہ تھا۔ مولانا محمد علی اسے ترکوں کے مفاد کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے ۴۰ گھنٹوں کی مسلسل محنت سے کامریڈ کے لیے "چوائس آف دی ترک" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو ۲۶؍ستمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے حکومت برطانیہ پر سخت تنقید کی تھی جس کو وہ برداشت نہ کر سکی اور کامریڈ اور ہمدرد کی ضمانت ضبط کر لی۔ اس واقعہ کے کچھ عرصے کے بعد ۱۵؍مئی ۱۹۱۵ء کو مولانا کو دہلی کے قریب مہرولی میں نظربند کر دیا گیا۔ وہاں سے لینسڈاؤن، پھر چھندواڑہ اور آخر میں بیتول منتقل کیے گئے۔ تقریباً پانچ سال کی نظربندی کے بعد ۲۸؍دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہوئے۔ رہائی کے فوراً بعد ۲۹؍دسمبر کو سیدھے امرتسر پہنچے جہاں کانگریس کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے اجلاس بھی ہو رہے تھے۔ امرتسر میں ہندو اور مسلمانوں نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور پنڈت مدن موہن مالوی نے انھیں کانگریس کا ڈیلیگیٹ بنایا۔ یہی وہ دور تھا جبکہ

ہفتہ وار کامریڈ کے پہلے شمارے کا ٹائٹل (ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۱۸۵)

The Comrade.

A Weekly Journal. Edited by - Mohamed Ali.

Stand upright, speak thy thought declare
The truth thou hast, that all may share
Be bold, proclaim it everywhere
They only live who dare!

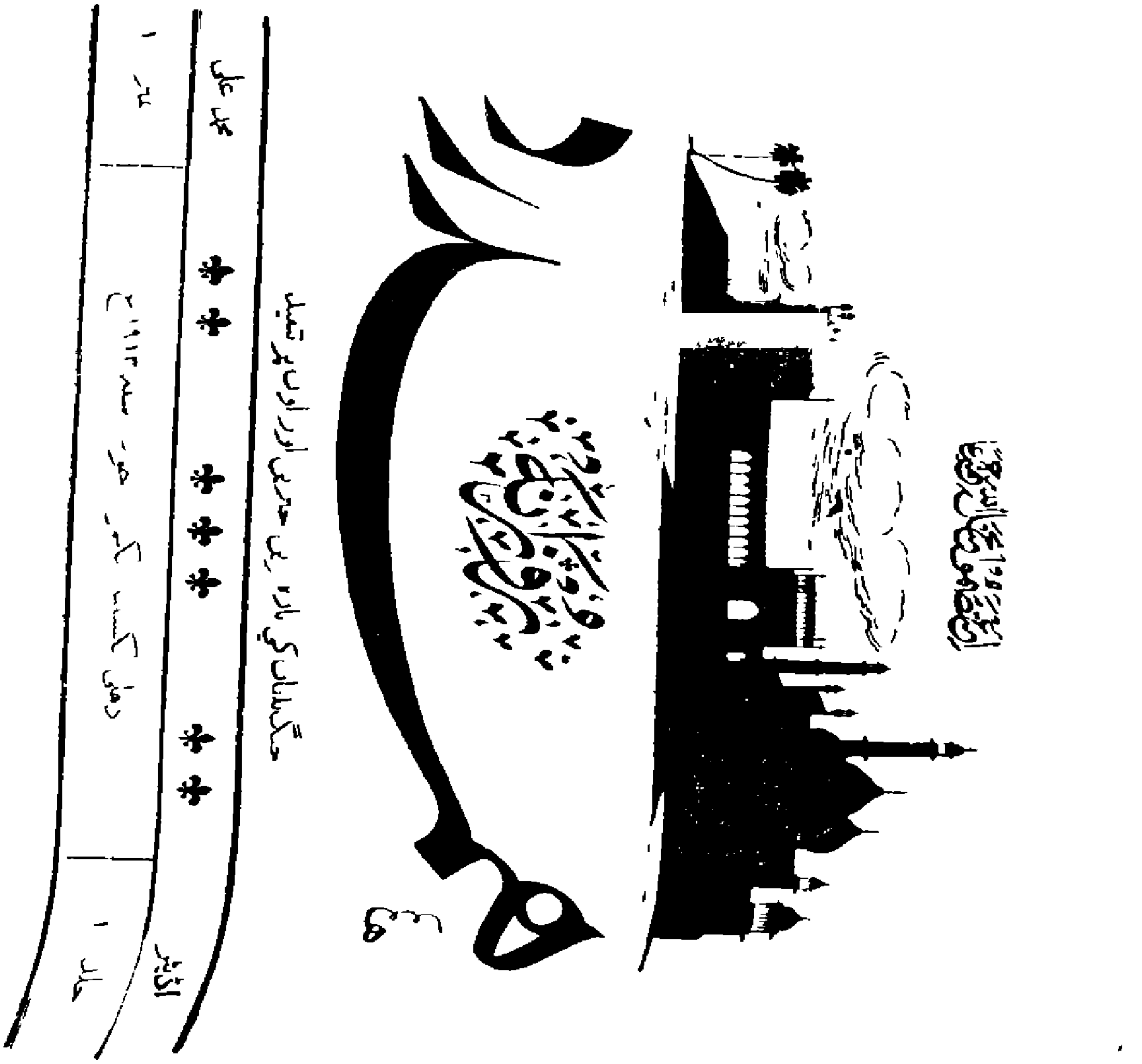
—*Morris*

Vol. I
No 1

Calcutta Saturday, January 14, 1911

Annual Subscription
Indian Rs 12
Foreign £1

روزنامہ ہمدرد کے پہلے شمارے کا ٹائٹل (ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۱۹۰)



جلیانوالہ باغ کے عظیم حادثے کی وجہ سے ہندوستانیوں کے قلوب پاش پاش ہو چکے تھے چنانچہ مولانا محمد علی نے کانگریس کے اجلاس میں ایک پرجوش تقریر کی جس سے لوگوں میں قربانی و سرفروشی کے نئے جذبات پیدا ہوئے۔ انھوں نے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

"میں کہتا ہوں اس آزادی کے لیے مسٹر تلک کو پھر جیل جانا چاہیے، مجھے دوبارہ عمر بھر کے لیے نظربند ہونا چاہیے، مسز بسنت کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہیے۔ مگر اس قسم کے مظالم کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہونا چاہیے جیسے کہ پنجاب میں ہوئے"

اس وقت خلافت کا مسئلہ بھی مسلمانوں کے پیش نظر تھا۔ انگریز خلافت عثمانیہ کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے جس کا ہندوستان کے مسلمانوں پر شدید ردعمل ہوا اور انھوں نے تحفظ خلافت کے لیے ایک خلافت کمیٹی قائم کی۔ پہلے اس کمیٹی کے متعدد اجلاس ہو چکے تھے، لیکن جب حکومت برطانیہ خلافت کو موت کی آغوش میں لیے جانے پر آمادہ ہو گئی تو ۲۸ فروری ۱۹۲۰ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں خلافت کمیٹی کا ایک ہنگامی جلسہ ہوا جس میں حکومت کو ترک موالات کی دھمکی دی گئی اور یہ طے پایا کہ صلح کانفرنس (لندن) سے پہلے ہندوستان سے مسلمانوں کا ایک وفد انگلستان جائے اور مسلمانوں کے جذبات سے حکومت کو آگاہ کرے۔ چنانچہ ایک وفد تیار کیا گیا۔ اس وفد کے صدر مولانا محمد علی، سیکرٹری حسن حیات اور مولانا سید سلیمان ندوی، سید حسین اور ابوالقاسم اراکین مقرر ہوئے۔ یہ وفد مارچ ۱۹۲۰ء میں لندن روانہ ہوا تو اسے لوک مانیہ تلک، پنڈت مدن موہن مالوی اور مہاتما گاندھی جیسے عظیم رہنماؤں کی نیک خواہشات بھی حاصل تھیں۔ اس وفد نے حکومت برطانیہ کے تمام ذمہ داروں سے گفتگو کی۔ خصوصاً مولانا محمد علی نے اپنی تقریروں سے انگریزوں کے خوابیدہ ضمیر کو خلافت کے مسئلہ پر بیدار کرنے کی کوشش کی مگر وزیر اعظم لائڈ جارج نے ان کی تمام باتیں رد کر دیں اور ایسا صلح نامہ مرتب کیا جس کی رو سے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی مرکزی حیثیت جاتی رہی۔

اس صلح نامہ کی خبر جب ہندوستان پہنچی تو یہاں کے مسلمانوں میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی، اور انھوں نے حکومت برطانیہ کے خلاف جگہ جگہ مظاہرے شروع کر دیے۔ اس سے ترک موالات کے جذبات کو تقویت ملی۔ مہاتما گاندھی نے ان تحریکات کی پرزور حمایت کی اور ینگ انڈیا میں ان کی تائید میں مضامین لکھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک خلافت اور ترک موالات کی تحریک اور جنگ آزادی نے ایک نیا

رخ اختیار کرلیا۔ جب اکتوبر کی ابتدا میں مولانا محمد علی وفد کے ساتھ ہندوستان واپس آئے تو گاندھی جی نے ان کا ملکی میں پرجوش استقبال کیا۔ خلافت تحریک سے گاندھی جی کی دلچسپی کے پیشِ نظر مولانا نے اس کی باگ ڈور گاندھی جی کے سپرد کردی۔ تحریک خلافت اور ترکِ موالات کی کامیابی سے ہندو مسلم اتحاد کی ایک خوشگوار فضا ہندوستان کے طول و عرض میں قائم ہوگئی۔ مولانا محمد علی نے گاندھی جی کو ساتھ لے کر پورے ملک کا دورہ کیا اور ان کا جگہ جگہ پرجوش استقبال کیا گیا اور "مہاتما گاندھی کی جے ہو" اور "محمد علی کی جے" کے نعرے لگائے گئے۔ ان دونوں کی آواز پر لوگوں نے اپنے خطابات واپس کر دیے، بہت سے لوگوں نے انگریزی حکومت کی ملازمت چھوڑ دی، وکلاء نے وکالت ترک کردی اور بدیسی مال کا کامیاب مقاطعہ کیا گیا۔

اسی ہنگامی دور میں مولانا محمد علی کی صدارت میں ۸ جولائی ۱۹۲۱ء کو لاہور میں خلافت کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی شریک تھے۔ اس اجلاس میں علماء نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں ثابت کیا کہ برطانوی حکومت کی فوج میں ملازمت کرنا بدترین گناہ ہے آخر میں یہ قرارداد جس پر پانچ سو علماء کے دستخط تھے، باتفاق رائے منظور کی گئی:

> "یہ جلسہ اس امر کا صاف اعلان کرتا ہے کہ مذہبی نقطۂ نظر سے بحالت موجودہ ہر مسلمان کے لیے حرام ہے کہ وہ برطانوی فوج کی ملازمت میں رہے یا دوسروں کو فوج میں داخل ہونے کی ترغیب دے اور جملہ مسلمانوں کا عموماً اور علماء کا خصوصاً یہ فرض ہے کہ وہ دیکھیں کہ یہ مذہبی احکام فوج کے ہر مسلمان تک پہنچائے جاتے ہیں۔"

اس تجویز کے منظور ہوتے ہی حکومت میں ایک کھلبلی مچ گئی اور ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی کو والٹیر کے اسٹیشن پر گرفتار کرلیا گیا۔ ان کے ساتھ شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسین احمد، مولوی نثار احمد، پیر غلام مجدد سرہندی اور جگت گرو شری بھارتی کرشن تیرتھ شنکر آچاریہ جی کو بھی گرفتار کیا گیا ان تمام علماء اور رفقاء نے کراچی کانفرنس میں تقریریں کی تھیں۔ ان پر تشدد اور فوج میں بغاوت کرانے کا الزام لگا کر تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۰، ۱۳۱، ۱۰۹، ۵۰۵ اور ۱۱۷ کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمے کی ابتداء ۲۶ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ہوئی اور یکم نومبر کو شنکر آچاریہ جی کو چھوڑ کر باقی سب کو دو دو سال کی سزا سنائی گئی۔ اس مقدمے کے دوران مولانا نے عدالت میں جو بیان دیا تھا وہ سیاسی، ادبی اور

(ز)بی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس بیان سے ایک طرف مولانا کے ذاتی کردار اور شخصیت پر روشنی (پڑ)تی ہے تو دوسری طرف دنیا کی مختلف قوموں اور ملکوں کی سیاسی اور مذہبی تحریکوں کے متعلق معلومات فراہم (ہ)وتی ہیں۔ دراصل یہ بیان مولانا کی جرأت اور دلیری کا زبردست ثبوت ہے۔ ان کی حق گوئی کی جیتی جاگتی (ت)صویر ہے۔ مولانا کی گرفتاری اور سزا کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں جمعیۃ العلماء، کانگریس اور (خ)لافت کمیٹی کے جلسے منعقد کیے گئے جن میں کراچی کے اس ریزولیوشن کو بار بار دہرایا گیا جو مولانا کی صدارت (می)ں منظور کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں کئی نظمیں منظر عام پر آئیں جن میں اگرچہ کوئی شاعرانہ خوبی نہیں تھی، (مگ)ر بے پناہ جذبات کی وجہ سے بچے بچے کی زبان پر تھیں، خاص طور پر:

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی — ہم تو جانے ہیں دو دو برس کو

اور

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(ا)ن نظموں نے لوگوں کے دل و دماغ پر جو تاثرات ڈالے تھے اس کا نقشہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے (بڑ)ے ہی دلچسپ انداز میں کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۹۲۲ء کا ایک منظر۔ شام کا وقت ہے۔ امین آباد لکھنؤ کے چوراہے پر یہی صدائے حقانی دو دو پیسے کو بک رہی ہے۔ خدا جانے کتنی تعداد میں روز نکلتی رہتی ہے۔ لڑکے درد انگیز آواز میں گا گا کر پڑھ رہے ہیں۔ اکثر نواب مرزا شوق کی مثنوی "زہر عشق" کی دھن میں۔ صدہا راہگیر کھڑے سن رہے ہیں۔ پولیس کی لاری آئی، بہتوں کو پکڑ پکڑ کر جیل خانے بھیج دیا۔ دوسرے پہر سے لے کر رات گئے تک یہی تماشا رہتا ہے۔ جیل جانا ایک ہنسی کھیل ہو گیا ہے۔ پہلے جس کے نام سے لوگ تھرّاتے تھے، سہمے جاتے تھے اب خود اس کا جیل نہ جانا مذاق سا معلوم ہونے لگا ہے۔ محمد علی جب کانگریس میں آئے تو قوم کی قوم کو ساتھ لے کر آئے۔ محمد علی جیل گئے تو یہی آگ قوم پر گلزار ہو گئی۔ سیکڑوں نہیں ہزاروں مسلمان اچھے اچھے عالی خاندان و ذی رتبہ گریجویٹ اور وکیل، بیرسٹر، ڈاکٹر، عالم، فاضل ہنسی خوشی خلافت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جیل بھرتے چلے گئے۔"[1]

---

۱ محمد علی — ذاتی ڈائری کے چند ورق حصہ اول (۱۹۵۴ء) صفحہ ۶

مولانا محمد علی اگست ۱۹۲۳ء میں جیل سے رہا ہوئے تو ہندوستان کی سیاسی فضا بالکل بدل چکی تھی انگریزوں نے اپنی حکمت عملی سے ہندو مسلم کے درمیان نفرت کا جو بیج بویا تھا وہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا چنانچہ مولانا نے دونوں فرقوں کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ان حالات میں دسمبر ۱۹۲۳ء میں کوکناڈا میں مولانا محمد علی کی صدارت میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا، جس میں مولانا نے جو خطبۂ صدارت پڑھا اس میں بھی لوگوں کو جذباتی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کا پیغام دیا لیکن فرقہ پرستی کے زہر کے لیے یہ تریاق بھی بے سود ثابت ہوا۔ اس کے بعد مولانا کی ہمت نے ساتھ چھوڑ دیا اور پنڈت جواہر لال نہرو کے بیان کے مطابق[1]:

"اپنے زمانۂ صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگریس سے دور ہونے لگے یا شاید ان کے الفاظ میں کانگریس ان سے دور ہونے لگی۔ یہ صورت بہت آہستہ آہستہ واقع ہوئی۔"

فرقہ وارانہ فسادات میں دن بدن جو اضافے ہو رہے تھے، ان کو دیکھ کر چند صلح پسند رہنماؤں نے دہلی میں یونٹی کانفرنس کا ایک جلسہ طلب کیا تاکہ فسادات کو روکنے کا حل نکالا جا سکے لیکن یہ کانفرنس بھی ناکام رہی۔ اس سے مولانا بہت مایوس ہوئے اور انھوں نے ملک میں اتحاد قائم کرنے کے لیے متعدد شہروں کا دورہ کیا لیکن فسادات کی جو آگ بھڑک اٹھی تھی اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اسی اثناء میں وہ کانگریس کے اجلاس اور آل پارٹیز کانفرنس میں بھی برابر شریک ہوتے رہے اور جنگ آزادی کی لڑائی میں بھی شد و مد کے ساتھ حصہ لیتے رہے یہاں تک کہ ۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن ہندوستان آیا تو اس کے خلاف ہمدرد میں مضامین لکھے اور مسلمانوں کو اس کا بائیکاٹ کرنے پر آمادہ کیا۔ ان مضامین میں انھوں نے حکومتِ برطانیہ پر کڑی نکتہ چینی کی اور کمیشن کے بانی ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ کی مخالفت میں رام جی میکڈانلڈ کے عنوان سے مضامین لکھ کر اس کی دروغ گوئی، بدعہدی اور کینہ پروری کا راز فاش کیا۔

شب و روز کی محنت، جانفشانی اور ذہنی پریشانیوں کے باعث ان پر مختلف امراض کے حملے ہونے لگے جن کے علاج کے لیے مہاراجہ الور نے انھیں یکم جون ۱۹۲۸ء کو پیرس روانہ کیا۔ ابھی زیر علاج تھے کہ مولانا شوکت علی اور مولانا شفیع داؤدی کے حکم پر ہندوستان چلے آئے اور صوبۂ بہار آل پارٹیز کانفرنس

---

[1] میری کہانی جلد اول صفحہ ۲۴

کی صدارت کی۔ پھر ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں کلکتہ میں آل پارٹیز کنونشن منعقد ہوا تو اس میں شریک ہوئے اور ڈومینین اسٹیٹس کے خلاف ایک پرزور تقریر کی جس سے جلسے میں ہنگامہ ہوگیا۔ تقریر کے دوران چند سرپسند لوگوں نے ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کی اور بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ کے نعرے بھی لگائے۔ جس سے مجبور ہوکر انھیں بیٹھ جانا پڑا۔ اس اہانت کے بعد انھوں نے کانگریس اور کنونشن کے اجلاس میں پھر کبھی شرکت نہیں کی البتہ دسمبر ۱۹۲۹ء کے قومی ہفتے میں شریک ہوئے جو لاہور میں منایا گیا تھا وہیں انھوں نے گاندھی جی سے بھی ملاقات کی اور سیاسی معاملات پر گفتگو کی۔

اگرچہ امراض کی شدت کے باعث مولانا بہت کمزور ہوچکے تھے اس کے باوجود تحریک آزادی کا ساتھ دینے میں کبھی کمزوری محسوس نہیں کی اور ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اسی زمانے میں لندن میں گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تو مولانا شدید علالت کے باوجود اس میں شریک ہوئے اور اپنے وطن کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے اس کانفرنس میں جو تقریر کی تھی اس کے ایک ایک جملے سے ان کی وطن دوستی اور حب الوطنی کا ثبوت ملتا ہے انھوں نے پہلے اپنی بیماریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

'جب میں شملہ کے اسپتال میں داخل ہوا تو میں نے ایک خاتون اور ایک فوجی افسر کو، جن کی جلد ہی شادی ہونے والی تھی، بڑی دانش مندی سے ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا۔ دونوں بیمار تھے اور میں نے دونوں کے بیچ کا کمرہ لے لیا۔ جب اس خاتون نے ایک عجیب وضع کے ہندوستانی کو یورپین کوارٹر میں آتے دیکھا تو اس نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ اس بوڑھے کو کون سی بیماری لاحق ہے؟ جواب دیا کہ مجھ سے یہ پوچھیے کہ اس کو کون سی بیماری نہیں ہے۔ میری کیفیت یہ ہے کہ قلب کی حالت درست نہیں ہے، بینائی میں فرق آگیا ہے، پاؤں متورم ہیں ذیابیطس کا عارضہ ہے امراض کی اس طویل فہرست سے جو میں نے پیش کی ہے، میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں کرنل گڈنی ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے تشریح امراض کے معاملے میں مجھے اپنا رقیب نہ سمجھ لیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ کوئی صاحب عقل ان امراض کے ساتھ سات میل کا سفر کرنا پسند نہیں کرے گا مگر میں سات ہزار میل کا بری اور بحری سفر طے کرکے یہاں آیا ہوں، کیوں کہ جہاں اسلام اور ہندوستان کا معاملہ آجاتا ہے وہاں میری حالت پاگلوں اور دیوانوں کی طرح ہوجاتی ہے۔"

پھر صدر جلسہ کو مخاطب کرکے جو الفاظ کہے ہیں وہ آزادی کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھے جانے کے لائق ہیں وہ

کہتے ہیں:۔

"آج میں جس مقصد سے یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جا سکتا ہوں جبکہ میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ ہوگا ورنہ میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا میں ایک غیر ملک میں جو آزاد ہے مرنے کو ترجیح دوں گا اور اگر آپ نے مجھ کو ہندوستان کی آزادی نہیں دی تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی۔"

آخرکار ایسا ہی ہوا، ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو شمع آزادی کے اس پروانے نے دیارِ غیر میں جان دے دی اور ۲۳ جنوری کو بیت المقدس کی مسجد عمر کے صحن میں سپرد خاک کیے گئے۔ مہاتما گاندھی نے ان کی وفات پر اپنے تاثرات کا بالکل صحیح اظہار فرمایا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

مولانا محمد جوہر کی موت اس وقت واقع ہوئی جب کہ ہمیں ان کی ضرورت تھی۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے زبردست کام کیا ہے۔ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو وہ برطانوی سامراج کے خلاف لڑنے والوں کی ایک بار پھر رہنمائی کرتے اور پورا ملک ان کے دوش بدوش ہو کر لڑتا۔

پروفیسر محمد مجیب
ترجمہ:- انور صدیقی

مولانا محمد علی
آپ اپنی شکست کی آواز!

مولانا محمد علی خالصتاً مسلم عوام کے آدمی تھے — شدید طور پر جذباتی، سرگرم، فعال، صاعقہ بردوش، کسی کے روکے نہ رکنے والے، ہمدردی حاصل کرنے پر آجائیں تو اپنا دل کھول کر رکھ دیں۔ جب جی چاہے رونے لگیں اور جب جی میں آئے لوگوں کو ہنسا دیں۔ انھیں خدا اور اس کی رحمتوں پر کچھ اتنا بھروسہ تھا کہ کبھی کبھی ان سے ایسی باتیں سرزد ہو جاتی تھیں جو بعض لوگوں کو سیاسی اعتبار سے غیر ذمہ دارانہ محسوس ہوتی تھیں

وہ ۱۸۷۸ء میں ریاست رام پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر ۱۹۰۲ء میں لنکن کالج آکسفرڈ سے بی اے آنرز پاس کیا۔ انھوں نے کچھ ایسی تعلیم پائی تھی جو اس زمانے کے ایک ہندوستانی مسلمان کو خود اطمینانی میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی تھی۔ اس تعلیم نے مولانا محمد علی میں یہ احساس پیدا کر دیا تھا کہ وہ دنیا میں کسی سے کم نہیں ہیں، یہاں تک کہ برطانیہ کے وزیر اعظم اور ہندوستان کے وائسرائے سے بھی۔ اسی تعلیم نے ان میں ہر ایک سے بے تکلف اور بے محابا گفتگو کرنے اور مذاق اڑانے کی جرأت پیدا کی۔ یہ کیا کم ہمت کی بات تھی کہ انھوں نے ریاست بڑودہ کی آٹھ سالہ ملازمت صحافت کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے ترک کر دی اور کلکتہ سے ایک ہفت روزہ اخبار کامریڈ (جنوری ۱۹۱۱ء) نکالا وہ بھی ایسی حالت میں کہ اس کام کے لیے ان کے پاس مالی وسائل نہ تھے۔ اس سے پہلے ہی وہ ہندوستانی اور برطانوی جریدوں میں اپنے بعض مضامین کی وجہ سے خاصی شہرت پا چکے تھے

اور اب کامریڈ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انھیں اپنی اصل صلاحیت کو نمایاں کرنے کا موقع تھا۔ ان کا یہ خیال مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا کہ ان کی ادّعایت ہی ہندوؤں میں اپنے مطالبات کے سلسلے میں اعتدال پیدا کر سکتی ہے اور انھیں ملک کی فلاح و بہبود کی خاطر، منصفانہ بنیادوں پر مسلمانوں کے ساتھ تعاون پر آمادہ کر سکتی ہے۔ مسلمان اس بات سے بہت متاثر تھے کہ مولانا محمد علی انتہائی روانی اور بے ساختگی سے انگریزی لکھتے ہیں اور برطانوی معاشرت اور ادب سے براہ راست واقفیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے ذہنوں میں وہ کچھ اس طرح چھا گئے تھے کہ انھیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ آتا کہ وہ انتہائی پیچیدہ جملے لکھتے ہیں، اصل موضوع سے برابر بھٹکتے رہتے ہیں اور اپنے مضامین میں بار بار خود اپنا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ان کے مضامین میں بذلہ سنجی، فقرے بازی اور دلچسپ واقعات کی کچھ ایسی فراوانی ہوتی تھی کہ پڑھنے والوں کو یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ وہ ایک ایسی تحریر پڑھ رہے ہیں جو ادبی تنظیم کے وصف سے عاری ہے۔ مولانا محمد علی کے پاس مزاح کا کبھی نہ ختم ہونے والا سرمایہ بھی اتنا ہی تھا جتنا کہ ان کا ذخیرۂ الفاظ۔

کہا جاتا ہے کہ جب کامریڈ نکلا تو بہت سے اونچے درجے کے انگریز عہدے داروں نے بھی اس کی خریداری قبول کر لی تھی اس لیے کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی تو ایسا ہو جو مسلمانوں کے کاز کی حمایت کرے اور ہندوؤں کی مخالفت۔ مگر جلد ہی اخبار کے ان خریداروں کو مایوسی ہوئی جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ کامریڈ کا بنیادی مقصد ایسے موقف کا اظہار تھا اور اس کی زد میں کوئی بھی آ سکتا تھا۔ جب جنگِ بلقان شروع ہوئی تو یہ اخبار دہلی منتقل ہو گیا جو اب کلکتہ کی جگہ ملک کی دارالحکومت بن گئی تھی۔ جگہ کی اس تبدیلی کی وجہ سے اخبار کا لب و لہجہ بھی بدلا۔ مولانا محمد علی شروع سے ہی پکے مسلمان تھے۔ ان کے دل میں دنیا کے تمام مسلمانوں کے لیے بیکراں محبت کا جذبہ تھا۔ اب وہ پورے مسلمان بن چکے تھے، اپنے ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ انھیں ان علاقوں کے مسلمانوں سے خاص طور پر لگاؤ تھا جو مغربی اقوام کی ہوس ملک گیری کی زد پر تھے، خاص طور سے ترکی اور طرابلس کے مسلمان (جن پر اس وقت یورپ میں سامراج کی ضرب برابر پڑ رہی تھی) ان کی توجہ کے مرکز تھے۔ اس زمانے میں ایسے لوگ کم تھے جو کھل کر ترکی کی حمایت کی ہمت کر سکتے ہوں اور ایسے لوگوں کی تعداد تو اور بھی کم تھی جن کی حمایت کی زبان پرزور اور موثر انگریزی ہو۔ مولانا محمد علی کی اس جرأت مندانہ حمایت نے انھیں نوجوان ترکوں کے حلقے سے متعارف کرایا۔ کبھی کبھی ان پر حقیقت سے نفسیاتی گریز کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور وہ یہ سمجھنے لگتے تھے کہ وہ نہ صرف یہ کہ ترکی اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان رابطے کا وسیلہ ہیں بلکہ باقی دنیا سے بھی

ترکی کے روابط انھیں کے رہینِ منت ہیں۔ مئی ۱۹۱۵ء The Choice of the Turks (ترکی کے لیے چارۂ کار)" لکھنے کے جرم میں انھیں نظربند کر دیا گیا۔ ان کی نظربندی کا سلسلہ ۱۹۱۹ء کے اواخر تک چلتا رہا۔ جیل کی تنہائی نے ان کی مذہبیت کو اور بھی چوکھا کر دیا۔ ان کے شدید شعری احساس میں جنگ کے بعد کے ترکی کے حالات کا تاثر بھی شامل ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ شہادت ان کا مقدر بن چکی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ جب ترکی کے ساتھ معاہدے کے سلسلے میں ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے لندن گئے تو اس وقت وہ ایک شائستہ، خوش لباس اور خوش گفتار سیاست داں تھے۔ وہاں انھوں نے برطانوی سامعین کو سیاسی دانش مندی کا درس دیا، ان پر چبھتے ہوئے فقرے کسے اور دلچسپ لطیفے سنائے۔ انھوں نے برطانیہ میں کٹر سامراجی اخبارات اور لائڈ جارج سب ہی کو متاثر کیا اور ظاہر ہے کہ اگر لائڈ جارج متاثر ہوئے تو کوئی بات بھی تھی۔ (اور لائڈ جارج متاثر نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ کنزرویٹو پارٹی کے سربراہ اور برطانوی سامراج کے نمائندے تھے۔ مدیر)

ہندوستان واپس آ کر مولانا محمد علی نے اپنے آپ کو مکمل طور پر خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کے سپرد کر دیا۔ اب وہ قومی اہمیت اور حیثیت کے رہنما تھے۔ ان کی فعال شخصیت، حیرت انگیز جوش اور بے ساختہ بذلہ سنجی ان کے کام آئی مگر وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو اپنے مذہبی جذبات کے اوپر قابو پا لیتے ہیں۔ انھوں نے قرآن، رسولؐ اور شریعت کو اپنے سیاسی موقف کی سچائی کی دلیل بنا لیا۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں کراچی میں اپنے خلاف مقدمے کے دوران انھوں نے جس طرح اور جس خود اعتمادی کے ساتھ جج اور جیوری کا مذاق اڑایا تھا، اس سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ انھیں اس تجویز کو پاس کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ برطانوی فوج میں بھرتی ہونا اسلامی شریعت کی بنیادی روح کے خلاف ہے۔ مقدمے میں ان کی دفاعی دلیل یہ تھی کہ انھوں نے ایسا کر کے قرآنی احکام کی پابندی کی تھی جس کا حق انھیں ملکۂ معظمہ کے ۱۸۵۸ء کے اعلان کی رو سے حاصل تھا۔ اسی سال، ذرا کچھ پہلے، انھوں نے اس مسئلے پر عوامی پلیٹ فارم پر گفتگو کر کے کہ وہ کن شرائط پر افغانوں کے خلاف جنگ میں شریک ہو سکتے ہیں، خاصی پریشان کن صورت حال پیدا کر دی تھی۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ حکمت اور مصلحت سے کام لینے کو اسلام پر اپنے ایمان کی کمزوری کی دلیل سمجھتے ہوں۔

یہ حقیقت ہے کہ اب سے پہلے ہندوستانی مسلمانوں کے موقف کو مکمل اور موثر طور پر پیش بھی نہیں کیا

گیا تھا۔ ایک طرف مغربی طاقتیں مشرق وسطیٰ میں آزادی اور خود مختاری کی تمام باقیات کو مٹا دینے پر تلی ہوئی تھیں، دوسری طرف ہندو اکثریت تھی جو مذہبی ذہن رکھنے والے اور سیاسی طور پر باشعور مسلمانوں کے حساب کے مطابق، ہندوستانی مسلمانوں کو اس لیے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھی کہ انھوں نے اسلام سے اپنی دستبرداری کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی جس میں بالعموم مذہبی ہیجان کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ہر اس شخص نے جو ذرا سا بھی اس قسم کے ہیجان کی طرف مائل تھا، اسلام کی نمائش کو اپنا نشانِ امتیاز بنالیا تھا اور یہ سمجھنے لگا تھا کہ بس یہی اپنے تحفظ اور بقا کی واحد صورت ہے۔ ایسی ہی فضا میں ہر وہ شخص جو سیاسی پلیٹ فارم سے اسلام کا اعلان کرتا تھا، خوب سراہا جاتا تھا۔ مولانا محمد علی ایسے ہی مسلمانوں کی عقیدت و ارادت کا مرکز و محور ہیں۔ اگر سنجیدگی کے ساتھ اس معاملے پر غور کیا جائے تو غالباً معلوم ہوگا کہ اس طرح مولانا محمد علی نے بالآخر اپنی حیثیت بھی کمزور کرلی اور ان مقاصد کو بھی نقصان پہنچایا، جن کے حصول کے لیے وہ کوشاں تھے۔

مولانا محمد علی نے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ یاد دلایا کہ عالم اسلامی ایک ہم آہنگ وجود ہے اور اخوت کے ایک عالمگیر رشتے میں بندھا ہوا ہے۔ ایسے لوگوں کی اُس دور میں کمی نہیں تھی جو مولانا محمد علی کے اس خیال سے متفق تھے۔ مولانا محمد علی نے چندے کی اپیل کی اور عوام سے ایثار و قربانی کے طالب ہوئے۔ اُن کی اس اپیل کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا لیکن ترکوں نے سلطنت بھی ختم کردی اور خلافت بھی۔ اب مولانا محمد علی کو جو اخوت اسلامی کے زبردست علم بردار تھے یہ نہیں سمجھ میں آرہا تھا کہ اپنی مایوسی اور اذیت کو کس طرح چھپائیں۔ اس صدمے پر قابو پانے کے لیے انھوں نے مصطفےٰ کمال کو تار بھیجے، اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ایک وفد کے ساتھ اُن سے ملنا چاہتے ہیں اور خلافت کے مسئلے پر اُن سے تبادلۂ خیال کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی تلخی اور مایوسی کا اندازہ لگانا مشکل ہے جنھوں نے خلافت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردیا تھا۔ اسی زمانے میں چندے کے خرد برد کیے جانے کی افواہیں بھی گشت کرنے لگیں جن کا اثر یہ ہوا کہ وہ جوش و خروش جو خلافت تحریک کے شباب کے دور میں پیدا ہوا تھا خاصا سرد پڑ گیا۔

لیکن مولانا محمد علی تھے کہ مسلمانوں کے کاز کی برابر نمائندگی کرتے رہے۔ انھوں نے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی۔ ساردا ایکٹ سے اختلاف کیا جس کا مقصد بچپن کی شادی کے رواج کو ختم کرنا تھا شادی کی کم سے کم عمر کا تعین کرتا تھا۔ اس ایکٹ کی رُو سے لڑکے کی شادی کی عمر اٹھارہ سال اور لڑکی کی چودہ سال قرار

یالیٰ ہندوؤں میں ہی نہیں گاؤں میں رہنے والے مسلمانوں میں بھی بچپن کی شادی کا رواج عام تھا شہروں میں پس ماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والے مسلمان گھرانوں میں بھی یہ رسم رائج تھی۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس رواج سے نیک چلنی کی توقعات کو بھی پورا نہیں کیا تھا۔ مولانا محمد علی اس بات کی کوشش کر سکتے تھے کہ اس ایکٹ میں کچھ ایسی ترمیم ہو جائے جس سے شریعت کے تقاضے پورے ہو جائیں۔ اور وہ یہ بات سمجھتے بھی تھے کہ اس ایکٹ کے ذریعے شریعت کے منشا کی تکمیل ہوتی ہے مگر وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو لیے جو اس بات کا مطالبہ کر رہے تھے کہ مسلمانوں کو اس قانون کے نفاذ سے الگ رکھا جائے اس وجہ سے کہ اسلامی شریعت اس سلسلے میں عمر کا تعین نہیں کرتی اور معاملے کو مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑتی ہے اس قانون کے مخالفین نے اس بات کی دھمکی بھی دی کہ اگر مسلمانوں پر اسے نافذ کیا گیا تو بغاوت پھوٹ پڑے گی۔ اس بحث میں رسولؐ اور ان کے صحابہؓ کچھ اس طرح بیچ میں لائے گئے کہ گویا اس جھگڑے میں ان کی حیثیت ایک فریق کی ہو۔ اس ایکٹ کے مخالفین نے جو رویہ اپنا رکھا تھا اس سے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ان لوگوں نے اپنے بزرگوں کے دماغ کو اپنے اوپر فرض کر لیا ہو۔

۱۹۲۳ء میں جب مولانا محمد علی، مہاتما گاندھی سے دور ہونے کے بعد ایک ایسے فرقے کے رہنما بن گئے جس کے ردعمل اور مزاج کا کوئی بھروسہ نہیں تھا اور جو ہر لمحہ جھگڑوں میں کود پڑنے پر آمادہ رہتا تھا۔ مولانا محمد علی کی فعالیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اگرچہ وہ بڑی حد تک اپنی معنویت کھو چکی تھی۔ اب وہ اپنی موقف کا معروضی محاکمہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھیں برطانوی حکومت نے ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس کے آخری اجلاسوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے موقف کی ترجمانی کے لیے مدعو کیا تھا۔ اس موقعے پر برطانوی حکومت سے ان کی یہ اپیل کہ وہ ہندوستان کو آزادی دے ورنہ وہ ایک غلام ملک کو زندہ واپس نہیں ہوں گے، ایک اذیت ناک شکست کا اعتراف تھی۔

(پروفیسر محمد مجیب کی کتاب دی انڈین مسلمس سے)

ضیاء الحسن فاروقی

محمد علی اور ابو الکلام

(مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے پس منظر کی ایک جھلک کے ساتھ)

سرسید احمد خاں نے مدرسۃ العلوم کے قیام کے ساتھ ہی ایک آزاد مسلم یونیورسٹی کے قیام کا خواب بھی دیکھا تھا، لیکن انسان خواہ کیسا ہی بڑا نصب العین اپنے سامنے رکھے اور خواہ کتنا ہی دلکش و دل فریب خواب دیکھے، ضروری نہیں ہے کہ اس نصب العین کی تکمیل یا اس خواب کی تعبیر اس کے سوچے ہوئے نہج کے مطابق ہی ہو۔ سرسید مرحوم کے عزائم کا المیہ یہی تھا کہ "علی گڑھ" اپنی تمام بڑائیوں، خوبیوں اور کامرانیوں کے باوجود ان کے خواب کی صحیح تعبیر نہ ثابت ہو سکا۔ لیکن یہ موضوع اپنے اندر کئی جہتیں اور بڑی وسعتیں رکھتا ہے اور یہاں اس کا بالکل موقع نہیں کہ اس داستان کو چھیڑا جائے، یہاں تو مجھے ان دو بڑی شخصیتوں کے "خصوصی" تعلق کی محض ایک جھلک دکھانی مقصود ہے جو مسلم یونیورسٹی تحریک کے نشیب و فراز کے آئینے میں نظر آتی ہے۔ اور وہ بھی بڑے اختصار کے ساتھ، ورنہ تفصیل میں جائیے تو افسانہ در افسانہ حیرت کے مصداق ایک بڑی داستان بن جائے۔ یہ دو بڑی شخصیتیں تھیں، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابو الکلام آزاد۔

دیگر دوسرے شواہد سے قطع نظر، سرسید تعلیم کے معاملہ میں کتنی اور کیسی آزادی چاہتے تھے۔ اس کے لیے ان کی ایک وہی شہادت کافی ہے جو انھوں نے ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے سامنے دی تھی۔ انھوں نے کہا تھا۔

> "جب تک خود لوگ اپنی تعلیم کا تمام اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے، اس وقت تک مناسب طور پر ان کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے، پس ملک کے لیے زیادہ تر مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علاحدہ ہو جائے۔"

سرسید کے بعد ان کے رفقاء کا بھی یہی نصب العین رہا چنانچہ ان کی وفات کے چند ماہ بعد دسمبر ۱۸۹۸ء میں ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے لاہور کے اجلاس میں "محمڈن یونیورسٹی" کی ضرورت سے متعلق ریزولیوشن پاس کیا اور مسلمانوں سے اس مقصد کے لیے دس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا گیا اس کے بعد ۱۹۱۰ء تک یہ تحریک آہستہ آہستہ نشوونما پاتی رہی، یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۱۰ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے ناگپور اجلاس میں حسب ذیل تجویز بڑے جوش و خروش کے ساتھ منظور کی گئی ۔

"اس کانفرنس کی رائے میں اس ملک کے مسلمانوں کی حقیقی ترقی اور کامل بہبودی ان کی اعلیٰ تعلیمی ترقی پر منحصر ہے جس کے لیے مجوزہ مسلم یونیورسٹی کا قیام از بس ضروری ہے، اور اب وقت آگیا ہے کہ قوم کی اس دیرینہ تحریک کی تکمیل کے لیے عملی تدبیر اختیار کرنے میں پوری سعی کی جائے"

اجلاس کانفرنس کے بعد ۱۰ جنوری ۱۹۱۱ء کو علی گڑھ میں نواب وقار الملک کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا جس میں "کمیٹی تکمیل محمڈن یونیورسٹی" کے نام سے ایک مستقل کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی ۔

سر آغا خان اس کمیٹی کے صدر تھے اور سکریٹری نواب وقار الملک، اس کے بعد ۱۶ فروری ۱۹۱۱ء کو ایک کمیٹی مجوزہ مسلم یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن مرتب کرنے کے لیے بنائی گئی جس کے صدر راجہ صاحب محمود آباد اور سکریٹری ڈاکٹر سید علی بلگرامی منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر سید علی بلگرامی کا دو ماہ بعد انتقال ہوگیا تو ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اس کمیٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس کے بعد حکومت ہند سے کچھ بے ضابطہ اور کچھ باضابطہ گفت و شنید شروع ہوئی کہ یونیورسٹی محض مقامی ہوگی یا الحاقی بھی، حکومت کے اختیارات کیا ہوں گے، اور یونیورسٹی کے اپنے اختیارات کیا ہوں گے، اس کے نام کے ساتھ مسلم ہوگا یا نہیں، ریگولیشن اور یانی لاز کے معاملہ میں یونیورسٹی کس قدر بااختیار ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک لمبا قصہ ہے، جسے ہم چھوڑتے ہیں، لیکن اتنا یاد رکھیے کہ حکومت سے یہ ساری گفت و شنید اول اول بصیغۂ راز رکھی گئی، کچھ تو اس کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے بھی کہ مسلمانوں کو یہ امید دلائی گئی تھی کہ متعینہ رقم جمع ہوتی نہیں کہ ایک آزاد مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا نہیں، مسلمانوں نے دل کھول کر چندہ دیا اور مقررہ رقم جمع ہوگئی، لیکن حکومت اس کے لیے آمادہ ہوتی نظر نہیں آتی کہ وہ مسلمانوں کی یہ آرزو پوری کر دے کہ چارٹر کے ذریعہ ایک ایسی آزاد مسلم یونیورسٹی قائم ہو جائے جسے ملک بھر کے مسلم کالجوں اور اسکولوں کا الحاق کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ ملک میں طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی تھیں اور قوم کے رہنماؤں پر نکتہ چینیاں بھی ہونے لگی تھیں، ادھر نواب

وقارالملک برابر اپنے بیانات اور مضامین کے ذریعہ صحیح صورت حال سے مسلمانوں کو باخبر رکھنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ دفعتاً جولائی ۱۹۱۲ء کے آخری عشرہ میں شملہ سے حسب ذیل سرکاری اعلان شائع ہوا:-

"یہ قطعی طور پر فیصلہ ہو گیا ہے کہ علی گڑھ اور بنارس کی یونیورسٹی کا دائرہ (اثر) اسی مقام تک محدود ہو جس میں کہ وہ (یونیورسٹی) قائم ہو۔"

یہ اعلان برق رفتاری کے ساتھ پورے ملک میں پھیل گیا اور لوگوں میں مایوسی اور بددلی کے ساتھ غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ نواب وقارالملک قوم کے اس غم و غصہ میں برابر کے شریک رہے، مسلمانوں کے اخبارات بھی ان کے ہمنوا تھے، اسی دوران کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے صدر راجہ صاحب محمودآباد کو گورنمنٹ کا ایک مراسلہ بذریعہ تار جو ۹ر اگست ۱۹۱۲ء کو شملہ سے چلا تھا، ملا جس میں گورنمنٹ کے پہلے اعلان کی مزید تصدیق تھی، اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ "ہز میجسٹی کے وزیر ہند کانسٹی ٹیوشن کے متعلق مع اس کی جملہ تفصیلات کے اور علی الخصوص یونیورسٹی کی جماعت ہائے ترکیبی کے درمیان تقسیم اختیارات کے متعلق اپنے فیصلے کو ہنوز محفوظ رکھتے ہیں۔" مراسلہ کے آخر میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ "یہ یونیورسٹی آئندہ علیگڑھ یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہوگی۔"

ظاہر ہے کہ اس مراسلہ سے مسلمانوں کی مایوسی میں اور اضافہ ہوا۔ ۱۱ر اور ۱۲ر اگست ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا جو جلسہ ہوا، اس میں بڑی جارحانہ تقریریں ہوئیں اور حکومت کی شرائط کو مات سے صاف صاف انکار کر دیا گیا۔ چھ اصحاب پر مشتمل جن میں مولانا محمد علی (جو اس وقت عام طور پر مسٹر محمد علی آکسن کہے جاتے تھے) بھی شامل تھے، ایک سب کمیٹی مقرر کی گئی جو ممبر تعلیمات سرہارکورٹ بٹلر کے مراسلہ کا جواب تیار کر کے اور کمیٹی کی منظوری لے کر اسے ان کے پاس بھیج دے، چنانچہ ۱۴ر اگست کو یہ جواب بھیج دیا گیا۔

اس کے بعد صورت حال یہ ہوئی کہ حکومت کے خلاف عام ناراضگی کی ایک فضا پیدا ہو گئی اور مسلم اخباروں نے اس مسئلہ پر خوب خوب لکھا، ملک میں ایک قسم کا ایجی ٹیشن پھیل گیا نواب وقارالملک پر جن کی صحت پہلے ہی سے خراب چل رہی تھی، ان تمام واقعات کا بہت اثر تھا وہ تبدیل آب و ہوا کے لیے دہرہ دون چلے گئے۔ وہاں انھوں نے یونیورسٹی سے متعلق ایک اسکیم تیار کی جو اخبارات کے

علاوہ ایک رسالہ کی صورت میں بھی چالیس صفحے پر شائع ہوئی، اسکیم کے دو حصے تھے، پہلے حصہ میں مجوزہ یونیورسٹی سے متعلق حکومت ہند کے خیالات و تجاویز پر بحث کرکے انھیں مسلمانوں کے لیے مضر بتایا تھا اور الحاقی یونیورسٹی کی ضرورت ثابت کرکے مسلمانوں کو جدوجہد جاری رکھنے کی تاکید کی تھی۔ دوسرے حصہ میں انھوں نے یہ بحث کی تھی کہ اگر باوجود کوشش اور جدوجہد کے حکومت سے معاملہ طے نہ ہو اور آزاد یونیورسٹی کا قیام ناممکن نظر آئے تو جو روپیہ یونیورسٹی کے لیے جمع ہوا ہے اس کا بہترین مصرف کیا ہوسکتا ہے۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ دوسرے حصے میں نواب صاحب نے ایک جدید تخیل **جامعہ اسلامیہ** کا پیش کیا جس کے لیے حکومت کے چارٹر کی ضرورت نہ تھی۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جس جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاتھوں رکھا گیا، اس کا تخیل آٹھ برس پہلے ہی نواب صاحب نے پیش کردیا تھا بلکہ ایک موقع پر پروفیسر ہارون خان شروانی نے راقم الحروف کو یہ بھی بتایا کہ نواب بھوپال کی مدد سے اس آزاد جامعہ ملیہ اسلامیہ کو دہرہ دون میں قائم کرنے کا منصوبہ بھی تیار ہوگیا تھا۔ نواب صاحب نے اپنی اس اسکیم میں نہایت تفصیل سے جامعہ اسلامیہ کی ضرورت، خصوصیات اور طرز تعلیم پر بحث کی تھی، ان کی رائے تھی کہ جامعہ اسلامیہ میں تمام علوم کی تعلیم اردو زبان میں ہو اور انگریزی بطور ثانوی زبان پڑھائی جائے، انھوں نے یہ بھی تجویز کیا تھا کہ چونکہ مسلمانوں کو ان کی حسب منشا یونیورسٹی چارٹر ملنے کی امید نہیں ہے، اس لیے وہ تمام سرمایہ جو مسلم یونیورسٹی کے واسطے جمع ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ اس جامعہ اسلامیہ کے سپرد کردیا جائے۔

نواب وقار الملک کی یہ اسکیم نومبر ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی اور اخبارات میں از سر نو بحث شروع ہوگئی، لیکن اب چونکہ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے مشورہ کے مطابق قطعی فیصلہ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی پر چھوڑ دیا گیا تھا اس لیے اس کمیٹی کا جلسہ طلب کیا گیا جو ۲۷ دسمبر ۱۹۱۲ء کو قیصر باغ کی بارہ دری میں نواب رامپور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس دن تو کچھ طے نہ ہوسکا اور ۲۸ دسمبر ۱۹۱۲ء کو ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس رکھا گیا تھا، اس لیے فاؤنڈیشن کمیٹی کی دوسری نشست ۲۹ دسمبر کو ہوئی۔ کمیٹی کا یہی وہ جلسہ تھا جس کی "معرکہ آرائیوں" سے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے "حدیث الغاشیہ" کے خاص عنوان اور "تحتہم شتی کا صحیح شمار" کے تحت عنوان سے فروری اور مارچ کے الہلال میں ایسا وہ طربیہ مضمون شائع کیا تھا جس میں طنز و مزاح نگاری کی حیثیت سے بھی وہ ایک بلند مقام پر نظر آتے ہیں، لیکن قبل اس کے کہ ہم مولانا ابوالکلام آزاد

اور مولانا محمد علی جوہر کی قلمی نوک جھونک سے لطف اندوز ہوں، ضروری ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کی ایک نظم کے چند ٹکڑے پڑھ لیں، علامہ شبلی فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاس میں موجود تھے اور وہاں جو کچھ ہوا اس سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ نظم لکھی تھی۔

ہوا یوں کہ فاؤنڈیشن کمیٹی کے ۲۷ دسمبر کے جلسے میں میجر سید حسن بلگرامی اور مسٹر محمد علی آکسن اور بعض دوسرے حضرات نے بڑی گرما گرم تقریریں کیں ان کے خلاف بھی تقریریں ہوئیں، جلسے میں دو فریق صاف نظر آئے جو ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرا تھے، اور ان میں چند بنیادی اختلافات تھے، غرض اس دن کچھ طے نہ ہو سکا اور جلسے میں بڑی بدنظمی رہی، ۲۹ دسمبر کو دوسرا اجلاس ہوا اس درمیانی وقفے میں کارکن قوتیں برابر اپنا کام کرتی رہیں، یہاں تک کہ ۲۸ اور ۲۹ دسمبر کی درمیانی شب میں صبح کے اجلاس میں پیش کرنے کے لیے ایک ریزولیوشن مرتب کیا گیا اس کے بعد اس ڈیپوٹیشن کے بعد کی ایک فہرست جسے وائسرائے کے پاس جا کر مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنا تھا اس غرض سے مرتب کی گئی کہ جلسے میں کمیٹی سے اس کی منظوری حاصل کر لی جائے گی۔ اس فہرست کی ترتیب میں نواب وقار الملک بھی شریک تھے، لیکن نواب صاحب کے اٹھ جانے کے بعد ایک مختصر صحبت میں ایک بجے شب کے بعد یہ فہرست بدل دی گئی اور گویا مجموعی طور پر فریقین میں جو ۲۷ دسمبر کے اجلاس میں ایک دوسرے سے سرد آزما تھے اندر اندر ہی میں سمجھوتہ ہو گیا۔ اب صبح ہوئی، اجلاس منعقد ہوا، لیکن اس اجلاس کا رنگ دوسرا تھا، نہ جوش و ہنگامہ نہ بحث و تکرار تمام کارروائی بڑے سکون اور خوش اسلوبی سے عمل میں آئی، لوگوں کو حیرت تھی کہ ماجرا کیا ہے، دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا، آخر کار لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ لیڈروں نے خفیہ طور پر باہم سازش کر لی اور قوم کو احمق بنایا۔

اجلاس کے بعد اخبارات نے اجلاس کے واقعات پر مضامین لکھے، ذمہ دار اشخاص نے نکتہ چینیاں کیں، نواب وقار الملک کے متعلق بھی بدگمانیوں کا اظہار کیا جانے لگا، مجبور ہو کر انھوں نے ۵ فروری ۱۹۱۳ء کو ایک مفصل مضمون لکھا اور کہا کہ "میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں ہے کہ بعض اہم واقعات پر جو پردہ پڑا ہوا ہے اس کو اٹھاؤں۔" اور انھوں نے ایسا ہی کیا کہ صحبت نیم شبی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے ظاہر کر دئے اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام مجبوریاں اور معذوریاں بھی صاف صاف بیان کر دیں جن کی وجہ سے ان کو اجلاس میں خاموش رہنا پڑا۔"

اب ہم اس قصہ کو یہیں ختم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ قارئین پس منظر کو اچھی طرح سمجھ چکے ہوں گے۔ محمد اکرام اللہ خاں ندوی بیان کرتے ہیں کہ "فاؤنڈیشن کمیٹی کے اس اجلاس کا تماشا میں نے بچشم خود دیکھا ہے علامہ جمیل مظہری بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔ انہوں نے ان واقعات کا جو تاثر لیا اس کو دوسرے روز ایک نظم میں ادا کیا۔" اس نظم کے مندرجہ ذیل اشعار مسلم یونیورسٹی تحریک کی تاریخ کا ایک اہم ورق ہیں۔

اب کے جو لکھنؤ میں دکھایا گیا سماں ۔۔۔ سچ پوچھئے تو مضحکۂ روزگار ہے
دیکھا یہ پہلے دن کہ ہر اک گوشۂ بساط ۔۔۔ میدانِ رزم و عرصۂ گیر و دار ہے
غل ہے کہ وہ مقدمۃ الجیش آگیا ۔۔۔ اب انتظارِ فوج یمین و یسار ہے
احرار کی صفوں کی صفیں ہیں جمی ہوئی ۔۔۔ مجلس تمام عرصۂ کارزار ہے
اسٹیج پر ہر ایک پھرتا ہے اس طرح ۔۔۔ گویا حریف رستم و اسفندیار ہے
ہاتھ اٹھ رہے ہیں یا علم فتح ہے بلند ۔۔۔ چلتی ہوئی زباں ہے یا ذوالفقار ہے
ہر نوجوان ہے نشۂ آزادگی میں مست ۔۔۔ جو ہے وہ حریت کا سر پُر خمار ہے
احرار کہہ رہے ہیں نہ مانیں گے ہم کبھی ۔۔۔ ویٹو کا ویسرائے کو کیا اختیار ہے
الحاق گر نہیں ہے تو ہر سعی ہے عبث ۔۔۔ مسلم کا لفظ خاص ہمارا شعار ہے
جو والیانِ ملک کے تھے رہبر انجمن ۔۔۔ سب دم بخود سے تھے کہ یہ کیا خلفشار ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں ۔۔۔ نے وہ حرارتِ وحشت نہ وہ گیر و دار ہے
ٹوٹی ہوئی صفیں ہیں علم سرنگوں ہیں سب ۔۔۔ بازوئے تیغ گر جو تھا رعشہ دار ہے
"سادق" کا ایک حال بچھا ہے ہر طرف ۔۔۔ ہر شخص اس کی فکر میں مصروفِ کار ہے
- سرمستیاں ہیں دورِ قدح ہائے رات کی ۔۔۔ ہر شخص "حکمتِ عملی" کا شکار ہے

خود آپ اپنے ہاتھ سے کھائی ہے گو شکست ۔۔۔ کہتے ہیں پھر یہ "فتح مبیں یادگار ہے"
حیران تھے عوام کہ کیا ماجرا ہے یہ ۔۔۔ یہ کیا دورنگیٔ چمن روزگار ہے
احرار کا طریقِ عمل ہے اگر یہی ۔۔۔ تیر کامیابیوں کا عبث انتظار ہے

---

۲ مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال جب نکلا تو مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہو چکی تھی، چنانچہ الہلال نے اول روز ہی سے اس تحریک سے متعلق لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یکم ستمبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں مولانا آزاد نے مسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر مولانا محمد علی سے چند امور کی وضاحت چاہی تھی۔ الہلال کی اسی اشاعت میں مولانا آزاد کے اس مضمون کی دوسری آخری قسط بھی چھپی تھی جس کا عنوان تھا " شہ شام کی نصف شب "

مولانا آزاد نے "مسلم یونیورسٹی کونسٹی ٹیوشن کمیٹی" کے عنوان کے تحت لکھا،

"ہم کو معلوم ہے کہ ہمارے دوست وہی محمد علی ہیں جنھوں نے نواب محسن الملک مرحوم کے زمانے میں اپنے کالج سے بڑے بڑے خطابات حاصل کئے تھے اور پھر یہ وہی محمد علی ہیں جنھوں نے ہمیشہ کالج کی رریرستی کی مخالفت کی اور ٹرسٹیوں کی دائمی حکمرانی کے مسئلے کو بار بار چھیڑا وہ گو ہمیشہ علی گڑھ میں رہے مگر ہم نے تو ہمیشہ ان کو اس کے باہر ہی دیکھا ہے اور اب تو میلوں دور دیکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے جب چاہا تھا کہ آذر کے تکدے کو توڑے تو خود اسی کے گھر میں خلیل بت شکن کو پیدا کر دیا تھا۔ ہم کو یقین ہے کہ مسٹر محمد علی بھی علی گڑھ سے اسی لیے اٹھائے گئے ہیں تاکہ اپنے گھر کی دیواروں سے بت پرستی کے نقوش مٹا دیں

"مسٹر محمد علی کے ہمارے تعلقات اب صرف دوستانہ ہی نہیں بلکہ ایسے قریب کے عزیزانہ ہیں کہ ان کی نسبت رائے قائم کرنے کا پورا موقع رکھتے ہیں ہم نے اچھی طرح اندازہ کر لیا ہے کہ ان کے دل میں آزادی اور جوش دونوں چیزیں ہیں۔ یونیورسٹی کمیٹی کے متعلق عام طور پر موجودہ حالات نے بے اعتمادی اور شکوک پیدا کر دیے ہیں کیا اچھا ہو اگر وہ حق گوئی اور بے لاگ سچائی کی قدر و قیمت کو پیش نظر رکھ کے مندرجہ ذیل امور پر اپنی معلومات ظاہر کر دیں وہ ابتدا سے شریک کار رہے ہیں اور ہم کو شکوک اور سوءظن سے نجات دے سکتے ہیں۔"

۸ ستمبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں مولانا محمد علی نے الہلال کے دونوں مضمونوں کا جواب دیتے ہوئے اپنا ایک مکتوب شائع کرایا جس کے چند ٹکڑے درج ذیل ہیں اسی اشاعت میں مولانا آزاد نے ترکی بہ ترکی لکھا۔ مولانا محمد علی نے لکھا تھا:-

"مانا کہ الہلال افقِ عالم پر اس وقت نمودار نہ ہوا تھا مگر آزادی کے بدرِ کامل کو یہ کیا گہن لگا تھا کہ آج کامل ایک سال بعد ظلمتِ علی گڑھ پر نورِ ایمان غالب آیا ہے۔"

"آنجناب نے صرف سر ہارکورٹ بٹلر کی ۹ر اگست ۱۹۱۲ء کی تحریر کا ترجمہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں پڑھا اور اس میں جو فقرہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۱ء سے ماخوذ تھا اس کی غلط تاویل فرما کر بلا غور و فکر اور بے تامل پچاس ساٹھ مسلمانوں کو کاذب اور فریبی ٹھہرا دیا اور (آگے آیت) کلامِ الٰہی سے اپنے فتوے کی تصدیق بھی حسبِ معمول فرما دی، شاید ظنِ مومن کی یہی تعریف ہو۔ مگر یہ مسائل مذہبی ہیں اور میں محض سگِ دنیا۔ البتہ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ یہ طریقۂ اخبار نویسی خواہ لکھنے والے کے لیے کتنا ہی دل خوش کن اور عوام کے لیے کیسا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، جن پر سب و شتم کی بوچھار پڑتی ہے ان کے لیے ضرور بہت کچھ دل شکن ہے۔

"کچھ ہی سہی مگر آنجناب نے مضمون کا عنوان اچھا سوچا تھا۔ "لستہ شب کی تصعیب" کی سرخی شانِ نزول کے لیے نہایت موزوں ہوئی مگر ذرا قبل از وقت ثابت ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے رمضانی نے اصل وقت سے کچھ گھنٹے قبل ہی یہ کہہ کر چونکا دیا کہ

"زلفش بہ کمر رسیدہ باشد"

مولانا آزاد نے جواب میں قلمبند فرمایا:-

"آپ نے "آزادی کا بدرِ کامل" اگر محض "ہلال" کا ضلع بھانے کے لیے لکھا ہے تو اس ردیفِ عبارت سے خود بھی مزہ لیتا ہوں۔ لیکن اگر طنز ہے تو مزاح سے الگ ہو کر مجھے کہنے دیجئے کہ آزادی اور آزاد سانی کے درجہ کو تو اپنی بساط سے بہت بلند سمجھتا ہوں۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے جن قربانیوں اور خود فروشیوں کی ضرورت ہے وہ ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہو سکتیں۔ میرے دل میں تو ایک لمحہ کے لیے بھی اس دعوے کا خطرہ نہیں گزرا مگر میری محرومی سے آزادی کی آواز دنیا سے معدوم نہیں ہو سکتی۔ اس کو مجھ میں نہ ڈھونڈیے

البتہ اس کی آواز اٹھے تو کانوں کو بند بھی نہ کیجئے

منکر سواں گشت چو دم زنم از عشق

این نسخہ مگر سود ما دگرے ہست

"آپ معترف ہیں کہ "ظن المومنین خیرا" کی کتابی تعریف ہے کہ کسی کو ایسے سخت الزام دیے جائیں؟ لیکن آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ آخر حسن ظن کی کوئی حد بھی تو ہونی چاہئے۔ برسوں مسلمانوں نے اپنے لیڈروں کے ساتھ حسن ظن سے کام لیا لیکن اس حسن ظن کا جو نتیجہ نکلا وہ آپ کے دل میں اور میری زبان پر ہے۔ اب تو کچھ دنوں سوء ظن ہی سے کام لینے دیجئے۔ آپ نے "سنگ دنیا" کے نصف کی ٹوپی خود ہی اپنے سر اوڑھ لی حالانکہ جن سروں کے لیے قطع کی گئی تھی ان کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں گو آپ اس طرف اشارہ نہ کریں۔ حیران ہوں کہ آپ کو کسی خیال میں اپنے سے مختلف نہیں پاتا، لیکن پھر دیکھتا ہوں تو بہت دور ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ جام تو آپ کے ہاتھ میں بھی ہے مگر "فسق" کے الزام کے لیے میرا ہی وجود موزوں ہے۔

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و برما نام فسق"

"جناب نے عنوان مضمون "شب تمام کی نصف شب" کی داد دی ہے۔ لیکن اب میں خود اس عنوان کو قابل داد نہیں سمجھتا کیونکہ "نصف شب" کی جگہ "صبح خمار" سطروں کے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ البتہ "رقص نہ کمر رسیدہ" کا مصرع جناب نے اچھا یاد دلایا اگرچہ یو پی رشک کشتی کی رازداری کی زلف نیم شبی کمر تک نہیں بلکہ اب تو صبح تک کی جمع شدہ شبنم میں بھیگ رہی ہے۔"

۵ر اور ۲۶ر فروری ۱۹۱۳ء اور ۵ر اور ۱۲ر مارچ ۱۹۱۳ء کی الہلال کی اشاعتوں میں مولانا آزاد کا وہ معرکۃ الآرا مضمون ہے جس کا پہلا عنوان "حدیث الغاشیہ" ہے اور تحتی عنوان "نشۂ نیم شبی کا صبح خمار" مولانا کا یہ مضمون اتنا تیکھا اور طنز و مزاح کا ایسا شاہکار ہے کہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اس میں مولانا محمد علی کے "انقلاب حال" پر پھبتیاں ہیں اگرچہ بادہ و ساغر کی زبان میں ہیں، کہیں کہیں صاف صاف نام بھی لے لیا ہے اور "ہمارے شیوہ طراز دوست مسٹر محمد علی" اور "ہمارے عشوہ فرما دوست مسٹر محمد علی" کہہ کر ان کی

بحسب ... اپنے خیال و ذاتی مشاہدے کے مطابق، روشنی ڈالی ہے۔ آپ ابھی ابھی علامہ شبلی کی نظم کے کچھ اشعار پڑھ چکے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ مولانا آزاد کے اس مضمون کے چند ٹکڑے بھی ملاحظہ کر لیں۔ دیکھئے دونوں میں کس قدر مطابقت ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں :-

"اصل یہ ہے کہ پہلے اجلاس میں جن بعض زبان آوران آزادی نے سرگرم تقریریں کی تھیں، ان کی نسبت لیڈروں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ ابھی ان سنہری ٹکڑوں کے لیے آگ کی آزمائش باقی ہے۔ ۲۷ دسمبر کے جلسے میں جبکہ لفظوں کی جگہ زبان سے شعلے نکل رہے تھے تو راجہ صاحب محمود آباد ہمارے مجلس طراز دوست مسٹر محمد علی کو مخاطب کر کے دل ہی دل میں ضرور کہتے ہوں گے۔

مجلس طرازیوں کے دکھاؤں گا سب مزے
تم اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے

بالآخر انتظار میں زیادہ دیر نہیں لگی اور بہت جلد تنہائی کا "گوشۂ خلوت" ہاتھ آ گیا .. کہا جاتا ہے کہ راجہ صاحب نے کہا تھا کہ "جب تک مسٹر محمد علی رام نہیں کئے جائیں گے، کچھ نہیں ہوگا" یہی سبب ہے کہ اس "خلوت شب" کی بارات کا دولہا انہی کو بنایا گیا . . .

خیر یہ تو اس "شب وصل" کی شام تھی، اس کے ذکر کو کہیں جلد ختم کیجئے کیونکہ اصل پر لطف حصہ تو اس کے بعد آتا ہے جبکہ رندان بادہ گسار نے "حجلۂ ہم شبی" آراستہ کیا اور موٹر کاریں بھیج بھیج کر ایک ایک شریک بیان کی قسمت حصہ کو مژدۂ بادہ گساری سے سرشار کیا گیا۔

وقت آں نیست کہ در حجرہ بخوانی تنہا!

"چشم تصور سے کام لیجئے کہ دسمبر کے آخری ہفتے کی سرد راتیں ہیں، لیلائے شب کی زلف کمر سے گزر چکی ہے۔ ایک کنج خلوت میں صحبت بادہ پرستی گرم ہے اور گرم گرم سازشوں کی۔

دھری شراب ہے، بیٹھے ہیں جا بجا ساقی

قبل اس کے کہ آپ کسی مدعی زہد کو الزام دیں آپ ہی کو منصف بناتے ہیں کہ بھلا ایسی لوچ لچک اور ولولۂ مجلس صحبت میں اگر ہمارے کسی "دوست" کی توبہ نے لغزش کھائی اور اس جام عہد ورا تو

کو سر سے لگائے ہی ہی جو کسی کے "دستِ طلائی" سے پیش کیا تھا تو انصاف کیجئے، آخر پہلو میں دل کس کے نہیں ہے؟

"خود صحبت آ ماپاں سینہ کا بیان ہے کہ یہ بادہ گساری رات کے دو بجے تک جاری رہی تھی" اللہ اللہ! چاندنی کی راتیں اور پچھلے پہر کی پراسرار صحبتیں!! آپ الزام و اعتراض کی فکر میں ہیں اور "رات کے دو بجے" کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے کیسے خیالات میرے دماغ میں گذر رہے ہیں، رات کی تاریکی پچھلا پہر، رندانِ شاطر و کہنہ مشق کا ہجوم اور بعض نوجوان و نوآموز مدعیانِ حریت، پھر شغل مئے پرستی کا یہ عالم، اب کیا کہوں کہ کیا کہنا چاہتا ہوں!

مست رلسترس افتد و رندان داسند

حالتِ مست کہ بر بستر ہشیار افتد"

مولانا نے غالباً مولانا محمد علی ہی کو ذہن میں رکھ کر اپنے اس مضمون میں بڑے چبھتے ہوئے سحر لکھے ہیں اور ایسے تیر چلائے ہیں جن کا نشانہ خطا نہیں کرتا۔ دو تین سحر آپ نے ابھی پڑھے، چند سعر اور ملاحظہ ہوں بس کسی کی "تاراجِ متاع" کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، مثلاً

نو شبانہ می نمائی، بہ بر کہ بودی امشب؟

کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

جو کام میں عمر کے ہوئیں صرف

افسوس وہ دل ربا ادائیں

اور پھر یہ اشعار

یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پر یہ اختیار

سب موم کر لیا، سحر آہن بنا لیا

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی

میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

معشوقِ ما بہ شیوۂ ہر کس موافق است
با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ مولانا محمد علی نے جب یہ مضمون دیکھا ہوگا تو جیسا کہ ان کا مزاج تھا کہ جوش میں بھی اور غصہ میں بھی قابو سے باہر ہو جاتے تھے، انھوں نے "رقص بسمل" کا سا سماں باندھ دیا ہوگا، میر محفوظ علی بدایونی نے اپنے ایک مضمون "محمد علی" میں مولانا پر "حدیث الغاشیہ" کے عنوان والے مضمون کا حوالہ دیا ہے، ہم میر صاحب کے اس مضمون کے متعلقہ حصے کو نقل کر کے اپنی بات ختم کرتے ہیں۔ میر صاحب لکھتے ہیں:

"مسلم یونیورسٹی کے سلسلے میں قیصر باغ لکھنؤ میں جلسہ ہوا۔ اس وقت یونیورسٹی کے متعلق (پنجابی ارباب صحافت کے محاورہ میں) "نرم" اور "گرم" جماعت میں تصادم آرا، تھا۔ راجہ محمود آباد "نرم" جماعت کے قائد تھے اور محمد علی "گرم" جماعت کے روح رواں۔ مگر جب درمیان "صلح کوان کی رائے میں" نرمی" آگئی۔ اس پر الہلال مرحوم نے "حدیث الغاشیہ" کے عنوان سے ایک دھواں دھار مضمون لکھا جس میں (الہلال کی غیر موجودگی میں حافظہ پر بھروسہ کر کے لکھتا ہوں) جب تار اور تاراج متاع کا سماں باندھ کر آخر میں یہ چبھتا ہوا شعر لکھ دیا

معشوقِ ما بہ مذہب ہر کس مطابق است[1]
با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

"محمد علی کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ واپس آکر جب یہ مضمون دیکھا تو چونکہ (ان کے خیال سے) واقعات کو الٹ پھیر کر کے دکھایا گیا تھا، لہٰذا غصہ سے عجیب حالت تھی۔ کہنے لگے، محفوظ! اس کے جواب میں کوئی شعر بتاؤ۔

"میں نہ شاعر ہوں، نہ شعرا کے کلام کا حافظ، بھلا ایک منٹ میں شعر کیا بتا سکتا تھا، مگر ان کی حالت دیکھ کر کہہ دیا۔ اچھا ابھی بتاتا ہوں! اتفاق کی بات، سعدی کا ایک شعر ذہن میں آگیا اگرچہ نہ تکلف مناسب موقع ہو سکتا تھا، مگر اس وقت اقتضائے مصلحت یہی تھا کہ شعر پڑھ دیا جائے،

---

[1] اصل مصرع اس طرح نہیں ہے بلکہ یوں ہے ۔ ع معشوقِ ما بہ شیوۂ ہر کس موافق است

چنانچہ میں نے کہا!

بر کفے جام شریعت، بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

"یا تو وہ حالت تھی کہ غصے میں آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے یا دفعتہً منہ سے پھول جھڑنے لگے، مسکرائے، ہنسے، قہقہہ لگایا، پھڑک اٹھے اور جوش میں آکر مجھے گود میں اٹھا کر سارے ہال میں گھومتے پھرے لاہور سے کسی جلسے میں شرکت کی دعوت آئی تھی جس کا جواب دفتر سے جا رہا تھا کہ کام کی کثرت کے باعث شرکت سے معذوری ہے۔ شعر سننے کے بعد فوراً حکم دیا کہ وہ جواب نہ دیا جائے بلکہ تار دیا جائے کہ آج شام کو چل کر کل لاہور پہنچوں گا۔ چنانچہ جلسے میں پہنچ کر دورانِ تقریر میں الہلال کے الزام کا نہایت مسترح مسکت جواب دیا، اپنی بظاہر تبدیلی کی توجیہ کی اور معشوق والا شعر پڑھ کر اس کے جواب میں سعدی کا شعر نہایت مزے لے لے کر پڑھا کہ ہم پر الزام دیا جاتا ہے کہ ہم نے دونوں فریق کا دل رکھا، حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جس طرح دونوں رایوں میں تطابق کیا اور جام و سنداں کو لڑا کر ترنم پیدا کیا ہر ہوسناک کا دماغ نہیں کہ اسے سمجھ بھی سکے۔"

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی

مولانا محمد علی اور علامہ سید سلیمان ندوی

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر (پیدائش ۱۸۷۸ء) جدید ہندوستان کی سیاست ملی کے ایک اہم ستون، قافلۂ حریت کے سالار، تحریک خلافت کی جان، ترک موالات کے روح رواں اور شمع اسلام کے ایک دیوانہ وار پروانے تھے۔ وہ مبدأ اول سے بڑی مختصر مدتِ حیات (۵۲ سال) ساتھ لائے تھے، اور اس میں بھی ان کی سیاسی زندگی کی عمر کل بیس سال (۱۹۱۱ء تا ۱۹۳۱ء) پر مشتمل تھی۔ اور اس کا بھی کچھ حصہ[1] قید و بند کی نذر ہوا۔ لیکن اس مختصر عرصۂ حیات میں انھوں نے ملکی و ملی سیاست میں جو تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے وہ بلاشبہ عدیم النظیر ہے۔

محمد علی کو شہرت عام محض ایک عظیم قومی و سیاسی لیڈر کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑی جامع اور ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی ذات بیک وقت سیاست و قیادت، شعر و سخن، ادب و انشاء اور خطابت و صحافت کا سنگم تھی۔ وہ صحیح معنوں میں مومن کامل تھے جس کا عقیدہ تھا کہ "دنیا کے تمام اہل ایمان جسد واحد کے مانند ہیں، اگر اس کے کسی ایک عضو کو بھی اذیت پہنچے تو تمام جسم درد و تکلیف محسوس کرے" چنانچہ محمد علی کی پوری زندگی اس عالم ارضی کے گوشے گوشے کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جد و جہد میں گذری۔ ان کی تمام تگ و دو کا محور اور حاصل صرف اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی تھا۔ واقعات شاہد ہیں کہ دنیا کے کسی حصے میں اگر کسی مسلمان کے پھانس بھی چبھی تو محمد علی نے اپنے دل میں اس کی نشتریت محسوس کی اور پھر وہ دیوانہ وار

[1] مولانا کو دو مرتبہ قید و بند کی سزائیں ملیں۔ پہلی مرتبہ تقریباً پونے پانچ سال کی، وسط مئی ۱۹۱۵ء سے آخر دسمبر ۱۹۱۹ء تک اور دوسری مرتبہ دو سال کی، ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء سے ۲۹ اگست ۱۹۲۳ء تک (مدیر معاون)

اس کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔

پیش نظر مضمون میں راقم کا مقصد مولانا محمد علی کی فعال اور سراپا عمل شخصیت اور ان کی وسیع الاطراف سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ لینا نہیں ہے کہ اس کے لیے تو ایک سفینے کی ضرورت ہے بلکہ ان محدود صفحات میں مولانا محمد علی اور سید سلیمان ندوی کے باہم علمی تعلقات کی یاد تازہ کرنی ہے تاکہ مرحومین کی شخصیت اور انسانی محاسن کے بعض مستور گوشے روشن ہو سکیں۔

علامہ شبلی اور محمد علی

علامہ سید سلیمان ندوی (پیدائش ۱۸۸۴ء) کو مولانا محمد علی سے جو گہرا قلبی تعلق تھا اس کی بنیاد علمی و سیاسی ذوق کی ہم آہنگی کے علاوہ مولانا شبلی سے تلمذ کا اشتراک بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کے تمام احباب و تلامذہ کو ان کے علمی جانشین سید سلیمان ندوی اور دارالمصنفین سے ہمیشہ قلبی لگاؤ رہا ہے۔ مولانا محمد علی کو علامہ شبلی سے تلمذ کا شرف اس زمانے میں حاصل ہوا تھا، جب وہ علی گڑھ میں اسکول کے طالب علم تھے اور علامہ موصوف کالج میں دینیات کے استاد تھے۔ محمد علی نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں ایک جگہ اپنے زمانے کے علی گڑھ کالج میں دینیات کی تعلیم کے پست معیار اور زبوں حالی کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

> "اس عام گھپ اندھیرے میں علی گڑھ میں ایک روشن نشان بھی تھا۔ یہ ایک غیر معمولی جوہروں اور بالکل نئے ادبی نقطہ نظر کے مالک کالج کے پروفیسر تھے۔ جنھیں سرسید احمد خاں کالج میں کھینچ لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ موصوف کا اسم گرامی شبلی نعمانی تھا۔ اور آپ عربی و فارسی کے پروفیسر تھے۔ سیرت، شاعری اور تاریخ اسلام سے انھیں بے حد لگن تھی۔ آپ علی گڑھ میں فارسی اور عربی پر روزانہ جو عام لیکچر دیا کرتے تھے، وہ بڑے جاذب توجہ ہوتے تھے۔"[2]

محمد علی کو علامہ شبلی کے باضابطہ درسی لیکچر سننے کا تو موقع نہ مل سکا، مگر اسکول کے زمانۂ طالب علمی میں علامہ کے ان لیکچروں میں ایک عرصے تک باقاعدہ شرکت کی جو وہ ہر روز صبح کو تقریباً نصف گھنٹہ کالج کے بیشتر طلبہ کے سامنے قرآن کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے۔ ایک دن اتفاق سے محمد علی نے درس گاہ

[2] مولانا محمد علی، بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز۔ مرتبہ محمد سرور ص ۸۷

کے باہر کھڑے ہوکر علامہ شبلی کا درس قرآن سن لیا، اور پھر اس سے انھیں اتنا شغف اور دلچسپی پیدا ہوئی کہ وہ پابندی کے ساتھ روزانہ باہر ہی کھڑے ہوکر درس سننے لگے۔ مولانا شوکت علی نے، جو باضابطہ بیسرٹ طالب علم کی حیثیت سے اس درس قرآن میں شریک رہتے تھے، اپنے چھوٹے بھائی کے اس غیر معمولی شوق و شغف اور ساتھ ہی ان کی موزوں گوئی و سخن فہمی کا ذکر علامہ شبلی سے کیا۔ ان کو یقین نہ آیا اور حیرت ہوئی کہ گیارہ سال کا بچہ شعر گوئی کا ذوق رکھتا ہے۔ بہرحال انھوں نے محمد علی کا امتحان لینے کے لیے ایک مصرعہ دیا اور اس پر اشعار موزوں کرنے کو کہا۔ چنانچہ انھوں نے عروض کی پوری پابندی کے ساتھ تعمیل حکم کردی۔ پھر جب علامہ شبلی کو اپنے درس قرآنی سے محمد علی کی غیر معمولی دلچسپی کا علم ہوا تو انھوں نے ان کو کلاس کے اندر بیٹھ کر لکچر سننے کی اجازت دے دی۔ اور خود محمد علی کے الفاظ میں "اس طرح مجھے اس غیر معمولی مسرت سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا کہ پرنسپل کے ہال کے اندر بیٹھ کر کالج کے ایک انڈر گریجویٹ کی پوری شان کے ساتھ مولانا شبلی کا درس قرآن سن سکوں" [۳]

محمد علی کو قرآن مجید سے جو غیر معمولی عشق اور اس کے معانی و مطالب کے فہم و مطالعہ کا جو شوق عمر بھر رہا اس کی تخم ریزی دراصل علی گڑھ میں مولانا شبلی کے مذکورہ فیضان درس سے ہوگئی تھی۔ اسی خود نوشت سوانح میں ایک جگہ رقم طراز ہیں :-

"یہ صبح کے مختصر سے نصف گھنٹے تمام عمر میرے حافظہ میں محفوظ رہے چنانچہ بعد میں جب حکومت نے مجھے ایک ایسی کمیٹی میں نامزدگی کی عزت بخشی جس کے ذمہ ڈھاکہ میں ایک نئی طرز کی مقامی اور رہائشی یونیورسٹی کے سلسلے میں اور بالخصوص اس کے شعبۂ اسلامیات کے نصاب کے تعین کا کام کیا گیا تھا تو میں نے اس کمیٹی سے درخواست کی تھی کہ وہ مولانا شبلی کو آمادہ کرے کہ وہ ہمیں اس بارے میں اپنے خیالات سے مستفید کریں اور مولانا اس بات کے لیے خوشی راضی ہوگئے تھے چنانچہ جب وہ اس سلسلہ میں ڈھاکہ آئے تو میں نے ان کے نصف گھنٹہ روز کے وہ قرآن مجید کے درس انھیں یاد دلائے، انھیں بڑی خوشی ہوئی کہ مجھے اب تک ان کے وہ درس یاد ہیں چنانچہ ہماری سب کمیٹی نے فیصلہ کیا شعبۂ اسلامیات کے نصاب میں ترجمہ قرآن کو بھی رکھا جائے۔"

اس کے بعد محمد علی لکھتے ہیں :-

[۳] ایضاً صفحہ ۸

"جب جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی اور میں اس کا شیخ الجامعہ مقرر ہوا تو پہلے ہی دن سے میں نے اس امر کا اہتمام کیا کہ اس میں مولانا شبلی کے سے درس قرآن کا انتظام کیا جائے چنانچہ ہمارے ہاں تعلیمی دن کا آغاز ایک گھنٹے کے روزانہ درس قرآن سے ہوتا ہے جس میں قرآنی آیات کی مختصر تشریح کی جاتی ہے لیکن افسوس اس وقت یہ درس دینے کے لیے مولانا شبلی موجود نہ تھے۔"[۵۴]

مولانا محمد علی تا عمر علامہ شبلی سے اپنے تلمذ کی سعادت کا ذکر بصد افتخار و ناز کرتے رہے استاد کا نام لیتے ہی ان پر جذبہ تشکر و سرشاری کی عجب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ شبلی کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے احباب کے نام جو خطوط لکھے ان میں نہایت والہانہ انداز میں "میرے استاد مرحوم" اور "استاذی و مولائی مرحوم" لکھتے ہیں۔ مثلاً ایک خط مورخہ ۴ ستمبر ۱۹ء میں بیتول جیل سے سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"جب چھوٹوں گا مزار روضۂ استاد کے پھولوں کی خوشبو سے دماغ و روح کو معطر کروں گا ع
اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری"[۵۵]

۱۹۱۱ء میں کامریڈ کے اجرا کے بعد محمد علی ایڈیٹری کے ذریعہ سے لیڈری کے ایوان میں داخل ہو گئے اور ان کی شہرت و مقبولیت ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ علامہ شبلی اس وقت ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم اور رسالہ الندوہ کے مدیر اعلیٰ تھے۔ ایک عظیم محقق اور ادیب کی حیثیت سے ملک میں ان کا طوطی بول رہا تھا۔ اس زمانہ میں بھی استاد و شاگرد میں غیر معمولی ربط و اخلاص قائم تھا۔ محمد علی نے سید سلیمان ندوی کے نام چھندواڑہ کے زمانہ نظر بندی میں ۱۰ اگست ۱۸ء کو ایک تفصیلی خط لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شبلی کو سیرت نبوی اور عالمگیر، محققانہ کتابیں تالیف کرنے کی ضرورت و اہمیت کی طرف سب سے پہلے محمد علی ہی نے توجہ دلائی تھی۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

"یہ معلوم ہی ہے آپ سے اس کا ذکر بھی کیا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں مولانا و استاذنا شبلی مرحوم بڑودہ میری دعوت پر تشریف لائے اور میرے ہی پاس مقیم تھے تو میں نے اورنگ زیب کے متعلق کچھ لکھنے کی تحریک کی تھی اور مولانا کو بالآخر اورنگ زیب کے متعلق مزید تحقیق و تحریر پر راضی کر لیا تھا۔ اس زمانہ میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تو فرمائیے کہ سیرت نبوی کا کیوں انتظام نہیں فرماتے

---

[۵۴] محمد علی، بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز۔ مرتبہ محمد سرور ص ۸۱-۸۲
[۵۵] خطوط محمد علی صفحہ ۶۹

ہندوستان میں کون ہے جو کفار کے پے در پے مگر بے جا سے بے جا تر حملوں کا جواب دے گا ....

معلوم اس سے قبل مولانا مرحوم کو کتنے بار اس مقدس کام کا خیال آیا ہوگا مگر مزید گفتگو سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ میری تقریر نے اثر کیا۔ اور آخری فیصلہ کم از کم مسودہ ہی میں رہ کر رہ گیا۔ اس ملاقات و صحبت کا ثمرہ اُس اورنگ زیب کے متعلق الندوہ کے مضامین کا سلسلہ تھا جو مولانا نے محمد علی کو انگریزی جامہ پہنانے کے لیے خود اپنے قلم سے درست کر کے ارسال فرمائے ہیں اور میری ضد کے باعث کہ انگریزی میں میں ہی ترجمہ کروں گا مگر کہہ نہیں سکتا کہ کامریڈ کب فرصت دے۔

مولانا نے باوجود شکایت پیہم کے کسی دوسرے سے یہ کام نہیں لیا[1]

سید صاحب سے تعلقات کا آغاز

غرض علامہ شبلی اور مولانا محمد علی کے یہی گوناگوں روابط حضرت سید صاحب اور محمد علی کے بیچ فطرۃً اتصال ثابت ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے بڑے قدرداں تھے۔ محمد علی کو سید صاحب سے بڑی حد تک عقیدت تھی، جس پر ان کے خطوط شاہد ہیں۔ اس طرح حضرت سید صاحب بھی ان سے دلی محبت رکھتے تھے اور ان کی ذہانت، قابلیت، اخلاص اور دینی جذبے کے بڑے مداح اور معترف تھے، دونوں کی سب سے پہلی ملاقات ۱۹۱۳ء میں کلکتہ میں دفتر الہلال میں ہوئی تھی۔ حضرت سید صاحب اس وقت الہلال کے ادارتی اسٹاف میں شامل تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کامریڈ اور اس کے جادو نگار ایڈیٹر کے شباب کی بہار تھی، طرابلس اور بلقان کی جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ مولانا محمد علی نے کامریڈ میں ترکوں کی حمایت میں ایک مضمون " مقدونیہ آؤ اور میری مدد کرو " شائع کیا تھا۔ جسے حکومت نے قابل ضبطی قرار دیدیا۔ ماہرین قانون کے مشورے پر محمد علی اس حکم کے خلاف کلکتہ ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کرنے کے سلسلہ میں کلکتہ آئے تو الہلال کے دفتر میں بھی تشریف لائے۔ حضرت سید صاحب اس پہلی ملاقات کے وقت کا ان کا حلیہ تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں " دیکھا تو بالکل صاحب۔ کوٹ پتلون، بوٹ، نکٹائی، داڑھی صاف، بڑی بڑی اٹھی ہوئی مونچھیں، سر پر ترکی ٹوپی، لمبا قد، گداز بدن، بھرا ہوا جسم، خندہ جبیں[2]"۔ اس کے بعد مئی ۱۹۱۳ء میں

---

[1] خطوط محمد علی ص ۵۹ [2] یادِ رفتگاں ص ۱۵۷

جب دارالعلوم ندوہ میں طلبہ کی مشہور زمانہ اسٹرائیک کا ہنگامہ برپا ہوا تو اس سلسلہ میں سید صاحب کو دہلی میں محمد علی سے ضرورتاً بار بار ملنا پڑا۔ اور ان ملاقاتوں سے دونوں کے روابط برابر گہرے ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ ۱۹۱۷ء سے جب محمد علی چھندواڑہ میں نظربند تھے، دونوں میں خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

علامہ سید صاحب علی برادران کی چھندواڑہ میں نظربندی کے زمانہ میں خاص ان سے ملنے کے لیے سفر کی صعوبت اختیار کر کے اور سیاسی فضا کی ناسازگی کے باوجود وہاں گئے تھے۔ اس سفر کی تفصیل خود سید صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

"آخر مارچ ۱۹۱۸ء میں ندوۃ العلماء کا اجلاس ناگپور میں تھا۔ میں شریک تھا وہیں سر راہ ایک گمنام بیکس ہمت زار سفیر نے آکر نظربندوں کا پیام سنایا، وہ وقت بڑا ہی سخت تھا جس کو آج قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال میں اور برادرم مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے بڑی احتیاط سے چھندواڑہ کا رخ کیا۔ صبح کو اس مسجد میں پہنچ کر جس میں یہ نظربند نماز پڑھتے تھے ان کو ڈھونڈھا تو نشان نہ پایا۔ مسجد کے مکتب میں کچھ لڑکے تھے ان سے پوچھا انھوں نے پتہ دیا تو ان کو لے کر ان کے بنگلے تک پہنچے۔ دیکھ کر دونوں بھائی بےحال ہوگئے گلے سے لگایا، ہاتھ چومے، منہ چوما، بلائیں لیں۔ غرض ہر انداز کا پیار کیا۔ دونوں صاحبوں کی زبان پر اس وقت یا قرآن شریف کی آیتیں تھیں یا اقبال کی مثنوی کے شعر اور رجی مو جیقاق جق جق یعنی گویا ترکی زبان بول رہے تھے کیا زمانہ تھا رات کو مسجد میں میری ایک مختصر تقریر ہوئی اس کی شرح میں محمد علی نے ایک لمبی تقریر کی۔ اس زمانہ میں ان کو کسی مہمان کو اپنے پاس شب باش ہونے کی اجازت نہ تھی اس لیے دن تو ان کے پاس گزرا اور رات کہیں اور بسر ہوئی۔"[1]

سید صاحب کا مضمون "نظربندانِ اسلام"

اس کے بعد تعلقات برابر بڑھتے اور گہرے ہی ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ ۱۹۱۹ء میں سید صاحب نے مولانا حسرت موہانی کی رہائی کی تقریب سے "معارف" کے کئی نمبروں میں "نظربندانِ اسلام" کے

---

[1] یادِ رفتگاں

عنوان سے ایک محققانہ مقالہ سپرد قلم کیا، جس میں زندانِ یوسفی سے لے کر مالٹا جزیرہ تک کے عہد بعہد اسیرانِ اسلام کی قید و بند اور عزیمت و استقامت کے واقعات نیز جرأت حق گوئی کی پاداش میں ان کو پہنچنے والی حبس و زنجیر کی صعوبتوں پر نہایت مؤثر انداز میں روشنی ڈالی تھی اس طویل سلسلۂ مضمون کی تیسری قسط (مارچ ۱۹۴۵ء) بعنوان "موجودہ نظربندانِ اسلام علمی و مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے" کو سید صاحب نے خاص سرزمینِ ہند پر دعوت و عزیمت کے علم بلند کرنے والے اسیرانِ اسلام کے لیے وقف کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے شیخ الہند مولانا محمود حسن، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی مولوی محی الدین اور علی برادران کی آزادی وطن کے لیے لطیف خاطر قید و بند کی تفصیلات قلم بند کی ہیں۔ اس مضمون کا مقصد و محرک آزادئ ہند کے لیے جد و جہد کرنے والے ابنائے وطن کو تسکین قلبی کا سامان بہم پہنچانا تھا کہ اسلام کی پوری روشن تاریخ ہر عصر و عہد میں مردانِ حق آگاہ کے ابتلاء و محن کے واقعات سے معمور ہے۔

مذکورہ بالا مضمون میں سید صاحب نے علی برادران کی سرفروشی اور استقامت و عزیمت پر بھی اظہار خیال فرمایا ہے جو چھندواڑہ کے مذکورۃ الصدر سفر کے چشم دید واقعات اور ذاتی مشاہدات پر مشتمل ہے۔ لکھتے ہیں کہ :-

" ان دونوں بھائیوں کی سوانح زندگی کا ایک ایک حرف اخبار بیں طبقہ کے سامنے ہے۔ جذبۂ ملت اور راہ میں سرفروشی اور جاں نثاری اگر علماء کرام سے ظاہر ہو تو ہم کہیں گے کہ انبیائے اولوالعزم، اصحاب کبار اور بزرگان دین کے کارنامے ان آنکھوں میں ہیں۔ بچپن سے جوانی تک اپنی تعلیم و تربیت کا زمانہ علماء و صالحین کے آغوش میں بسر کیا۔ لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم وہی جذبہ ملت پرستی وہی ذوق و شوق خدمت دین، وہی جذبۂ اخلاق نبوی ہم ان میں بھی پاتے ہیں۔ جنھوں نے نہ صرف غیر علماء کی گودوں میں تربیت پائی، بلکہ نامسلمانوں کے دامن تربیت میں پل کر جوان ہوئے اور رہے۔ اس تعلیم و تعلم کے زیر سایہ رہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی قومی و مذہبی روح کے قتل کرنے کا مسموم آلہ ہے۔"

" دلی کی جامع مسجد کا تماشائی ہیں جمعہ کے دن ان کے وداع عام کا منظر جن آنکھوں نے دیکھا ہے وہ اس کیف کو اب تک نہیں بھولے ہیں۔ چھندواڑہ ممالک متوسط کا وہ مقام تھا جہاں آغاز تبلیغ علم

سے ۱۹۱۲ء تک روحانی مناظر کا کوئی جلوہ فروغ جسم نہیں ہوا۔ نہ صرف اس چھوٹے سے ضلع میں بلکہ ممالکِ متوسطہ کے پورے احاطہ میں اسلام تنِ مردہ تھا۔ مسلمانوں میں نہ کسی بیدارگی اور موت تھی۔ لیکن ان دونوں بھائیوں کے ورود کے بعد نہ صرف چھندواڑہ بلکہ تمام احاطہ میں ایک روشنی سی جھلک اٹھی ہے۔ ان دونوں بھائیوں کے شرفِ صحبت نے بچے بچوں سے لے کر ضعیف العمر بڈھوں تک کو سرجوش بادۂ طہور بنا دیا۔ اور جس بے باکی اور بہادری کے ساتھ وہ اپنے فرائض ادا کرتے ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہے۔"

"محترم محمد علی کا زیادہ تر وقت کتابوں اور رسالوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ قوت فنا نہیں ہوتی۔ اگر یہ سچ ہے تو وہ قوت نطق جس کے استعمال پر ان کو قابو نہیں ہے، نغمات موزوں کی شکل میں نکل رہے ہیں۔ ان کی نظربندی سے پہلے شاید یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ تلمذِ رحمانی کا بھی شرف اور حسنِ سخن کا بھی جوہر رکھتے ہیں۔ ان کے حبسیات میں ہم کو وہ لطف ملتا ہے جو ابو فراس حمدانی (برادر سیف الدولہ حمدانی ملک الشام) کے رومی حبسیات میں ہے۔"

"محترم شوکت علی کا وہ زمانہ ہم کو یاد ہے جب سب سے پہلے ہم دونوں کو مدراس ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریب سے ریلوے سفر نے اتفاق سے یکجا کر دیا تھا۔ کچھ دیر کی بات چیت کے بعد جب میں نے نماز کی تیاری کی تو فرمایا کہ نماز پڑھنے کو میرا بھی دل چاہا کرتا ہے لیکن دقت یہ ہے کہ وضو سے قمیص کے کف خراب ہو جاتے ہیں۔ پھر سفر میں ہیٹ لگانے کی وجہ بیان کی کہ اس عجیب و غریب شے سے ریلوے دائرۂ حکومت میں رعب و استیلا خوب ہوتا ہے لیکن وہی شوکت علی ہیں کہ خدام کعبہ کے بعد بمبئی میں حاجیوں کے جہاز کے قلیوں کے دھکے کھاتے پھرتے تھے۔ پانچ چھ برس کے بعد دیکھا تو وہی خدام کعبہ کا سرکوٹ جس میں جابجا قدامت اور فرسودگی کے گل بوٹے کتر دیے ہیں، ان کے جسم پر ہے۔ وہ کف اور کالر جس کے ضائع ہو جانے کا خوف وضو سے مانع تھا، وہ ان کے لیے اب حلقۂ زنجیر ہے۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ کا واقعہ مجھے یاد آیا کہ یہ وہ تھے جو اسلام سے پہلے حریر و اطلس کی پوشاک پہنتے تھے لیکن اسلام کے بعد ان کے جسم مبارک پر صرف موٹے کمبل کا ایک ٹکڑا تھا۔"

چھندواڑہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے اور جو ہے وہ مفلس ہے۔ تاہم جس اسلام کے وہ پیرو ہیں اس کا نام بڑا ہے۔ ان دونوں بھائیوں کی کوششوں سے یہاں ایک عظیم الشان جامع مسجد کی بنا ڈالی جس کو نیم تعمیری حالت میں دیکھنے کی عزت مجھے بھی حاصل ہے۔ ان دونوں بھائیوں کو مصور سے دور بعض راستوں اور گلیوں میں غریب و مفلس مسلمانوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے کاسہ جس آنکھوں نے دیکھا، اس بادۂ سرشار کی مستی اب بھی ان میں باقی ہے۔ اس مسجد کا نام لوگ نہ جانے کیا رکھیں گے۔ میں تو اس کو "شوکت الاسلام" کہتا ہوں۔"

"مذہبی پاسداری، عام اخلاقی محاسن اور غربا کے ساتھ مساوات پسندی نے ان بھائیوں کو محبوب القلوب بنا دیا تھا۔ مسلمان اور ہندو دونوں ان سے محبت کرتے ہیں۔ راستہ میں ایک طرف سے السلام علیکم کی آواز آتی ہے، تو دوسری طرف سے بندے ماترم کا ترانہ سنائی دیتا ہے۔ حافظ ہوتے تو دیکھتے کہ ان کا حیاتی فلسفہ پانچ سو برس کے بعد عمل ہو گیا ع

با مسلماں اللہ اللہ · با برہمن رام رام

ان کی مذہبی وارفتگی اور ایمان کی تصویر دیکھنا چاہو تو ان کے منسنہ تحریر کی وہ چند سطریں پڑھو جو اپنی مسترد آزادی کے وقت حکومت کو دی تھیں۔ یقیناً یہ طرۂ امتیاز ان کے ناصیہ محاسن پر ہمیشہ کے لیے یادگار رہ جائے گا۔"[59]

دسمبر ۱۹۱۹ء میں اس طویل قید قفس سے رہائی کے بعد علی برادران بیتول جیل سے سیدھے امرتسر پہنچے، جہاں مجلس خلافت، مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس تینوں کے اجلاس ہو رہے تھے۔ کانگریس کی یہ وہ تاریخی کانفرنس ہے جس میں مولانا محمد علی نے اپنی تقریر میں کہا "میں جیل سے واپسی کا ٹکٹ لے کر آیا ہوں" اور یہ اثر آفریں فقرہ تمام ہندوستان میں اتنا مشہور ہوا کہ عرصہ تک اس کی گونج سنائی دیتی رہی۔ امرتسر سے فارغ ہو کر وہ اپنے پیر و مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے ملنے لکھنؤ آئے اور اسی موقع پر علی برادران کو فرنگی محل سے "مولانا" کی۔ قاعدہ اعزازی سند عطا ہوئی تھی۔[60] اور حقیقت یہ ہے کہ محمد علی نے اس

[59] معارف مارچ ۱۹۱۹ء [60] مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس "اعزازی ڈگری" کے واقعہ کے بارے میں "عالمانہ" کے ساتھ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں: "لکھنؤ کا عالمانہ یہی سفر تھا جب دونوں بھائیوں کو "مولانا" کی باقاعدہ آنریری ڈگری فرنگی محل (یا اس کے مدرسۂ عالیہ) سے عطا ہوئی۔" محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق (حصہ اول) صفحہ ۸۳۔ (مدیر معارف)

آنریری ڈگری کی لاج رکھ لی۔ اور دینی مطالعہ کر کے خود کو ثری سد تک مولانا سا بنا لیا تھا۔

وفدِ خلافت میں ساتھ

جلیانوالہ باغ کے خونیں واقعہ (اپریل ۱۹۱۹ء) کے بعد پورا ملک کوہ آتش فشاں بن گیا تھا۔ مجلس خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں اپنے عہد شباب میں داخل ہو چکی تھیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی نسیم پورے ہندوستان میں چل رہی تھی اللہ اکبر کے نعرے ہندوؤں تک کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ علی برادران نے گاندھی جی کے ساتھ ہندوستان کا طوفانی دورہ کر کے پورے ملک کو ترکِ موالات کے غلغلہ سے پرشور کر دیا تھا خلافت عثمانیہ کے خاتمہ سے مسلمانوں میں سخت بے چینی تھی[۱]۔ ان حالات میں مجلس خلافت نے اپنے اجلاس امرتسر (دسمبر ۱۹۱۹ء) میں طے کیا کہ ۱۵ جنوری ۱۹۲۰ء تک مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے متعلق مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنے کے لیے مولانا محمد علی کی سرکردگی میں ایک وفد انگلستان بھیجا جائے[۲]۔ اس وفد کے سکریٹری حسن محمد حیات مقرر ہوئے دوسرے اراکان میں سید حسین اور مولوی ابوالقاسم بنگالی کے ساتھ خلافت کی مذہبی ترجمانی کے لیے علامہ سید سلیمان ندوی کا انتخاب ہوا۔

بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحب اس وفد میں شرکت سے بوجوہ اجتناب کرتے تھے۔ مگر مولانا محمد علی کے پیہم اصرار اور ملّی مصالح کے پیشِ نظر بالآخر تیار ہو گئے۔ دراصل سید صاحب کا بنیادی ذوق خالص علمی تھا، اور ظاہر ہے سیاست کی ہنگامہ آرائیاں علمی مشاغل کی دشمن ہیں۔ اس لیے وہ عملی سیاست سے کنارہ کش رہنے کی کوشش کرتے تھے، چنانچہ بقول محترم مولف "تذکرۂ سلیمان"، خود سید صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:

> "میں نے کبھی اس خرقۂ مے آلود (یعنی سیاست) کو از خود نہیں پہنا۔ کبھی محمد علی نے پہنا دیا کبھی شوکت علی نے۔ اور جب کسی نے پہنا یا بھی تو میں فوراً اتار پھینکا ؎
>
> حافظ، خود نہ پوشیدا ایں خرقۂ مے آلود
>
> اے شیخ پاک دامن معذور دار ما را[۳]"

۱؎ شاہ معین الدین ۔ حیات سلیمان ص ۱۷۵ ۲؎ رئیس احمد جعفری ۔ علی برادران ص ۲۳۴

۳؎ غلام محمد تذکرۂ سلیمان ص ۵۸

اسی طرح جب علامہ سید صاحب کانگریس کے اجلاس ناگپور (۱۹۲۲ء) میں آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے تو آپ نے ایک عزیز کو لکھا کہ " ملا توضیح یہ عزت میری قسمت میں آئی مگر سچا عتراف ہے کہ مجھے ایک ذرہ خوشی نہیں ہوئی اور ہر وقت اپنے رقیبوں کے لیے اس جگہ کو خالی کرنے کے لیے تیار ہوں مگر صرف محمد علی کی وصیت اور ڈاکٹر انصاری کا امتثال امر ہے[۲۳] "

بہرحال ۱۹۲۰ء کا " انڈین خلافت ڈیلیگیشن " پورے آٹھ ماہ تک یورپ کے مختلف ملکوں میں سرگرم عمل رہا۔ لندن میں وزیراعظم لائڈ جارج، لارڈ فشر اور دوسرے ممتاز لیڈروں سے ملاقاتیں کرکے خلافت و جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات و مطالبات کی وضاحت کی۔ اس وفد کی کارگزاری کی تفصیلات طوالت طلب ہیں اور ہمارے موضوع سے خارج بھی اس لیے نہیں قلم انداز کیا جاتا ہے۔ اس اجمال کا مقصد صرف بتانا ہے کہ وفد خلافت کی اس آٹھ ماہ کی ہم سفری اور شب و روز کی مصاحبت نے مولانا محمد علی اور حضرت سید صاحب دونوں کو ایک دوسرے کا بے حد گرویدہ اور قدرداں بنا دیا تھا۔ لندن کے دوران قیام میں جب سید صاحب نے مشہور انگریزی مجلہ " فارن افیرز " میں مسئلۂ خلافت پر ایک مدلل اور جامع مضمون لکھا تو مولانا محمد علی نے بار بار اس کی تعریف و تحسین کی۔ اسی طرح وفد خلافت جب ہندوستان واپس آیا تو یہاں کے بعض حلقوں میں مولانا محمد علی اور ان کے رفقائے وفد کی یورپ میں فضول خرچیوں اور قومی دولت کے اسراف بے جا کے الزامات کا ہنگامہ گرم ہوا۔ اس وقت مرکزی خلافت کمیٹی نے " حسابات وفد خلافت " کے نام سے ایک مختصر کتاب شائع کی۔ جس میں خلافت ڈیلیگیشن کے واقعی مصارف کی پوری تفصیلات درج ہیں۔ اس کے شروع میں علامہ سید سلیمان نے ایک مقدمہ سپرد قلم کیا ہے۔ جس میں وہ ایک جگہ مولانا محمد علی کے بارے میں لکھتے ہیں :-

> " ہمارے رئیس وفد کو حسابات کی ترتیب اور درستگی میں اس قدر اہتمام بلکہ غلو تھا کہ کبھی کبھی ان کے ساتھ کے (ملا) کو غصہ آجاتا تھا۔ ان کے ہاتھ سے جو اخراجات ہوتے تھے وہ روزانہ ان کو اپنی نوٹ بک میں درج کر لیتے تھے۔ اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی فرض تھا کہ اپنے پروانہ رفقائے سفر کے اخراجات کو یاد رکھیں اور رات کو سوتے وقت

---

[۲۳] مکتوب بنام سید عبدالحکیم دسنوی معارف ستمبر ۱۹۵۳ء ص ۲۳۰

جب بنئوں کی طرح وہ دن کا حساب بند کرنے بیٹھتے تھے تو حقیقت یہ ہے کہ ان کی یادداشت پر تعجب ہوتا تھا۔"[۱۵]

محمد علی اور دارالمصنفین

دارالمصنفین کا قیام ۱۹۱۴ء میں عمل میں آیا تھا اس وقت تک جنگ عظیم کا ہنگامہ کارزار گرم ہو چکا تھا۔ مولانا محمد علی کے شہرۂ آفاق انگریزی اخبار "کامریڈ" اور اردو روزنامہ "ہمدرد" کی ہر طرف دھوم مچی ہوئی تھی۔ ہمدرد اخبار بلاشبہ اردو صحافت کی تاریخ میں ظاہری و معنوی دونوں حیثیتوں سے ایک نئے باب کا اضافہ تھا۔ دارالمصنفین کی تاسیس تک مولانا محمد علی صحافت کی راہ سے مسلمانوں کی عوامی قیادت کی زمام سنبھال چکے تھے۔ اور ان کی گوناگوں و متنوع مصروفیات روزافزوں ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر ۱۹۱۵ء کا وسط ہوتے ہوتے وہ قید و بند کی آزمائشوں میں مبتلا ہو گئے، جس کا سلسلہ تقریباً پانچ سال تک ممتد رہا۔ اس دوران میں مولانا محمد علی کے دل میں اپنے استاذ کی علمی یادگار دارالمصنفین کی زیارت کی تمنا برابر پیدا ہوتی رہی، جس کا اندازہ سید صاحب کے نام چھندواڑہ سے ان کے نام ایک خط مورخہ ۱۲ جولائی ۱۹۱۷ء کے درج ذیل اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔

"آپ کو تو غالباً معلوم ہوگا کہ دارالمصنفین کی تحریک میں نے ہی کانفرنس میں بمقام راولپنڈی کی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مجھے اس تحریک سے کس قدر دلچسپی ہے۔ افسوس ہے کہ جب ریلوہ لگایا گیا میں نظربند ہونے کے قریب ہی تھا اور اب جب کہ یہ بار آور ہو رہا ہے اسی طرح نظربند ہوں۔ تاہم اس کے حالات اور ضروریات سے مطلع فرماتے رہیں۔ میں جن تصانیف یا تراجم کی ضرورت محسوس کروں گا اس کے متعلق لکھتا رہوں گا۔ تاکہ آپ حضرات کو فرصت ہو تو اس طرف متوجہ ہوں۔"[۱۶]

اسی طرح مولوی جیل سے مولانا شوکت علی اپنے ایک خط مورخہ ۵ نومبر ۱۹۱۹ء میں مولوی مسعود علی ندوی کو لکھتے ہیں۔

---

[۱۵] رئیس احمد جعفری سیرت محمد علی ص ۲۸۷

[۱۶] خطوط محمد علی ص ۵۵

"محمد علی کا مستقل ارادہ ہے کہ حسب خدا کی دی ہوئی آزادی ہم کو ملے گی تو والدہ کی خدمت ضروری سے جلد تر فارغ ہو کر سیدھے اعظم گڑھ آئیں اور وہاں قیام کر کے پوری محنت کے ساتھ اپنی انگریزی کی قابلیت اللہ کی راہ میں صرف کریں۔ سیرت نبوی کو انگریزی جامہ پہنا کر پیام حق یورپ کے کانوں تک پہنچائیں۔"[۱۷]

مولانا محمد علی نے سید صاحب کے نام متعدد خطوط میں اپنی اس آرزو کا اعادہ کیا ہے کہ "جب چھوٹوں گا فوراً روضۂ استاذ کے پھولوں کی خوشبو سے دماغ و روح کو معطر کروں گا۔" حضرت سید کے برابر انھیں ان کا یہ وعدہ یاد دلاتے رہے اور بالآخر مارچ ۱۹۲۱ء میں محمد علی کی یہ دیرینہ آرزو شرمندۂ تکمیل ہوئی، دارالمصنفین میں ان کی آمد و روانگی کا ذکر سید صاحب نے معارف کے شذرات میں بڑی اہمیت اور عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

"یکم مارچ ۱۹۲۱ء کو سالہا سال کے وعدوں کے بعد محترم[۱۸] محمد علی نے شبلی منزل کو رونق بخشی، وہ اس وقت سے جب نظر بند تھے یہ وعدہ کر چکے تھے کہ آزاد ہو کر وہ سب سے پہلے دارالمصنفین میں آئیں گے اور چھ مہینے اس گمنام مقام کے کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر عربی کی تکمیل اور سیرت نبویؐ کا انگریزی ترجمہ کریں گے۔ لیکن آزادی کے ساتھ جو اطمینان شکن اور امن کش واقعات پیش آئے وہ سب کے سامنے ہیں۔"

"بہرحال میرا یا وعدہ کسی نہ کسی صورت میں یکم مارچ کو پورا ہوا۔ ہزارہا آدمی استقبال کے لیے شاہ گنج سے اعظم گڈھ (۲۳ میل) اور شہر اعظم گڈھ کے ناکہ سے شبلی منزل تک (۲ میل) موجود تھے۔ شبلی منزل پہنچ کر سب سے پہلے وہ استاذ مرحوم (مولانا شبلی) کی قبر پر گئے اور پھولوں کے وہ ہار جو قدردانوں نے ان کے گلے میں ڈالے تھے قبر کے ایک گوشے میں ڈال دیے۔ اس کے بعد انھوں نے دارالمصنفین کی "خانقاہ" میں ایک دن ٹھہر کر مختلف شعبوں کو دیکھا اور دوسری شام کو علی گڑھ واپس چلے گئے۔"[۱۹]

دارالمصنفین سے اسی غایت تعلق کے باعث اس کی علمی سرگرمیوں سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ ایسی

---

۱۷ معارف اکتوبر ۱۹۲۰ء ص ۲۷
۱۸ سید صاحب کی خواہش تھی کہ "مسٹر" کی جگہ اس لفظ کو رواج دیا جائے۔" معارف مارچ ۱۹۲۱ء
۱۹ شذرات معارف مارچ ۱۹۲۱ء ص ۱۶۲

گوناگوں قومی و سیاسی مصروفیات کے ہجوم میں جب کبھی انھیں فرصت کے لمحات میسر آتے وہ دارالمصنفین کی جدید مطبوعات کا بہت شوق سے مطالعہ کرتے۔ رسالہ معارف سے انھیں ایک خاص انس تھا اس کی مجلدات محفوظ رکھنے کا بہت اہتمام کرتے تھے سید صاحب کو خطوط لکھ کر تحقیق و تالیف کے جدید عصری تقاضوں اور نئے نئے میدانوں کی نشان دہی کرتے۔ علمی مشورے دیتے اور یہاں کی نئی کتابوں کے عالمانہ مطالعے سے ابھی بے لاگ مگر مخلصانہ رائے سے مطلع کرتے چنانچہ جس وقت ارض القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے مولانا محمد علی چھندواڑہ میں نظربند تھے سید صاحب نے ان کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کے لیے وہیں یہ کتاب بھیج دی۔ اس کی رسید وصول یابی میں وہ سید صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"اس زمانے میں ارض القرآن جیسی کتاب کی سخت ضرورت درپیش تھی۔ میرا تو گمان ہے کہ خداوند کریم نے آپ کو صرف میری ضرورت کے دور کرنے کے لیے اس کی تصنیف پر آمادہ کیا۔ جب یہ ہے تو مجھ سے زیادہ کون مشکور و ممنون ہوگا۔ یہ محض بیعانہ ہے۔ اصل قیمت پڑھنے کے بعد ادا ہوگی"[۱]

پھر ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :-

"مسعود صاحب سے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ صحابۂ کرام کے متعلق ایک تالیف تیار ہے مگر طباعت میں کیوں دیر ہے بھائی یہ تعویق تو ہم لوگوں پر جبر ہے۔ کیا ایسی کتابوں کے بکنے میں دقت پیش آتی ہے واللہ ارض القرآن جیسی کتاب کے لیے تو ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو جس کی آمدنی سو روپے ماہوار کی ہے کم از کم پچیس روپیہ دینا ضروری ہے اور سیرت کے لیے تو ہر شخص کو ایک ماہ کی آمدنی دینا لازمی ہے ہم لاکھ نادار سہی مگر اتنے بھی نادار نہیں ہیں کہ سال میں بیس پچیس روپیہ ایسی کتابوں کی خریداری کے لیے نہ نکال سکیں"[۲]

۴ ہر ستمبر ۱۹۱۹ء کو بیتول جیل سے مولوی مسعود علی ندوی کو سید صاحب کی کوتاہ قلمی کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"برادرم سید سلیمان صاحب کے محبت نامہ کا اب تک انتظار ہے مگر شکایت نہیں۔

---

[۱] خطوط محمد علی ص ۴۵

[۲] خطوط محمد علی مرتبہ محمد سرور ص ۸۳

کیونکہ اس عرصہ میں میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد بھی ختم کر ڈالی سلیمان صاحب اسی طرح کتابیں لکھتے رہیں اور ساری عمر بھی خط نہ لکھیں تب بھی تو شکایت کا موقع نہ ہوگا بلکہ مشکوریت کا سلسلہ جاری رہے گا۔[۲۲]"

سیرت النبی جلد اول کی اشاعت کی خبر ملتے ہی اس کی دید و مطالعہ کے اشتیاق سے بے تاب ہو کر سید صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"کل شام ہی معارف دیکھنے میں آیا اور سیرت کی پہلی جلد تیار ہو جانے کا مژدہ سنا اب بھی اگر آپ ایک جلد ارسال نہ فرمائیں گے تو نقض کیجئے میں رسی تڑا کر خود اعظم گڈھ آکودوں گا اور دار المصنفین میں وہ ہڑبونگ مچاؤں گا کہ آپ حضرات اہل قلم کی محبوبہ یکسوئی کا خاتمہ ہو جائے گا۔[۲۳]"

وہ رسالہ معارف کے بلند علمی و تحقیقی معیار کے دل سے معترف تھے۔ اس کی مکمل فائلوں کو جلد کرانے کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ ۴ ستمبر ۱۹۱۸ء کو ایک خط میں سید صاحب کو تحریر کرتے ہیں:۔

"اب تک میرے متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں اور ممکن ہے میرے عزیز دوست اور ساری کتب سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے اکثر پر قبضہ بھی کر چکے ہوں یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرائی جائیں۔[۲۴]"

دار المصنفین کے اولیں ناظم امور انتظامی مولوی مسعود علی ندوی تحریک خلافت کے ممتاز کارکنوں اور علی برادران کے مخصوص مخلصین میں تھے۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۱۸ء کو مولانا محمد علی نے بیتول جیل سے ایک طویل خط لکھا تھا۔ اس کی ہر سطر دار المصنفین کی حاشیہ نشینی پر احساس فخر اور سید صاحب کے گوناگوں فضائل و کمالات کے ذکر سے معمور ہے۔ اسی خط میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"دار المصنفین کسی ایک شخص کا نام نہیں۔ اور اگر نام بھی ہو تب بھی شبلی مرحوم میں ان کی تمام علمی وراثت شامل ہے اور اب اسی طرح سید سلیمان ندوی میں سارا دار المصنفین

---

[۲۲] خطوط محمد علی مرتبہ محمد سرور ص ۸۵

[۲۳] ایضاً ص ۵۸

[۲۴] ایضاً ص ۶۰

اور تمام ندوہ شامل ہے۔[25]"

معارف اور محمد علی

حضرت سید صاحب نے دارالمصنفین کے ماہانہ آرگن "معارف" کے شذرات (اداریہ) کو علی برادران کی سیاسی و اخلاقی حمایت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ چنانچہ جب مولانا محمد علی تقریباً پانچ سال (مئی ۱۹۱۵ء تا دسمبر ۱۹۱۹ء) تک ملک کے مختلف مقامات مثلاً مہرولی، لینسڈون، چھندواڑہ اور بیتول میں قید و بند کی آزمائشوں میں مبتلا رہے اور ان کی جاں نثاری کا دم بھرنے والے مسلمانوں پر عزت و حمیت کی کوئی حرکت نہ پیدا ہو سکی۔ تو سید صاحب نے اکتوبر ۱۹۱۸ء کے معارف میں بڑی جرأت اور دکھ کے ساتھ لکھا کہ:۔

"مسلمانوں کی ترقی اور تنزلی کا ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے ان کا وقتی اور فوری جوش۔ وہ سیلاب کے مانند پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں۔ لیکن کوہ کن کی طرح ایک ایک پتھر جدا کر کے راستہ صاف نہیں کر سکتے وہ بجلی کی مثل ایک آن میں خرمن کو خاک سیاہ کر سکتے ہیں۔ لیکن چیونٹی کی طرح ایک ایک دانہ نہیں ڈھو سکتے وہ ایک مسجد کی مدافعت میں اپنا خون پانی کی طرح بہا سکتے ہیں۔ لیکن ایک منہدم مسجد کو دوبارہ بنانے کے لیے مسلسل کوشش جاری نہیں رکھ سکتے ہیں یہ ان سے ممکن تھا کہ محمد علی اور ابوالکلام کے دائیں بائیں گر کر جان دے دیتے۔ لیکن یہ ان کے بس کی بات نہیں کہ وہ مسلسل آئینی جدّو جہد سے ان اسیرانِ اسلام کو چھڑا لائیں ؎

ما بہ طینت آدم زخمیر دگر است | تو توقع ز گِل کوزہ گراں میداری

مسز اینی بسنٹ چھوٹ سکتی ہیں کہ اس کی آزادی کے لیے وہ قوم بیتاب تھی جو اپنی مسلسل اور پائیدار کوششوں سے برطانیہ کے پُرعظمت اور ذخار سمندر کے کناروں کو ہلا سکتی ہے اور اس وقت تک ہلا تی رہ سکتی ہے جب تک گوہرِ مقصود اس کے ہاتھ نہ آجائے لیکن مسلمان دو ہی کام کر سکتے ہیں یا اس پُرخطر دریا میں کود کر اپنی جان گنوا دیں یا اس میں پیل کر پانی کی صاف و شفاف سطح کو گدلا کر دیں۔[26]"

---

[25] خطوط محمد علی مرتبہ محمد سرور ص ۸۵

[26] شذرات معارف اکتوبر ۱۹۱۸ء ص ۲۴۲

اسی طرح "ہمدرد" مالی خسارے کے باعث بند ہوگیا تو سید صاحب نے اسے ایک عظیم المیہ قرار دیتے ہوئے دل کھول کر اس کا ماتم کیا اور ہمدرد کی قومی و صحافتی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ لکھتے ہیں۔

" ملک کے تمام لوگوں نے اس خبر کو افسوس کے ساتھ سنا ہوگا کہ مولانا محمد علی نے اپنا روزانہ اخبار ہمدرد اس بنا پر بند کر دیا کہ اس کے خریداروں کی تعداد اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ وہ اخبار کی اشاعت کا بار اٹھا سکتی۔ مولانا محمد علی کے مسلک اور مشرب سے جس کسی کو بھی اور جس قدر بھی اختلاف ہو تاہم اس اظہار میں باک نہیں کہ ہمدرد تنہا اردو کا روزنامہ تھا جس کا اصول عوام پرستی کے سیلاب میں بہا نہیں، بلکہ اپنے مسلک پر عوام کو چلانا تھا۔ وہ تفریح و قہقہہ کا اخبار نہ تھا بلکہ عوام اور اردو دانوں کو سیاسی مسائل سکھانے والا نصاب درس تھا۔ اس میں خبریں اپنی تبلیغ، پروپیگنڈے اور خریداری بڑھانے کے اصول پر نہیں شائع ہوتی تھیں۔ بلکہ ملک کو حقیقت و واقعیت سے باخبر رکھنے کے لیے اس کے مضامین صرف دور از کار انشاپردازی اور بے معنی لفاظی سے پاک ہوتے تھے اس کے مقالے معلومات سے لبریز، دلائل سے معمور اور سنجیدگی و متانت کے معیار پر پورے ہوتے تھے، بازاری لطائف و ظرائف، عامیانہ پھکڑ اور بے سلیقہ الفاظ سے وہ پاک ہوتا تھا۔ اس کی ناکامی نے یہ افسوسناک حقیقت ثابت کر دی کہ مسلمان اب تک سنجیدہ متین اور باوقار لٹریچر کی قدر دانی کے لیے تیار نہیں۔[۲۷]"

حضرت سید صاحب معارف میں وقتاً فوقتاً مولانا محمد علی جوہر کا کلام بھی شائع کرتے رہتے تھے چونکہ بقول سید صاحب " محمد علی کی شاعری کا جوہر قیدخانہ میں جاکر کھلا[۲۸]" تھا۔ اس لیے ان کا بیشتر کلام حبسیات پر مشتمل ہے یعنی قفس محبس میں ان کے جو واردات قلبی نغمات موزوں بن کر اشعار کا روپ اختیار کر لیتے تھے، انہیں وہ سید صاحب کی خدمت میں ارسال کر دیتے تھے۔ مثال کے طور پر ۱۹۱۷ء میں جب وہ چھندواڑہ جیل میں تھے تو وہ ماہ رمضان المبارک میں " الوداع" کے عنوان سے تیرہ اشعار کی ایک نظم لکھ کر بھیجی اور اس کے ساتھ یہ بھی تحریر کیا کہ " چند اشعار بے ساختہ زبان پر آگئے۔ نذر خدمت کرتا ہوں۔ یہ شب قدر کی بیداری اور یوم وداع کا تحفہ ہے۔" سید صاحب نے یہ نظم معارف اکتوبر ۱۹۱۷ء میں "زندانیوں کا وداع رمضان" کے عنوان سے شائع کی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

۲۷ھ معارف اپریل ۱۹۲۹ء ص ۲۴۲

۲۸ھ معارف فروری ۱۹۲۲ء ص ۱۵۶

الوداع اے ماہِ رمضان الوداع — بہترین غم گساراں الوداع
تجھ میں اترا آخری پیغام حق — تو ہی تھا شایانِ قرآں الوداع
قیس و تنہائی کی رونق تجھ سے تھی — اے شریکِ بزمِ زنداں الوداع
دور کر دی تو نے ظلمت قید کی — تجھ سے ہر شب تھا چراغاں الوداع
کاروانِ خیر و برکت چل دیا — رہ گئے سب دل میں ارماں الوداع

اسی طرح دسمبر ۱۹۲۲ء کے معارف میں "عاشق رسول قیدی کی فریاد۔ زندانِ بیجاپور میں" کے عنوان سے جوہر کی سات اشعار کی ایک نظم شائع کی، جس کے نمونے کے اشعار یہ ہیں ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں — اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت — اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں — بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں
بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منایا کر — ٹلتی نہیں جوہر اس دیس کی برساتیں

پھر نومبر ۱۹۲۲ء کے معارف میں سید صاحب نے بیس اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم "کلامِ جوہر" کے عنوان سے شائع کی جس پر ایک سطری یہ ادارتی نوٹ بھی تحریر فرمایا:۔

"جناب جوہر کا یہ کلام ان کی آزادی سے پہلے آزاد ہو کر ہمارے پاس پہنچا تھا۔"

اس طویل نظم کے چند منتخب اشعار پیشِ خدمت ہیں:۔

یاں تو ہے نام عشق کا لینا — اپنے پیچھے بلا لگا لینا
ہم پھریں تجھ سے یہ نہ ہو یارب — اس سے پہلے ہمیں اٹھا لینا
آج جی بھر کے دیکھ لینے دو — کل کو دل کھول کر سنا لینا
وصل کی شب نہ چھیڑ قصۂ ہجر — یہ کسی اور دن سنا لینا
ان کے در سے زکوٰۃ حسن اگر — گالیاں بھی ملیں تو کھا لینا
تم کو زیبا نہ تھا وداع کے وقت — آنکھ جوہر سے یوں چرا لینا

وفد حجاز میں معیت اور اختلاف رائے

مولانا محمد علی اور حضرت سید صاحب کے درمیان یہ مثالی تعلق خاطر موتمر اسلامی کے انعقاد تک قائم رہا۔ سلطان عبدالعزیز بن سعود نے ۱۹۲۶ء میں یہ موتمر حجاز میں جمہوری حکومت کے قیام اور اس کے نظام پر اصلاح دستور سے پیر حرمین کی حفاظت و اہل حرمین کی خدمت اور حجاج کرام کی راحت و آسائش کے وسائل پر غور و فکر کے لیے طلب کی تھی۔ ہندوستان سے بعض دوسری سیاسی و مذہبی تنظیموں کے ساتھ خلافت کمیٹی کے نام بھی دعوت نامہ آیا تھا۔ چنانچہ اس موتمر میں شرکت کے لیے سید صاحب کی قیادت میں مجلس خلافت کا چار رکنی وفد تشکیل پایا۔ دوسرے ارکان وفد میں علی برادران اور شعیب قریشی شامل تھے۔ وفد کے مکہ پہنچنے تک اس کے تمام ارکان حرم کے آثار و مشاہد کے انہدام اور مسائل حجاز میں بظاہر فکری طور پر ہم آہنگ تھے۔ لیکن موتمر کے دوران میں یہ اتفاق رائے قائم نہ رہ سکا۔ اور حضرت سید صاحب کی رائے ابن سعود کی ملوکیت اور انہدام مقابر کے بارے میں وفد کے دوسرے ارکان سے مختلف ہوگئی۔ جانبین کا موقف مدلل اور مبنی بر اخلاص تھا۔ اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ سید صاحب نے اپنی طبعی شرافت و مروت کے باعث اس امر پر برملا اختلاف و کشاکش پیدا کرنے کے بجائے ہندوستان کی واپسی کے بعد سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

مولانا محمد علی نے اس سلسلہ میں بعض ایسے مضامین لکھے اور بیانات دیے جن سے سید صاحب کو اتفاق نہ تھا۔ لیکن اس کا جواب دینے کے بجائے وہ خاموش رہے۔ محترمی صباح الدین صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:-

> "اسی زمانے میں سید صاحب دہلی تشریف لے گئے تو مولانا محمد علی سے ملاقات ہوئی۔ سید صاحب نے اثنائے گفتگو میں ان سے کہا کہ آپ چاہے جیسے بھی مضامین لکھیں یا بیانات دیں میں خاموش ہی رہوں گا۔ مولانا محمد علی نے برجستہ کہا یہ مضامین اور بیانات تو آپ کو خاموش کرنے ہی کے لیے شائع کئے جا رہے ہیں۔ اس حاضر جوابی سے سید صاحب خود بھی محظوظ ہوئے اور کئی تاریخی صحبتوں میں اس کو دہرایا" (معارف سلیمان نمبر ص ۷۲)

تعلقات کا حسن خاتمہ

لیکن اس اختلاف رائے کے باوجود علامہ سید صاحب کے دل میں مولانا محمد علی کی محبت و گرویدگی اور محاسن و خوبیاں بدستور پیوست رہیں اور وہ آخر تک ان کی ذہانت وصلاحیت ادبی علمیت، اخلاقی جرأت، جذبۂ ملی اور سیاسی بصیرت کے بے حد مداح اور معترف رہے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۱ء میں جب انھیں ملت اسلامی کے اس صدی خواں کے انتقال کی خبر ملی تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ سید صاحب آبدیدہ ہو کر غایت اضطراب میں ٹہل ٹہل کر سکون پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور پھر اپنے خونِ جگر کی سرخی سے معارف کے صفحات پر وہ دردانگیز ماتم بپا کیا کہ اس کو پڑھ کر سخت سے سخت دل والے کا کلیجہ بھی منہ کو آ گیا۔

سید صاحب تقریباً نصف صدی تک اپنے احباب اور مشاہیر فضل و کمال کی وفات پر داستانِ غم رقم کرتے رہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ محمد علی کا ماتم ادب و انشا کا شاہکار، وفورِ جذبات کی معراج، اور غم و اندوہ کا ایک طوفان ہے۔ یہ صرف چند نثری سطور نہیں بلکہ فی الواقع سید صاحب کے دل و جگر کے ٹکڑے اور ان کے رشک رواں کا ایک سمندر ہے۔ ذیل میں اس مرثیہ منثور کے چند اہم اقتباسات کو مضمون کا حسن خاتمہ بنایا جاتا ہے، کیونکہ یہی درحقیقت مولانا محمد علی اور حضرت سید صاحب کے اٹھارہ سالہ تعلقات کا خاتمہ بالخیر بھی ہے:۔

"افسوس وہ پُر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۱ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ وہ بیقرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب ہو ہو جاتا تھا اور اوروں کو بے تاب کرتا تھا ذرا دیر کو قیامت تک کے لیے ساکن ہو گیا۔ وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، حسرتا کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔ وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوشنوا بلبل بن کر چہکتے تھے ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے۔ وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی اس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی۔ وہ پُرجوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہالے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کے لیے تھم گیا وہ پُرزور دست و بازو

جو شب و روز کی خدمت گزاری اور نبرد آزمائی میں مصروف تھے وہ اب ایسے تھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے۔ اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعداء کے نرغے میں تنہا لڑ رہا تھا آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہوگا۔ الوداع محمد علی' الوداع! وَالسلام إلیٰ یوم القیام۔"

" تو ملت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزادار رہے۔ تو امت محمدیہ کا سوگوار تھا۔ زمین سے گریویں امت محمدیؐ تیرا سوگ کرے۔ تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا سزاوار ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے ہندوستان کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار، عراق کے بے غمزدہ، بلقان کے لیے اشکبار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کا سوختہ غم اور بیت المقدس کے لیے وقف الم' اے ہند کے آوارہ گرد مسافر! تیرا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا۔ مناسب یہی تھا کہ تیرے لیے اولین قبلہ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور تو اس میں سما جائے۔"

" وہ مشرق کی زمین میں پیدا ہوا، لیکن مغرب کی آب و ہوا میں نشو ونما پائی۔ مشرق کی مٹی سے اس کا جسم بنا، لیکن مغرب کے ہتھیاروں سے اس نے اپنا جسم سجایا۔ اس کا دماغ مغربی مگر دل مشرقی تھا۔ وہ مشرق کی حمایت میں بارہا مغرب سے مغرب کے ہتھیاروں سے لڑا اور اس نے اس کا لوہا مانا۔ وہ مشرق کا آفتاب تھا۔ یہ آفتاب بھی اگر مشرق میں طلوع ہو کر مغرب میں ڈوبا تو دنیا کا کوئی نیا واقعہ نہ ہوا اور اسی لیے حق تھا کہ مشرق و مغرب کا متحدہ مرکز (بیت المقدس) اس کا مدفن بنے۔ اے مشرق و مغرب کے مالک! تو اپنی رضا مندیوں کے پھول سے اس کا دامن بھر دے۔"

(یادِ رفتگاں ص ۱۵۵-۱۵۶)

حکیم محمد حسین خاں شفا

جوہرِ ہند اور جوہریِ مصر

مولانا محمد علی جوہر نے دکھی دنیا اور درد مند انسانیت کے لیے جس طرح ایسا دل دکھایا اور مشرق وسطی کے مصائب و مشکلات میں گھرے ہوئے قافلہ کی جس جرأت و حوصلہ مندی سے قیادت کی اس کی نظیر آپ کے ہم عصروں میں کم ملے گی۔

آپ کی مثالی موت نے شاندار زندگی کو عظیم سے عظیم تر بنا دیا۔ مولانا کی اس خود پسندیدہ "موت و زیست" نے بعض انسانوں پر اتنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ اردو و انگریزی میں مولانا پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے اکثر جوہر شناس واقف ہیں عربوں نے جس طرح مولانا کی یاد کو سینہ سے لگا رکھا ہے اس سے مولانا کے اہلِ وطن کم آشنا ہیں۔ عرب دانشوروں میں مولانا کے مداح سیکڑوں تھے۔ مخالفین کی تعداد بھی کم نہیں تھی، مولانا اور علامہ رشید رضا ایڈیٹر "المنار" میں ہمیشہ چلتی رہی۔

مولانا کے انتقال کے بعد جس طرح عرب دانشوروں خصوصاً علامہ طنطاوی جوہری نے ان کو خراجِ تحسین پیش کیا، وہ تاریخ اسلام میں اپنی مثال آپ ہے۔ اور ہندوستانیوں کے لیے باعثِ فخر

قبل اس کے کہ میں علامہ طنطاوی جوہری کے نظریات مولانا کے متعلق بیان کروں، اچھا ہوگا کہ کچھ طنطاوی کے بارے میں بتا دیا جائے۔

طنطہ[1] مصر کا مشہور علمی شہر ہے اس شہر کی شہرت میں سید احمد بدوی علیہ الرحمۃ کے مزار طنطہ یونیورسٹی اور علامہ طنطاوی جوہری کی جائے پیدائش نے چار چاند لگا دیے ہیں۔

---

[1] آج کا مصر، از پروفیسر محمد حسن اعظمی مطبوعہ لاہور ۱۹۴۱ء صفحہ ۵۴، صفحہ ۵۵

مستی محوبؓ عالم اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں :-

" سکندریہ سے قاہرہ تک راستہ میں آٹھ دس اسٹیشن پڑتے ہیں جن میں طنطا سب سے بڑا ہے ۔ یہ جگہ مصریوں کی نظر میں ویسی ہی قابل احترام ہے جیسے ممالک مشرق کے مسلمانوں میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مزار ہے ۔"

سرزمین مصر میں علامہ طنطاوی جو حریت پسند بھی تھے اور اسلام دوست بھی، اس شہر کی عظمت کی یادگار تھے ۔ علامہ مفتی عبدہ کے شاگرد رشید تھے ۔ اور ان کے نظریات کو پھیلانے میں آپ نے تن من دھن کی بازی لگادی تھی ۔ ہندوستان سے آپ کو بے پناہ محبت تھی ۔ چنانچہ اپنی اکثر تصانیف میں علماء ہند اور ان کے نظریات کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا ہے ۔ آپ کا خیال تھا کہ ' ہندوستانی تہذیب یونان کے مذہب سے قدیم بھی ہے اور عظیم بھی ' وہ اپنے شاگردوں میں ہندوستانی طلبہ کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے ۔ علامہ کے ہندوستانی شاگرد حسن الاعظمی جو مصر یونیورسٹی میں پروفیسر بھی رہ چکے ہیں، اپنی کتاب " اسلام، مصر اور محمد عبدہ " کا انتساب ان کے نام اس طرح کرتے ہیں ۔ " علامہ طنطاوی جوہری مفسر قرآن کے نام جنھوں نے تحریک اخوت اسلامیہ مصر میں نمایاں حصّہ لیا اور مجھے اپنا روحانی فرزند بنانے کا شرف عطا کیا ۔"

اس کتاب میں حسن الاعظمی صاحب صفحہ ۲۰۴ پر لکھتے ہیں :-

" جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی دعوت و تحریک فطری اور عصری اصولوں پر قائم تھی ۔ اور جس حقیقی اسلام سے انھوں نے اہل علم کو روشناس کیا ان اصول اور نظریات کی اشاعت کے سلسلہ میں علامہ طنطاوی جوہری اور ان کی تصانیف کافی مشہور ہیں ۔

ڈاکٹر چارلس ایڈمز اور پروفیسر ہارٹمان نے آپ کی تین کتابوں ۔ التاج المرصع بجواہر القرآن و العلوم مطبوعہ ۱۹۱۱ء ۔ جمال العالم مطبوعہ ۱۹۱۱ء ۔ اور النظام والعالم کو عبدہ و جمال الدین افغانی کے سلسلہ کی تصانیف قرار دیا ہے ۔

سفرنامہ مستی محوت عالم مطبوعہ لاہور صفحہ ۹۱۴

مطبوعہ ۱۹۴۸ء کراچی

۳ اسلام اور تجدد مصر میں از ڈاکٹر چارلس ایڈمز ۔ مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور، ۱۹۵۸ء صفحہ ۲۴۹

علامہ کی دیگر کتابوں میں "الانسان" اور "تفسیر القرآن" کافی مشہور ہیں۔ طنطاوی مصر میں تعلیم کے اعلیٰ عہدہ پر فائز رہے ہیں۔

علامہ طنطاوی نے اس تفسیر کے اغراض و مقاصد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

"میں نے یہ تفسیر خدا کے بھروسہ پر اس امید کے ساتھ لکھی ہے کہ عام مسلمانوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹ جائے اور وہ علوم کونیہ "سائنسی علوم" پر غور و فکر کریں یہی ان کی ترقی اور برتری کا باعث ہے۔ یہ تفسیر مسلمان نوجوانوں میں آسمان و زمین کے عجائب و غرائب سے واقفیت کا شوق پیدا کرے گی۔ اور کتاب فطرت کے قوانین کی معرفت کی دعوت دے گی۔ اور اس امت میں ایسے افراد پیدا ہونے کا ماحول فراہم کرے گی جو یورپ والوں سے زراعت، طب، معدنیات، حساب، انجینئرنگ اور دیگر علوم و فنون اور صنعت و حرفت میں ترقی کر جائیں گے۔ اور کیونکر ایسا نہ ہو کہ قرآن میں وہ آیتیں جن میں علوم کا ذکر، یا ان سائنسی علوم کی طرف اشارے ہیں ساڑھے سات سو سے زیادہ ہیں اور خالص فقہی احکام کی آیتیں سو سے زیادہ نہیں، میں نے اس تفسیر میں وہ تمام باتیں بیان کی ہیں جن کی ضرورت مسلمانوں کو ہے انشاء اللہ یہ تفسیر آئندہ لوگوں کی ترقی کا سبب بنے گی جو آج زمین میں کمزور سمجھے جاتے ہیں۔"

علامہ انور شاہ صاحب کشمیری اس تفسیر کے بے حد مداح تھے۔ آپ فرماتے ہیں :۔

"اس میں آیات کریمہ سے متعلق جدید علوم و مسائل پوری تفصیل سے بیان کر دیے گئے ہیں۔"

سید سلیمان ندوی صاحب اس تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"حقیقت یہ ہے کہ اس تفسیر کی تالیف سے شیخ طنطاوی نے علوم عصریہ کے مقابلہ میں وہی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے جو آج سے ساڑھے سات سو برس پیشتر امام فخر الدین رازیؒ نے قدیم یونانی علوم کے مقابلہ میں انجام دی تھی۔ اور اسی لیے یہ کہنا غیر موزوں نہ ہوگا کہ یہ تفسیر چودھویں صدی کی تفسیر کبیر ہے۔ آپ کا شمار اپنے وقت کی تاریخ ساز شخصیتوں میں ہوتا ہے۔"

مولوی عبدالشاہد خاں شروانی "کاروان خیال" میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"مصر کا جوہری طنطاوی ہندوستان میں بھی ابوالکلام آزاد کی شکل میں نمودار ہوا تھا۔ لیکن ابھی وقت نے اس کو پہچانا نہیں ہے۔"[۵]

علامہ طنطاوی عصرِ عرب علمی و سیاسی شخصیتوں میں سب سے زیادہ "مولانا محمد علی جوہر سے متاثر تھے آپ نے اپنی تقریروں و تحریروں میں جوہر کی بے حد مدح کی ہے۔

مولانا محمد علی کا جب انتقال ہوا تو آپ اپنی کتاب تفسیر قرآن مکمل کر رہے تھے اور اسی وقت جلد نمبر ۲۱ سورہ الزخرف زیرِ تکمیل تھی۔

جب ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۶ء میں یہ جلد شائع ہوئی اور اس میں لوگوں نے مولانا محمد علی کی تصویر اور حالات تدفین کو دیکھا تو علامہ سے حیرت زدہ ہو کر سوال کیا کہ آپ نے یہ کیا جدت کی ہے؟ علامہ نے جواب دیا میں نے محمد علی کی دو تصویریں اپنی تفسیر میں شامل کی ہیں مجھے یہ احساس ہے کہ لوگ اس پر معترض ہوں گے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ملت اسلامیہ کو "مقام محمد علی" سمجھنے کی توفیق عطا کرے۔ مولانا محمد علی کے بارے میں انھوں نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ ، یہ عنوان قائم کیا ہے۔

الفصل السادس

فی ذکر أمر عظیم اسلامی فی أیامنا هذه

وهو دفن فقید الاسلام محمد علی بفلسطین وهذا حادث لم نظیرة فی التاریخ

"۲۰ ألف یشیعون الجنازة و ۱۰۰ ألف یشهدون الصلوٰة"

حمله التأبین فی المسجد الاقصٰی

آپ نے صفحہ ۳۲ تک محمد علی کی حیات، کارنامہ، روداد تجہیز و تکفین پر طویل بحث کی ہے۔ اور عنوان الفاظ پر اختتام کیا ہے :-

---

۵ "کاروانِ خیال" صفحہ ۲۱، اور "باغی ہندوستان" مطبوعہ ۱۹۴۷ء صفحہ ۷۷

اصبحت الهند وابناء العرب اليوم صفا واحدا فى مقابلة من يعتدى على بيت المقدس أو بلاد فلسطين، فهذا مصداق لهذه الآية و نور من انوار النبوة المحمدية والحمد لله رب العالمين

(انتهى الفصل السادس)

علامہ کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد علی کی موت ہمارے زمانے کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ کبھی کبھی کائنات میں ایسے واقعات ظہور پذیر ہو جاتے ہیں کہ جن کی وجہ سے عام رسم و رواج اصول ضوابط بالائے طاق دکھائی پڑتے ہیں۔ میرے نزدیک محمد علی کی حیات و موت بھی ان ہی واقعات میں سے ایک ہے۔ جس کی وجہ سے تاریخ میں نئے موڑ آتے ہیں۔ محمد علی نے تنہا اس زمانے میں ایشیا کی آزادی ملت اسلامیہ کی برتری، عرب کا ز و مسئلہ فلسطین کی جو خدمت انجام دی ہے، وہ قوم ترک و فارس بھی انجام نہ دے سکیں۔ میرے نزدیک اس عظیم" قائد ہند" کو اہل عرب کی طرف سے خراج تحسین کی ایک صورت یہ بھی کہ میں ملت اسلامیہ کی ہمیشہ باقی رہنے والی کتاب جس کو محمد علی نے اپنا نصب العین بنالیا تھا، اس میں محمد علی کو جگہ دے کر حیات دوام عطا کر دوں۔ اور محمد علی کی یاد کو ہمیشہ کے لیے قائم کر دوں میں نے اس مرد مجاہد کو قرآنی کسوٹی پر کس کے دیکھا تو محمد علی کو قرآن کی آیت جہاد کی عملی تعبیر پایا۔ محمد علی جیسے افراد قدرت بوقت ضرورت کبھی کبھی ہی پیدا کرتی ہے وہ ایک مجاہد تھا جو انسانی آزادی کے لیے سامراجی طاقتوں سے لڑا۔ اور میدان جہاد میں مرا۔ محمد علی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے عرب اور ہند کے فاصلے کو ختم کر کے دونوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیا۔

علامہ طنطاوی نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ محمد علی کو ان کی حسب وصیت ہندوستانی کھدر کے کفن میں دفن کیا گیا۔ محمد علی سے اپنی جوشش عقیدگی کا آخری اظہار علامہ طنطاوی نے اس طرح کیا کہ اپنا قیمتی پورا کتب خانہ مصر میں ہندوستانی طلبہ کی انجمن "جماعت الاخوة الاسلامیۃ" کے حوالہ کر دیا۔

اس خیال سے کہ شاید پھر کوئی ان طلباء میں سے محمد علی جیسا پیدا ہو اور ان کی تعلیم و تربیت میں میرا بھی حصہ ہو حسن الاعظمی لکھتے ہیں :۔

" یہ بیش قیمت کتب خانہ ہے۔ جس میں علامہ کے سارے مسودات اور قلمی کتابیں شامل ہیں۔

علامہ کی تفسیر پچیس جلدوں میں ہے، کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی ہوگیا ہے۔ طنطاوی کی حسب وصیت آج بھی جلد بیس صفحہ ۲ پر محمد علی کی تصویر "سوانح علمائے عرب" کے تاثرات "تفسیر جوہری" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

علامہ جوہری جوہر شناس تھے۔ انھوں نے شعوری طور پر ملت عربیہ کو مقام محمد علی جوہر سے شناس گرداننا کیا عجب ہے کہ جوہر کے ہم نوا دبیر الہند مرزا دبیر کو قدرت نے تفسیر جوہری کے بارے میں یہ اشعار القا کیے ہوں تاکہ ہم ہندوستانیوں پر ناشکری کا الزام نہ آئے۔

دبیر کہتے ہیں ؎

نکلی خلاف نور سے "تفسیر جوہری" یا آگے دست بوس سلیماں ہوئی پری
یا حجلہ سے عروس نے کی جلوہ گستری یا ہے یہ شاخ میوہ طوبیٰ ہری بھری

مولانا محمد علی کے انتقال پر عربی کے مشہور و جلیل شاعر احمد شوقی بک نے ۲۲ اشعار کا ایک مرثیہ کہا تھا جس کے چند اشعار کا ترجمہ ذیل میں شائع کیا جاتا ہے، ترجمہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب کا کیا ہوا ہے

رہنمائے قوم محمد علی سے کہہ دو کہ بیت المقدس اور اس کے سنگ ریزوں پر غم و اندوہ چھا گیا ہے

وہ تمہاری طرف اپنی پلکوں اور اپنے آنسوؤں سے چل رہا ہے اور تمہارے بھائی کی طرف اپنے قلب اور جذبات تعزیت و غم خواری لے کر

تم نے اسے عبور کیا تو اس کے کناروں نے تمہیں اپنے آغوش میں لے لیا، اگر تم ذرا ٹھہر جاتے تو وہ تمہیں اپنے سینے میں چھپا لیتا۔

تمہیں اس کی زمین سے اس طرح گزرنے کی عادت رہی ہے جیسے بادل اپنا سایہ اور پانی لے کر گزرتا ہے

تم جس گھر کے مٹّوں میں سے ہو اس کے سائے میں اور اللہ کی آغوش میں سو جاؤ

یہاں تمہارے لیے پردیس نہیں ہے

(ہماری زبان۔ مولانا محمد علی نمبر صفحہ ۷)

ڈاکٹر سید حامد حسین

مولانا محمد علی کا ارادۂ خودکشی

چند سال قبل مجھے مولانا محمد علی کی خود نوشت سوانح حیات "میری زندگی — ایک جزو"[1] کے مطالعے کا موقع ملا۔ اس میں جس واقعے نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا اس کا تعلق مولانا کے مِلّی احساس کے اس وفور سے تھا جس کو صدمہ پہنچنے کے نتیجے میں انھوں نے آخر ۱۹۱۲ء کی ایک رات بالاخانے سے گر کر خودکشی کر لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس شدید ردِعمل کے پس منظر میں دراصل ترکوں کی وہ شکست تھی جو انھیں اکتوبر نومبر ۱۹۱۲ء میں بلقان کی جنگ میں برداشت کرنا پڑی تھی۔ ترکوں کے خلاف یورپی قوموں کی مورچہ بندی کی ابتدا تو ۱۹۱۱ء میں ہو چکی تھی جب ۲۶ ستمبر کو اٹلی نے ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا اور اس کے بعد بلغاریہ، سرویا، یونان اور مانٹی نیگرو میں ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ اعلانِ جنگ کے بعد اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا تھا اور بالآخر مارچ ۱۹۱۲ء میں اس پر اٹلی کا قبضہ ہو گیا تھا۔ طرابلس کی جنگ نے ہندوستانی مسلمانوں کو بے چین کر دیا تھا اور وہ بڑی تشویش سے ترکی کو درپیش خطرات کو دیکھنے لگے تھے۔ طرابلس پر اٹلی کی فتح سے بلقان کی دوسری ریاستوں کو بھی حوصلہ ملا۔ یونان نے بڑھ کر کریٹ پر قبضہ کر لیا۔ ادھر فرانس میں روسی سفیر کی کوششوں سے ترکوں کے خلاف ایک ساتھ مل کر جنگ کرنے کے واسطے بلغاریہ اور سرویا کے درمیان معاہدہ ہوا جس پر مارچ ۱۹۱۲ء ہی میں دستخط ہو گئے۔ مئی ۱۹۱۲ء میں بلغاریہ اور یونان نے بھی ایک دفاعی معاہدہ کر لیا اور اگست ۱۹۱۲ء میں مانٹی نیگرو کو بھی بلقان ریاستوں کی لیگ میں شامل کرنے کے لیے آمادہ کر لیا گیا۔ اس کے

---

[1] My Life A Fragment

فوراً ہی شمالی البانیہ میں ہنگامے شروع ہوئے اور ۸ اکتوبر کو مانٹی نیگرو نے ترکوں نے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۷ اکتوبر کو بلغاریہ اور سرویا نے اور ۱۸ اکتوبر کو یونان نے بھی ایسے ہی اعلانات کر دیے۔ بلغاریہ نے اپنی فوجیں ایڈریانوپل پر بڑھا دیں تو ترکوں کو بھی اعلان جنگ کرنا پڑا اور ترکی کو بلغاریہ، سرویا، مانٹی نیگرو اور یونان کے خلاف یک وقت چار محاذ کھولنا پڑے۔ ظاہر ہے اس جو مکھی لڑائی کو سنبھالنا نہایت مشکل تھا چنانچہ ترکوں کو پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ۲۲ اکتوبر کو بلغاریوں نے کرک کلیسا میں ترکوں کو شکست دی۔ ۲۶ اکتوبر کو سرویا کو مینبوہ کو فتح کر کے مقدونیہ میں گھس آیا۔ ترکوں نے یونانیوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن ۹ نومبر کو یونانی فوجیں سلانیکا میں داخل ہو گئیں اور اس طرح ترکوں کو ہر طرف سے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔[۲]

ترکوں کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی جو ہمدردیاں تھیں وہ طرابلس کی جنگ کے آغاز سے بے حد بڑھ گئی تھیں۔ بلقان کی جنگ کے دوران ان ہمدردیوں نے ایک شدید ذہنی اور جذباتی کرب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مولانا محمد علی اپنے اخبار "کامریڈ" کے صفحات کے ذریعے جنگ کی تازہ ترین اطلاعات اور ان پر اپنے تاثرات اور تبصرے برابر پیش کر رہے تھے۔ لیکن جیسے جیسے ترکی کے لیے حالات سنگین ہوتے گئے ویسے ہی ویسے ہندوستانی مسلمانوں کی تشویش بھی برداشت کی حدوں سے باہر نکلتی محسوس ہونے لگی۔ اس موقع پر مولانا محمد علی کی جو ذہنی کیفیت تھی اس کا تفصیلی ذکر انھوں نے اپنی سوانح حیات میں کیا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں :-

> "بلقان میں اس تباہ کن جنگ کے دوران میرے جذبات اتنے شدید تھے کہ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ ایک دن میں نے اس سے مغلوب ہو کر خودکشی کرنے کا سوچ لیا تھا۔ یہ بات بلاشبہ بڑی متضاد معلوم ہوتی ہے کہ اخلاقی بزدلی کے اس فعل کے لیے کچھ ہمت بھی چاہیے ہوتی ہے اور میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا اس فیصلہ کن رات کو آخری قدم اٹھانے کے لیے مجھ میں

---

[۲] ملاحظہ ہو "مصطفیٰ کمال اور تاریخ ترکی و فلسطین وغیرہ" از محمد اظہر علی کاکوروی۔ سلطانیہ برقی پریس لکھنؤ ۱۹۲۸ء صفحات ۱۲۲ تا ۱۴۴۔ اور

A.J Grant and Harold Temperley "Europe in the 19th and 20th Century", pp. 376-377.

خاصی ہمت پیدا ہو گئی تھی۔ رائٹرز کی سب سے آخری اطلاع جو مجھے ملی تھی وہ یہ تھی کہ بلغاری قسطنطنیہ کی شہر پناہ سے صرف ۲۵ میل دور تھے۔ اس قسطنطنیہ سے جس کا نام پانچ صدیوں سے ہر مسلمان کے لیے تقدس کا حامل تھا اور جو اس کی اعلیٰ ترین امیدوں کا مرکز تھا۔ ۱۹۱۲ء کے موسم خزاں کی اس رات مجھے ایسی ہمت اور بزدلی کی آزمائش سے میرے ایک مسلمان دوست کی اچانک آمد نے بچا لیا۔ میرے اس دوست نے کچھ عرصہ قبل ہی آکسفورڈ سے ڈگری حاصل کی تھی اور اس وقت اس کے ساتھ اسی یونیورسٹی کے ان کے ایک انگریز ہم جماعت تھے جو اس کے مہمان تھے اور جنھوں نے ہندوستانی ناچ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اسی کے لیے نجی طور پر انتظامات کیے گئے تھے اور اس کے واسطے جس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا وہ ایک بیرسٹر کا مکان تھا جو میرے ہمسایہ تھے۔ میرے دوست نے میری شرکت پر اصرار کیا۔ میں نے صاف اپنی ادارتی مصروفیتوں کا عذر پیش کیا اور رائٹرز کی آخری اطلاع کے بعد اپنے جذبات کی کیفیت انھیں بتائی۔ اتنا ہی میرے دوست میرا انکار سننے پر آمادہ نہ تھے اور وہ مجھے اپنے ادارتی کمرے میں تقریباً جسمانی طور پر اٹھا کر دوسرے مکان میں ہونے والی نجی محفل رقص میں جبراً لے گئے۔ تو اس طرح بجائے ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور خون میں لتھڑے ہوئے ایک جسم کے جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا کہ وہ اتفاقاً تیسری منزل سے نیچے گر کر اس حادثے کا شکار ہوا ہو، میں یہاں ایک ایسی "عیاشانہ محفل" میں ہاتھ بٹا رہا تھا، جو میرے نوجوان دوست نے اپنے آکسفورڈ کے ساتھی کے اشتیاق کو پورا کرنے کے لیے سجائی تھی۔"[3]

مولانا کا یہ شدید تاثر حالات سے پوری مطابقت رکھتا تھا۔ دوسرے حساس مسلمانوں کا اس موقعے پر کیا ردعمل تھا اس کی صرف دو مثالیں کافی ہوں گی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اس موقعے پر اپنی ڈائری میں یہ الفاظ درج کیے تھے:۔

---

۳ My Life . A Fragment - An Autobiographical Sketch of Maulana Muhammad Ali", Edited by Afzal Iqbal, 2nd Edition, Lahore-1944, pp 38-39

[illegible] ہولناک خبروں کے لیے ہم تیار نہ تھے۔ ہر شخص کو ترکی افواج پر پورا اعتماد تھا۔ خصوصاً جبکہ چار سال سے ترکی میں آئینی حکومت ہے۔ اصلاحیں کی گئی ہیں اور نوجوان پارٹی (ینگ پارٹی) کوششوں میں مصروف ہے۔ ان سب کے ہوتے ہوئے ترکی میں ایسے نتیجے نہ ہونے چاہیے تھے، جیسے ہو رہے ہیں۔ بلغاریہ کی فوج قسطنطنیہ سے ۲۰ میل قریب آگئی ہے اور اب ترک اپنی [illegible] کی حفاظت کی خاطر جنگ کر رہے ہیں۔ درحقیقت جنگ صلیب و ہلال کے درمیان ہے

تمام دنیائے اسلام پر آسمان سے بجلی گری ہے۔ ہندوستان میں مسلمان خوف و اضطراب سے بھر گئے ہیں۔ مستقبل نہایت خوفناک اور تاریک نظر آتا ہے۔[۷]"

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری اس وقت یورپ میں تھے اور چند دن پہلے ہی وہ ترکی کا دورہ کرنے کے بعد وہاں سے لوٹے تھے۔ یکم نومبر ۱۹۱۲ء کو انھوں نے وینس سے اپنے والد کو خط میں لکھا:

"حقیقت میں بلقان اور یورپ نے ثابت کر دیا کہ خدا نے کم از کم فی الحال مسلمانوں کو چھوڑ دیا ہے۔ واللہ باللہ ترکوں کا شکست کھانا صرف عادۃ الٰہی ہے، ورنہ اب بھی میں پھر وہی کہتا ہوں کہ جہاں تک عالم اسباب کو دخل ہے اب بھی ترکوں کی فوج میں پانچ بلقان کی قوت موجود ہے۔

اب مسلمانوں کی وہ حالت پہنچ گئی سمجھنا چاہیئے جو بنی اسرائیل کی تھی۔ نصرانیت نے اسلام اور الحاد نے مذہب کو شکست فاش دی۔ اب مسلمانوں کا مجموعی طور پر یا فرداً فرداً زندہ رہنا بے شرمی و بے حیائی سے زیادہ نہیں۔[۸]"

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات بالکل نجی تحریرات سے لیے گئے ہیں جن کا مقصد شائع کیا جانا نہیں تھا اور اس بنا پر یہ فطری تاثرات کا حقیقی اظہار ہیں اور مسلمانوں کے اس ذہنی کرب اور صدمے کو پوری شدت سے ظاہر کرتے ہیں جو اس حادثے سے پیدا ہوا تھا۔

مولانا محمد علی اس احساس میں سب کے شریک تھے اور یہ واقعہ ان کے اخلاص فکر و احساس کی متعدد مثالوں میں سے ایک ہے۔ لیکن جس وقت سے میری نظر سے یہ واقعہ گزرا تھا اس وقت

---

[۷] حبیب اللہ خاں۔ "حیات آفتاب"۔ صفحہ ۹۲

[۸] "باقیات بجنوری"۔ صفحات ۱۸۹ و ۱۹۰

سے میرے ذہن میں یہ جاننے کی خلش تھی کہ آخر مولانا کے وہ دوست کون ہے جو خودکشی کے اقدام سے انھیں باز رکھنے کا سبب ہے۔ میرے علم میں یہ بات تھی کہ اسی زمانے میں مشہور انگریزی ناول نگار ای۔ ایم۔ فارسٹر، سر راس مسعود کی دعوت پر ہندوستان آئے ہوئے تھے اور دہلی میں ان کا ڈاکٹر انصاری کے یہاں قیام رہا تھا۔ میرے ذہن میں اس وقت یہ بات آئی تھی کہ شاید اس موقعے پر فارسٹر مولانا سے ملے ہوں لیکن مولانا نے اپنی سوانح حیات میں جس انگریز کا حوالہ دیا تھا اسے انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی کا گریجویٹ بتایا تھا۔ جب کہ فارسٹر کا تعلق کیمبرج یونیورسٹی سے تھا۔

جولائی ۱۹۷۷ء میں فارسٹر کی سوانح عمری کی پہلی جلد شائع ہوئی جو چند ہفتے قبل مجھے ملی۔ سب سے پہلے میں نے اس میں فارسٹر کے دورۂ ہندوستان کے بارے میں دی گئی تفصیلات کا مطالعہ کیا اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ابتداً مجھے جو شبہ ہوا تھا کہ اس واقعے سے فارسٹر کا تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ صحیح تھا۔

آخر ہفتہ اکتوبر میں فارسٹر ہندوستان آئے تھے۔ دوسرے مقامات کا دورہ کرتے ہوئے وہ سر راس مسعود کے پاس علی گڑھ پہنچے اور وہاں تقریباً ایک ہفتہ رکنے کے بعد سر راس کے ساتھ دہلی آئے جہاں وہ نومبر ۱۹۱۲ء کے ابتدائی دنوں میں موری گیٹ کے قریب واقع ڈاکٹر انصاری کے مکان پر مقیم ہوئے۔ قیام کے آخری دن ڈاکٹر انصاری نے فارسٹر کی دلچسپی کے لیے ناچ کا انتظام کیا۔ ڈاکٹر انصاری پہلے یہ ناچ اپنے ہی گھر پر رکھنا چاہتے تھے لیکن پڑوس میں ہی ایک انگریز عورت رہتی تھی جس کی وجہ سے یہ اندیشہ ہوا کہ وہ طرح طرح کی باتیں پھیلائے گی جس سے ڈاکٹر انصاری کی پریکٹس کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ لہذا یہ طے ہوا کہ یہ ناچ پرانے شہر کے وسط میں ایک اور دوست کے یہاں رکھا جائے۔

فارسٹر کا سوانح نگار پی این فربینک لکھتا ہے کہ "اس ناچ کے ساتھ ایک بڑا عجیب سیاسی واقعہ رونما ہوا۔ مسعود اور انصاری دونوں علی برادران کے قریبی دوست تھے۔ اور اس وجہ سے وہ دوسرے مسلمانوں کی طرح اس وقت بلقان کی جنگ میں شکست کا سامنا کرتے ہوئے ترکی کی زبوں حالی سے پریشان تھے۔ ایسا ہوا کہ یہ ناچ کامریڈ کے دفتر کے عین پڑوس میں ہونے والا تھا لہذا وہاں جاتے ہوئے مسعود اور فارسٹر کامریڈ کے دفتر میں بھی پہنچے۔ انھوں نے محمد علی کو بڑی پریشانی

کے عالم میں پایا اور وہ خودکشی پر آمادہ تھے۔ 'میری حالت نہایت افسوسناک ہے'۔ انھوں نے کہا 'بلغاری فوج قسطنطنیہ کی دیواروں سے ۲۵ میل کے اندر ہے' تقریباً آبدیدہ ہوتے ہوئے وہ مسعود کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلے گئے اور وہاں روتے کہا 'اب نہ کچھ طلب کرنے کو ہے اور نہ دینے کو۔ اب تو سب کا خاتمہ ہو گیا'۔ گو کہ فارسٹر نے علی کو ایک نہایت ناقابل قبول شخص پایا پھر بھی وہ ان کے جذبے سے متاثر ہوئے۔ مسعود نے موقعے کا اثر قبول کرتے ہوئے کہا۔ 'یہ میری زندگی کا موڑ ہے۔ ہم نے یونیورسٹی کے لیے جو پیسہ اکٹھا کیا ہے وہ سب ترکوں کو دیدیں گے'۔ اس کے باوجود وہ اس پر مصر رہے کہ علی ناچ میں ملیں اور جب انھوں نے دشواری پیدا کی تو مسعود نے انھیں پکڑا اور جسمانی طور پر انھیں کمرے سے اٹھا کر لے گئے۔ علی نے بلا سوچے سمجھے اس رات کا واقعہ ایک ساتھی اخبار نویس کو سنایا اور علی کے قول کے مطابق جلد ہی لندن ٹائمز میں یہ اطلاع چھپی کہ کس طرح ایک سرکردہ مسلم شورش پسند نے ترکی کی شکست کے موقع پر ایک شام محفل میں رنگ رلیاں منا کر گذاری۔"[۵۲]

فارسٹر کے سوانح نگار نے فارسٹر کی ڈائری کی مدد سے اس ناچ کے بارے میں اس انگریز مصنف کے تاثرات بھی پیش کئے ہیں جن کی تفصیل اس جگہ غیر ضروری ہے۔

اگلے ہی دن فارسٹر لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ لیکن فارسٹر کی دہلی میں موجودگی کی وجہ سے اس ناچ پارٹی کے انتظام اور سر راس مسعود کی مولانا محمد علی سے ملاقات اور انھیں زبردستی اس محفل میں کھینچ لانے کے سبب ایک ایسے المناک حادثے کی روک تھام ہو گئی جو اگر حقیقت بن گیا ہوتا تو ملک و قوم اپنے ایک مخلص قائد کی ان قابل قدر خدمات سے محروم ہو جاتا جن سے اگلے کئی سال تک ملک بہرہ ور ہوا۔

---

[۵۲] P N Furbank E.M. Forster A Life Vol I, London 1977, pp 228-9

نذیر الدین مینائی

تحریکِ خلافت کا ہندوستانی مسلمانوں پر اثر

ہندوستانی مسلمانوں کا مزاج کچھ ایسا ہے کہ اگر ان کے بارے میں یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وقتاً فوقتاً عزمات اور ہیجان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے کروٹ لی اور جداگانہ انتخابات کے مطالبے کو تسلیم کرالیا۔ اس کے بعد گہری نیند سوگئے۔ دس برس کے بعد پھر خوابِ غفلت سے بیدار ہوئے تو ۱۹۱۶ء میں کانگریس سے معاہدہ کرکے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں تناسب نمائندگی کا مسئلہ حسبِ دل خواہ طے کرالیا۔ قوم پھر محوِ خواب ہوگئی۔ اور چار برس کی غافل نیند کے بعد ایک مرتبہ پھر ۱۹۲۰ء میں آنکھیں کھولیں اور تحریکِ خلافت میں اپنے آپ کو کمال سرمستی اور بھرپور قوت کے ساتھ جھونک دیا۔ اس گہما گہمی اور جوش و خروش کے بعد پھر غنودگی اور بے عملی طاری ہوگئی۔ آٹھ برس کے تعطل اور جمود کے بعد ۱۹۲۸ء میں پھر خیال آیا تو اگڑا لی اور ملی شیرازے کو از سرِ نو مجتمع کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں برصغیر ہندوستان کے عوام قوم پرستی کے جذبے سے سرشار ہو چکے تھے۔ مسلمان بھی زیادہ عرصے تک خود کو اس سے الگ نہ رکھ سکے۔ ظاہر ہے ہندوستان پر برطانوی تسلط سے بیزاری کی جو روایت مسلمانوں میں ایک عرصہ دراز سے مستحکم ہو چکی تھی اس کو اتنی آسانی سے مزاجوں اور ذہنوں سے نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں برطانیہ اور روس میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کی وجہ سے ان مسلم ممالک کے لیے مستقل ایک خطرہ لاحق تھا جو ابھی تک آزاد تھے۔

ہندوستانی مسلمان اپنی آزادی اور اپنا اقتدار تو کھو چکے تھے لیکن ان میں ایک نیا احساس و شعور جاگ اٹھا تھا۔ دنیا کے دوسرے مسلمانوں اور عالمِ اسلام سے ان کے اپنے روحانی رشتے کا احساس

اور دینی تعلق کا شعور۔ حکومت برطانیہ جیسے جیسے ان مسلم ممالک پر اپنے اقتدار اور دائرۂ اثر میں توسیع کی پالیسی پر کاربند ہوتی جاتی تھی ویسے ویسے ہندوستانی مسلمانوں میں یہ پالیسی غیر مقبول ہوتی جاتی تھی۔ اور ان میں کچھ ایسا جذباتی رد عمل پیدا ہو رہا تھا جس کی وجہ سے حکومت برطانیہ سے مسلمانوں کا جذبۂ وفاداری سرد پڑتا جا رہا تھا۔ مسلمانوں پر یہ بات بھی منکشف ہو چکی تھی کہ برطانیہ نے یہ پالیسی اس لیے اختیار کی تھی تاکہ ہندوستان پر اس کی گرفت اور مضبوط ہو جائے۔ مسلمان اپنے اس خیال پر ایمان کی سی پختگی کے ساتھ جمے ہوئے تھے کہ اسلامی ممالک کو اس دباؤ سے نجات دلانے کی محض ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے ہندوستان کی آزادی۔ کیونکہ ہندوستان کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد انگریزوں کے لیے اسلامی ریگزاروں پر قبضہ کرنا بے سود اور بے معنی ہوگا۔ اشتیاق حسین قریشی کو اس دلیل میں ایک طرح کی سادہ لوحی جھلکتی نظر آتی ہے۔ اور وہ اس دلیل کو ترکی پروپیگنڈے کا ایک جز سمجھتے ہیں پھر بھی وہ سمجھتے ہیں کہ تبل کی دریافت سے قبل اس دلیل میں کچھ جان تھی کیونکہ یہ ممالک اسلامی سلطنت برطانیہ کے براہِ راست رابطہ کی راہ میں حائل تھے[1] ایک اور قابلِ غور دلیل مولانا حسرت موہانی نے پیش کی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو یہ جان لینا چاہیے کہ جمہوریۂ ہند کے قیام سے انھیں دو فائدے ہوں گے۔ اول یہ کہ ایک جمہوری ملک کے شہری کی حیثیت سے انھیں برابر کے حقوق حاصل ہوں گے اور وہی فائدے حاصل ہوں گے جو دوسروں کو ہوں گے دوسرے یہ کہ برطانوی دائرۂ اثر میں تخفیف کر کے وہ عالمِ اسلامی کو وہ سکون خاطر مہیا کر سکیں گے جو تعمیری سرگرمیوں کے لیے اشد ضروری ہے۔

ایک لحاظ سے ان سب دلیلوں کا رخ ایک ہی سمت میں تھا۔ یعنی یہ کہ اگر برطانیہ اسلامی حکومتوں کا تختہ پلٹ کر وہاں اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا تو پھر اس مکروہ مقصد میں مسلمان معاون نہ ہیں۔ کیونکہ اگر ہندوستانی مسلمان انگریزوں کے وفادار رہیں گے تو ہندوستان میں انگریزوں کے قدم اور مضبوطی سے جم جائیں گے۔ اور جب انگریز ہندوستان میں مضبوط ہو جائیں گے تو پھر ممالک اسلامی پر اپنا تسلط قائم کرنا ضروری سمجھیں گے۔ یہیں سے تحریک خلافت کی بنیاد پڑی۔

---

[1] اشتیاق حسین قریشی، دی مسلم کمیونٹی آف دی انڈو پاک سب کانٹی نینٹ، ۱۹۶۲، صفحہ ۲۶۱

عربوں کے برعکس ہندوستانی مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ دولت عثمانی اگرچہ کمزور ہو چکی تھی تاہم اس میں اتنی اندرونی قوت موجود تھی کہ اسے ایک اسلامی وفاق کی شکل بہ آسانی دی جا سکتی تھی۔ اور اس طرح ان ممالک کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کی حفاظت و سلامتی کی ایک سبیل پیدا ہو سکتی تھی۔ عوامی نقطۂ نظر اور رجحان کچھ بھی رہا ہو اور خلافت کے ختم کیے جانے پر خواہ کیسی ہی دینیاتی الجھنیں کیوں نہ پیدا ہوتیں ان کے علی الرغم مسلمانوں کے دانشوروں کو ایک مسلم ریاست کے ٹوٹ جانے پر بڑی تشویش تھی۔

حکومت ہند مسلمانوں کے جذبات و احساسات سے پوری طرح واقف تھی اور اسے ان سے بظاہر ایک گونہ ہمدردی بھی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں نے خلافت کے بارے میں اپنا جو نقطۂ نظر پیش کیا اس کی تائید بھی کی گئی یہاں تک کہ جنگ کے اختتام سے قبل حکومتِ ہند کی تجویز پر برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج نے ہندوستانی مسلمانوں کے مجروح جذبات پر مرہم رکھنے کی غرض سے پارلیمنٹ میں ایک بیان بھی دے دیا کہ حکومت برطانیہ کا ہرگز یہ ارادہ نہیں کہ وہ ترکوں کو ان کے وطن عزیز سے محروم کر دے جہاں وہ اکثریت میں ہیں۔ موصوف نے پارلیمنٹ میں کہا کہ "ہم اس لیے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ہم ترکی کو اس کے زرخیز اور مشہور علاقے ایشیائے کوچک اور تھریس سے محروم کر دیں جہاں پر ترکی النسل لوگوں کی اکثریت ہے۔" وزیر اعظم کے اس اعلان کی روشنی میں یہ بالکل فطری بات تھی کہ مسلمان اپنے مقدمہ کو اس عدالت میں پیش کرتے جو قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والی تھی اور اس کے لیے ایک وفد بھی یورپ بھیجتے۔ تاکہ حکومت برطانیہ کو اس کے وعدے یاد دلائے جا سکتے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن وائے حسرت کہ مسلمانوں کے مقدر میں مایوسی لکھی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں معاہدۂ سیورے ترکی پر ٹھونس دیا گیا جس کی رو سے دولت عثمانی ختم کر دی گئی اور اس کے ساتھ ترک اقتدار اعلیٰ بھی۔ اس معاہدہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بری طرح مشتعل کر دیا۔ مسلمانوں کے دل کی بھڑاس ایک پرجوش تحریک کی صورت میں نکلی۔ اس سے قبل کسی ایسے ایجی ٹیشن کی مثال نہیں ملتی جس نے انگریزی حکومت کی بنیادوں کو اس بری طرح ہلا کر رکھ دیا ہو۔ مسلمانوں نے اس تحریک میں اس شد و مد کے ساتھ حصہ لیا کہ خود سے گزر گئے۔ شدائد اور مصائب کے احساس کے بغیر وہ اس آگ میں کود پڑے اور کچھ ایسے لوگوں کو استعجاب میں ڈال دیا جن کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں میں اس قسم کے اقدامات کی صلاحیت ہی نہیں۔

تحریکِ خلافت کے بانی اور روحِ رواں مولانا محمد علی تھے۔ ترکی کے مستقبل کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے مولانا ۱۹۲۰ء میں ایک وفد لے کر یورپ گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے اس بات کو بہت پرزور اور واضح الفاظ میں کہا کہ اگر اسلام کے احکامات کی مناسب طور پر پابندی کرنی ہے تو جزیرۃ العرب (بشمول عراق، عرب، شام اور فلسطین) اور جملہ مقاماتِ مقدسہ جو ان ممالک میں واقع ہیں ترکی کے خلیفہ کے قبضہ میں رہنے چاہئیں۔ اس مطالبہ کی پشت پر محض علماء کے فتووں کی طاقت نہیں تھی بلکہ وزراء کے وہ بیانات اور یقین دہانیاں بھی تھیں جو جنگ کے آغاز پر کی گئی تھیں جن میں واضح الفاظ میں یہ یقین دلایا گیا تھا کہ "ہم ترکی کو اس کے ایشیائی علاقوں سے محروم کرنے کے لیے نہیں لڑ رہے ہیں۔"

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی یورپ سے تہی دست لوٹے۔ واپس آکر اس مسئلہ پر غور و فکر شروع ہوا کہ خلافت اور پنجاب کی بے انصافیوں کا ازالہ کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کے اس کاز سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا اور اس کی حمایت کے لیے راضی ہو گئے۔ انھوں نے عدمِ تشدد پر مبنی عدمِ تعاون کی ایک اسکیم پیش کی۔ خلافت کانفرس نے اس تجویز کو فوراً اپنا لیا۔ انڈین نیشنل کانگریس نے اس اسکیم کی توثیق بعد میں کی۔ اور یکم اگست ۱۹۲۱ء سے اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ گاندھی جی اور مسلمانوں میں عملی سطح پر جیسا اشتراک ہوا اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ حقیقت یہ تھی کہ فریقین میں سے ہر ایک کو دوسرے کی مدد کی ضرورت تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کے لیے گاندھی جی کے والہانہ اشتیاق نے بقول خود انھیں مجبور کر دیا کہ "ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں کہ اب یہ صدیوں میسر نہ آئے گا۔"

دو ہی مہینوں کے اندر مولانا محمد علی نے علی گڑھ کے اربابِ حل و عقد کے سامنے یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ وہ حکومت سے اپنا تعلق منقطع کریں اور اس سے مالی امداد لینا بند کر دیں۔ علی گڑھ کے ذمہ داروں کے نزدیک نہ یہ عملاً ممکن تھا نہ عقلاً مناسب۔ کیونکہ کالج کے بیشتر طلباء فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی ملازمت کے لیے حکومت کے دستِ نگر رہا کرتے تھے۔ مولانا محمد علی نے ڈاکٹر ضیاء الدین کی مزاحمت کے آگے تو سپر ڈال دی لیکن طلباء میں انھیں خاصی کامیابی ہوئی۔ ان کی خطابت اور زور بیان نے نوجوانوں کے دلوں کو مسخر کر لیا اور طلباء کی ایک اچھی خاصی تعداد کالج چھوڑ کر مولانا کی قائم کی ہوئی قومی یونیورسٹی

میں داخل ہوگئی۔ یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی داغ بیل تھی جو آگے چل کر حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب کی سرپرستی میں پروان چڑھی اور جلد ہی اس نے اپنی انفرادیت وافادیت اور وسعت ووقار قائم کر لیا

تحریک خلافت زیادہ تر مذہبی جذبات پر مبنی تھی اور شروع ہی سے علماء کثیر تعداد میں اس کی طرف کھنچ کر آئے جب عدم تعاون کی تحریک اپنے مقاصد میں ناکام ہوگئی تو علماء نے اس مسئلہ کے حل کے لیے زیادہ انقلابی اور زیادہ، سیاسی حل پیش کئے۔ ان میں ایک مولانا آزاد کا فتویٰ تھا، جس کی رو سے مسلمانوں کا فوج اور پولس میں کام کرنا حرام قرار دیا گیا تھا۔ اس سیاسی مرض کے لیے ایک اور نسخہ تجویز کیا گیا تھا اور وہ بھی مولانا آزاد کی کے ذہن رسا کی پیداوار تھا جس کی رو سے لوگ ترکِ وطن پر آمادہ ہوگئے ایک طرف جذبات کی شدت اور دوسری طرف اس مسئلہ میں ناکامی، ان دونوں کا شدید ردعمل مسلمانوں میں یوں ظاہر ہوا کہ سندھ اور صوبہ سرحد سے اٹھارہ ہزار سادہ دل مگر مخلص مسلمانوں نے اپنی زمین اور جائداد کو اونے پونے فروخت کرکے کابل کی راہ لی۔ اس اقدام میں ان سادہ دل مسلمانوں کی جو تباہی وبربادی ہوئی اور انھیں جس مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اس کی تفصیلات بڑی دردناک ہیں۔

اس تمام عرصے میں ہندوستانی مسلمانوں پر مذہبی جذباتیت پوری طرح طاری رہی۔ پوری قوم کی توجہ کا مرکز مسئلہ خلافت تھا۔ کیونکہ خلیفہ کی عدم موجودگی میں بقول علماء جمعہ کی نماز بھی جائز نہ تھی۔ ملک کے چھوٹے بڑے شہروں میں روزانہ جلوس نکلتے رہے اور جلسے ہوتے رہے۔ ان جلسوں میں پرجوش اور جذبات انگیز تقریریں کی جاتی تھیں۔ سامعین آنسوؤں سے روتے تھے کہ اگر خلیفہ نہ رہا اور اس کے اختیارات باقی نہ رہے تو پھر اسلام کا کیا ہوگا صورت حال بڑی مایوس کن تھی اور پاکباز وصالح مسلمانوں کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خلافت کے لیے اپنی جان دیدیں۔ اردو کا مشہور ترانہ "بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو" گھر گھر لوگوں کی زبان پر تھا جس کی آواز بازگشت ہر مسلمان کے دل سے آتی تھی اور وہ کچھ اسی جذبہ کی عکاسی کرتا تھا۔

تحریکِ خلافت کی اس ہماہمی میں ہندوستانی مسلمان خود اپنے ذاتی مسائل سے یکسر بیگانہ غافل رہے۔ کیونکہ ۱۹۱۲ء سے انھیں یہ درس دیا جاتا رہا تھا کہ پان اسلامزم سے ہی نہ صرف ان کی ساری توقعات وابستہ ہیں بلکہ یہ ایک مذہبی فریضہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب فضول اور عبث

ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ کچھ دور اندیش اور صاحب بصیرت رہنمایان قوم مسلمانوں کے معاملات پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے لیکن عام مسلمانوں کی نظر میں ان کی تعلیمی کوئی اہمیت نہ تھی۔ انھیں صرف اپنے مذہبی ادارہ "خلافت" سے غرض تھی۔ مصطفیٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں ترکی کو جو پے در پے کامیابیاں حاصل ہوئیں اس سے ترکی کی حیثیت نے بہت اہمیت اختیار کر لی تھی۔ اور مسلمانوں کو ایک بار پھر یہ امید ہو چلی تھی کہ ایک مرتبہ پھر خلافت اپنے پورے ترک و احتشام اور عظمت کے ساتھ قائم ہوگی۔ یہ باتیں بہت دل خوش کن تھیں لیکن ایک اور زبردست صدمہ مسلمانوں کا مقسوم تھا۔ مسلمانوں کے رہنما انھیں ترکی اور خلافت کے لیے ہر ممکن قربانی کے لیے آمادہ کرتے رہے لیکن انھیں ترکی کے اندر رونما ہونے والے واقعات سے یکسر لاعلم رکھا۔ شاید رہنمایان قوم خود بھی لاعلم تھے۔ خلافت کی عظمت اور شان و شوکت کی بازیابی تو دور رہی مصطفیٰ کمال نے خود خلافت ہی کو ختم کر دیا۔ اور خلیفہ کو ترکی سے نکال دیا۔ تحریک خلافت کے رہنماؤں کے لیے یہ ایک جانکاہ صدمہ تھا کچھ دنوں تک وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو دلاسہ دیتے رہے کہ یہ خبریں جھوٹی تھیں۔ اخباروں میں جلی حروف میں کچھ اس قسم کی سرخیاں قائم کی جاتی رہیں کہ "رائٹر جھوٹا ہے" "پھر وہی برطانوی پروپیگنڈہ" وغیرہ۔ بعد میں ایک اور نادر نظریہ پیش کیا گیا کہ "مصطفیٰ کمال خود خلیفہ بننا چاہتا ہے اس لیے اس نے ضعیف اور ناکارہ خلیفہ کو نکال دیا ہے جس نے بڑی بے شرمی کے ساتھ اتحادیوں سے سمجھوتہ کر لیا" لیکن آہستہ آہستہ جذباتیت کی گہر آلود فضا میں جب حقیقت کی کرنیں چمکیں تو لوگوں پر ساری سچائی واشگاف ہو گئی۔ بیچارے رہنماؤں کا برا حال تھا۔ ان کی حیثیت بڑی مضحکہ خیز ہو کر رہ گئی تھی۔ انھوں نے اب تک تو یہ کہا تھا کہ اسلام کے لیے خلافت کا ادارہ لازمی تھا۔ لیکن خود ترکی میں ایک شخص ایسا ابھرا جو نہ صرف یہ کہ اس نقطۂ نظر سے ہی متفق نہ تھا بلکہ اس نے خلافت کی اس قدیم عمارت ہی کو ڈھا دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ تاریخ نے واقعی بڑی ستم ظریفی کی اور ایسے رحمانہ مذاق کیا۔

کمال پاشا کی سربراہی میں ترکی میں سیکولر جمہوری حکومت کے قائم ہوتے ہی تحریک خلافت نہ صرف ماند پڑ گئی بلکہ یوں سمجھئے کہ بالکل ختم ہو گئی۔ اس تحریک کے بے جان ہونے سے عدم تعاون کی تحریک بھی بری طرح متاثر ہوئی۔ اسی کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کے درخشاں امکانات بھی سیم صبح گاہی کی طرح معدوم ہو گئے۔ خلافت کے ختم ہو جانے سے ہندوستانی مسلمانوں کی عام پالیسی پر بھی اثر پڑا

لیکن مولانا محمد علی کے لیے یہ نہ صرف قومی نقصان تھا بلکہ ایک عظیم ذاتی صدمہ بھی تھا۔ یہ نقطۂ نظر کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مذہبی اعتبار سے ترکی کے خلیفہ کے تئیں کوئی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، ان کا نہیں تھا بلکہ یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے تھی۔ مولانا آزاد جدید مسلم ہندوستان میں پان اسلامزم کے داعی تھے لیکن مولانا محمد علی نے اپنی پرکشش اور فعال شخصیت اور اپنی پرجوش خطابت سے مولانا آزاد کو اس تحریک کی لیڈرشپ سے الگ کر کے زمام قیادت خود اپنے ہاتھ میں لے لی۔ لوگ مولانا محمد علی کو خلافت تحریک کا لیڈر سمجھتے تھے لیکن اس تحریک کے دم توڑتے ہی ان کی سیاسی حیثیت بحیثیت خلافت لیڈر کے کچھ گر گئی۔ لیکن اس خود اس سے کہیں بڑا صدمہ انھیں اٹھانا پڑا۔ ان کے پاس سے وہ سب کچھ چلا گیا جو برسوں سے ان کے لیے روحانی تقویت کا باعث تھا۔ وہ اساس ہی ختم ہو گئی جس پر ان کی سیاسی پالیسی قائم تھی۔

مولانا محمد علی کچھ عرصے تک تو پان اسلام ازم کے اپنے نظریہ پر قائم رہے۔ مکہ کی ایک کانفرنس میں ہندوستان کے اس مرد مجاہد اور غیرت پسند نے ابن سعود کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنی نو حاصل سلطنت حجاز کو ایک مثالی اسلامی جمہوریہ کی شکل دیں لیکن ان کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ مایوس ناکام اور حوصلہ شکنی میں مبتلا دوسرے ہندوستانیوں کی طرح مولانا محمد علی کو بھی اپنے ملک کے اندرونی مسائل کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ادھر بھی امکانات کچھ زیادہ روشن نہیں تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے شاندار و درخشاں مگر مختصر دور کی جگہ اب فرقہ وارانہ فسادات کا دور دورہ تھا۔ چوری چورا کے واقعہ کے فوراً بعد ہی گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک واپس لے لی تھی۔ تحریک خلافت اور عدم تعاون کی تحریک باہم دگر اس طرح گتھی ہوئی تھیں کہ انھیں علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نتیجہ ظاہر تھا مالابار کے موپلاؤں نے خلافت کے لیڈروں کی آواز پر بڑی گرم جوشی کے ساتھ لبیک کہا تھا۔ اب وہ بے رہنما اور بے ہدایت تھے اور کسی حد تک بے مقصد بھی۔ اس عجیب صورت حال میں انھوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور بہت ہی سنگین فسادات چھڑ گئے۔ گو اس "موپلا بغاوت" کو بڑی سختی سے کچل دیا گیا لیکن اس کا ردعمل بہت بھیانک ہوا۔ شمالی ہندوستان خصوصاً پنجاب میں فسادات کا ایک سلسلہ چھڑ گیا۔ شمالی ہندوستان کے اسی حصے میں نالا "شدھی اور سنگٹھن" کی تحریک اٹھی اور یہی وہ سرزمین تھی جہاں سے "تبلیغ و تنظیم" کی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ جنوبی ہند سے بہت دور ہنگامہ و شورش کے لیے ہمہ وقت تیار اسی پنجاب میں مالابار کے المیہ کا ردعمل یہ ہوا کہ ہندو مسلم اتحاد

کا جنازہ نکل گیا[۱] ڈاکٹر مونجے نے سنگٹھن تحریک کی ابتدا کی۔ چوری چورا کے واقعہ کے فوراً بعد آریہ سماج کے ایک قبیلہ سوامی شردھانند نے ایک تحریک 'شدھی تحریک' کے نام سے شروع کی۔ جب ہندو مسلم اتحاد کا آغاز ہوا تھا تو یہی سوامی شردھانند تھے جن کو مسلمان ایک جلوس میں دہلی کی جامع مسجد لے گئے تھے اور انھیں پر غیر معمولی اعزاز دیا تھا کہ وہ مسجد کے منبر سے مسلمانوں کو خطاب کریں۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور دیگر حضرات نے شدھی اور سنگٹھن تحریکوں کے جواب میں تبلیغ و تنظیم کی تحریکیں چلائیں۔ مولانا محمد علی نے برادران ملت کو تبلیغ و تنظیم کی ان تحریکوں میں حصہ نہ لینے کی تلقین کی اور رسوائی مول لی۔[۲] تنظیم اور سنگٹھن میں حاصل کی ہوئی تربیت کو آزمانے کے لیے فریقین بے تاب تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نے ایک دوسرے پر آتش زنی، قتل و غارت اور لوٹ مار کے دروازے کھول دئے۔ کوہاٹ۔ پنجاب، مالابار اور پانی پت جیسے خون ریز ڈرامے مختلف مقامات پر اسٹیج کئے گئے۔ اس کربناک حقیقت کے پیش نظر مولانا محمد علی ہندو قوم پرستوں سے یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ وہ ہندو فرقہ پرستوں کے خلاف سرگرم ہو جائیں گے۔ بہت سے مسلمان تحریک خلافت اور انڈین نیشنل کانگریس سے بدظن ہو گئے تھے اور ان کی وفاداریاں متزلزل ہو گئیں کیونکہ انگریزوں سے تعاون کرنے والے وفادار مسلمانوں نے "ہندو مسلم اتحاد" کے "نتائج" کی طرف نہایت طنز آمیز اشارے کرنا شروع کر دئے تھے۔[۳] مولانا محمد علی قوم پرست ہندوؤں سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ہندو فرقہ پرستوں سے خبردار رہیں گے جنہوں نے یہ معاندانہ ماحول پیدا کر دیا تھا۔ مولانا کو اس میں مایوسی ہوئی۔ ہندو قوم پرستوں نے ہندوؤں کی فرقہ دارانہ[۴] تحریک کی مذمت نہیں کی۔ "آخر مجبور ہو کر انھوں نے مولانا ابو الکلام آزاد اور دوسرے بزرگوں کی معیت میں کانپور کانگریس کے موقع پر (گاندھی جی سے) یہ التجا کی کہ اب وہ اپنا قفل خاموشی توڑیں اور اس مخالف فضا کا مقابلہ کر کے نسبتاً اچھی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں۔[۵]" اس تجویز پر گاندھی جی خاموش رہے لیکن اس کے کچھ ہی دنوں بعد یکم مئی ۱۹۲۵ء کو انھوں نے کلکتہ کے مرزا پور پارک میں

---

۲ کامریڈ۔ دہلی ۲۴ر جولائی ۱۹۲۵ء

۳ ایضاً ۹ر جنوری ۱۹۲۵ء

۴ ایضاً ۲۴ر جولائی ۱۹۲۵ء

۵ رئیس احمد جعفری سیرت محمد علی، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۳۲ صفحہ ۴۱۷

لیکن مولانا محمد علی کے لیے یہ نہ صرف قومی نقصان تھا بلکہ ایک عظیم ذاتی صدمہ بھی تھا۔ یہ نقطۂ نظر کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مذہبی اعتبار سے ترکی کے خلیفہ کے تئیں کوئی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، ان کا نہیں تھا بلکہ یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے تھی۔ مولانا آزاد جدید مسلم ہندوستان میں پان اسلامزم کے داعی تھے۔ لیکن مولانا محمد علی نے اپنی پرکشش اور فعال شخصیت اور اپنی پرجوش خطابت سے مولانا آزاد کو اس تحریک کی لیڈر شپ سے الگ کر کے زمام قیادت خود اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ لوگ مولانا محمد علی کو خلافت تحریک کا لیڈر سمجھتے تھے لیکن اس تحریک کے دم توڑتے ہی ان کی سیاسی حیثیت بحیثیت خلافت لیڈر کے کچھ گر گئی۔ لیکن اس خود اس سے کہیں بڑا خمیازہ اٹھانا پڑا۔ ان کے پاس سے وہ سب کچھ چلا گیا جو برسوں سے ان کے لیے روحانی تقویت کا باعث تھا۔ وہ اساس ہی ختم ہو گئی جس پر ان کی سیاسی پالیسی قائم تھی۔

مولانا محمد علی کچھ عرصے تک تو پان اسلام ازم کے اپنے وژن پر قائم رہے۔ مکہ کی ایک کانفرنس میں ہندوستان کے اس مرد مجاہد اور غیرت پسند نے ابن سعود کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنی نو حاصل سلطنت حجاز کو ایک مثالی اسلامی جمہوریہ کی شکل دیں لیکن ان کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ مایوس، ناکام اور حوصلہ شکنی میں مبتلا دوسرے ہندوستانیوں کی طرح مولانا محمد علی کو بھی اسے ملک کے اندرونی مسائل کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ادھر بھی امکانات کچھ زیادہ روشن نہیں تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے شاندار و درخشاں مگر مختصر دور کی جگہ اب فرقہ وارانہ فسادات کا دور دورہ تھا۔ چوری چورا کے واقعہ کے فوراً بعد ہی گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک واپس لے لی تھی۔ تحریک خلافت اور عدم تعاون کی تحریک باہم دگر اس طرح گتھی ہوئی تھیں کہ انھیں علاحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نتیجہ ظاہر تھا مالابار کے موپلاؤں نے خلافت کے لیڈروں کی آواز پر بڑی گرم جوشی کے ساتھ لبیک کہا تھا۔ اب وہ بے رہنما اور بے ہدایت تھے اور کسی حد تک بے مقصد بھی۔ اس عجیب صورت حال میں انھوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور بہت ہی سنگین فسادات چھڑ گئے۔ گو اس "موپلا بغاوت" کو بڑی سختی سے کچل دیا گیا لیکن اس کا ردعمل بہت بھیانک ہوا۔ شمالی ہندوستان خصوصاً پنجاب میں فسادات کا ایک سلسلہ چھڑ گیا۔ شمالی ہندوستان کے اسی حصے میں بالآخر "شدھی اور سنگٹھن" کی تحریک اٹھی اور یہی وہ سرزمین بھی جہاں سے "تبلیغ و تنظیم" کی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ جو بی ہند سے بہت دور ہنگامہ و شورش کے لیے ہمہ وقت تیار اسی پنجاب میں مالابار کے المیہ کا ردعمل یہ ہوا کہ ہندو مسلم اتحاد

کا خمیازہ نکل گیا[۱]۔ ڈاکٹر مونجے نے سنگٹھن تحریک کی ابتدا کی۔ چوری چورا کے واقعہ کے فوراً بعد آریہ سماج
کے ایک لیڈر سوامی شردھانند نے ایک تحریک ' شدھی تحریک ' کے نام سے شروع کی۔ جب ہندو مسلم
د کا آغاز ہوا تھا تو یہی سوامی شردھانند تھے جن کو مسلمان ایک جلوس میں دہلی کی جامع مسجد لے گئے
تھے اور انھیں یہ غیر معمولی اعزاز دیا تھا کہ وہ مسجد کے منبر سے مسلمانوں کو خطاب کریں۔ ڈاکٹر سیف الدین
کچلو اور دیگر حضرات نے شدھی اور سنگٹھن تحریکوں کے جواب میں تبلیغ و تنظیم کی تحریکیں چلائیں۔ مولانا
محمد علی نے برادرانِ ملت کو تبلیغ و تنظیم کی ان تحریکوں میں حصہ نہ لینے کی تلقین کی اور رسوائی مول لی[۲]۔
تنظیم اور سنگٹھن میں حاصل کی ہوئی تربیت کو آزمانے کے لیے فریقین بے تاب تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں
نے ایک دوسرے پر آتش زنی، قتل و غارت اور لوٹ مار کے دروازے کھول دئے کوہاٹ، پنجاب،
الاہار اور پانی پت جیسے خوں ریز ڈرامے مختلف مقامات پر اسٹیج کئے گئے۔ اس کربناک حقیقت کے پیشِ نظر
مولانا محمد علی ہندو قوم پرستوں سے یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ وہ ہندو فرقہ پرستوں کے خلاف سرگرم
ہوجائیں گے۔ بہت سے مسلمان تحریکِ خلافت اور انڈین نیشنل کانگریس سے بدظن ہوگئے تھے اور
ن کی وفاداریاں متزلزل ہوگئیں کیونکہ انگریزوں سے تعاون کرنے والے وفادار مسلمانوں نے "ہندو
مسلم اتحاد" کے "نتائج" کی طرف نہایت طنز آمیز اشارے کرنا شروع کر دئے تھے[۳]۔ مولانا محمد علی
قوم پرست ہندوؤں سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ہندو شر پسندوں سے خبردار رہیں گے جنھوں نے یہ
معاندانہ ماحول پیدا کر دیا تھا۔ مولانا کو اس میں مایوسی ہوئی۔ ہندو قوم پرستوں نے ہندوؤں کی فرقہ وارانہ[۴]
تحریک کی مذمت نہیں کی۔ "آخر مجبور ہو کر انھوں نے مولانا ابو الکلام آزاد اور دوسرے بزرگوں کی معیت
میں کانپور کانگریس کے موقعہ پر (گاندھی جی سے) یہ التجا کی کہ اب وہ اپنا قفلِ خاموشی توڑیں اور
س مخالف فضا کا مقابلہ کرکے نسبتاً اچھی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں[۵]۔" اس تجویز پر گاندھی جی
خاموش رہے لیکن اس کے کچھ ہی دنوں بعد یکم مئی ۱۹۲۵ء کو انھوں نے کلکتہ کے مرزا پور پارک میں

---

[۲] کامریڈ۔ دہلی ۲۴ جولائی ۱۹۲۵ء

[۳] ایضاً ۹ جنوری ۱۹۲۵ء

[۴] ایضاً ۲۴ جولائی ۱۹۲۵ء

[۵] رئیس احمد جعفری: سیرتِ محمد علی، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۳۲، صفحہ ۳۱۷

تقریر کرتے ہوئے ایک عجیب و غریب بات کہی۔ انھوں نے کہا:

"آج کل تو میں صرف اسا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اگر ہم اپنے ملک کی نجات چاہتے ہیں تو کسی نہ کسی دن ہم ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد ہونا ہے۔ لیکن اگر ہمارے مقدر میں یہی لکھا ہے کہ متحد ہونے سے پہلے ہم ایک دوسرے کا خون بہائیں تو پھر میں یہ کہوں گا کہ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی ہمارے لیے مفید ہے۔"[1]

مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی اس درخواست پر گاندھی جی کی سرد مہری یا بے اعتنائی نے مولانا محمد علی کو ۱۹۳۰ء میں اپنی مایوسی کا ان الفاظ میں اظہار کرنے پر مجبور کیا:

"ہم نے کہ جو دس برس تک گاندھی جی کے ساتھ ہر سرد و گرم میں شریک رہے، ان پر یہ بات واضح کی لیکن ہندوؤں میں خود اپنی اور پنڈت موتی لال نہرو کی مقبولیت قائم رکھنے کی ان کی خواہش نے یہ تصفیہ نہ ہونے دیا۔"[2]

اسباب خواہ کچھ بھی رہے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ترکی میں خلافت کے خاتمے اور عدم تعاون کی تحریک کے واپس لیے جانے سے ہندوستانیوں کے ہر حلقے پر خصوصاً مسلمانوں پر بڑا خراب اثر پڑا۔ سر شفاعت احمد خاں نے بڑی دیانت داری سے اس صورت حال کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"۱۹۲۲ء کے بعد خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کی ناکامی اور بے انصافیوں کے خلاف ردعمل پورے ہندوستان میں محسوس ہونے لگا۔ قوم سرد ہو گئی۔ اور اس تحریک کا اثر جلد ہی زائل ہو گیا۔ اگر ایک طرف مسلمانوں کی سیاسی اور تعلیمی حالت پر اس کا تباہ کن اثر پڑا تو دوسری طرف بلا شبہ اس نے مسلمانوں کو عمل پر آمادہ کیا اور انھیں اپنے ملک کی سیاسی زندگی کا ایک اہم عنصر بنا دیا۔ تحریک خلافت کے زوال نے مسلمانوں کے سیاسی پروگرام میں مایوس کن بدنظمی اور ابتری پیدا کر دی۔ آئندہ کے پانچ سال یعنی ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۸ء تک کا زمانہ پراگندگی اور تذبذب کا زمانہ تھا۔

---

[1] پٹابھی سیتارمیا: دی ہسٹری آف انڈین نیشنل کانگرس۔ جلد اول، مئی ۱۹۴۶ء صفحہ ۲۹۸

[2] انڈین راؤنڈ ٹیبل کانفرنس، مائی نورٹیز کمیٹی ڈاکیومینٹس۔ روئداد اجلاس (تا ۱۶) صفحہ

مسلمانوں میں سیاسی عقیدے اور سیاسی حوصلے دونوں کا فقدان تھا دستوری اور فرقہ وارانہ مسائل پر مذاکرات اور بحث و مباحثے کا ایک لا متناہی سلسلہ چلتا رہا۔ دستوری اور فرقہ وارانہ دونوں مسائل کے حل کے لیے بہت سے فارمولے ایجاد کیے گیے۔ لیکن وہ سب بے اثر اور بے کار ثابت ہوئے۔ ایک طرف تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں اور دوسری طرف کانگریس اور حکومت کے درمیان سال بہ سال کشیدگی بڑھتی گئی [۸]

یہ "پراگندگی" یہ "تذبذب" اور اختلاف موجودہ صدی کے پہلے تیس برسوں میں ہندوستانی مسلمانوں کا خاصہ رہا ہے۔ "ہندوستانی مسلمان یا یوں کہئے کہ ان کے اعلیٰ اور متوسط طبقے" بقول سید عابد حسین، "ایک دہری کشمکش سے دوچار تھے۔ ان کے بہت سے اور بعض اوقات باہم متصادم مقاصد مثلاً سیاسی اور اقتصادی بہتری کی ان کی شدید خواہش، اپنے مذہبی حقوق کے تحفظ پر ان کا اصرار، قومی آزادی سے ان کا لگاؤ، انھیں مختلف سمتوں میں کھینچ رہے تھے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے بہار یک وقت مسلم لیگ کے بھی رکن تھے، جو مسلم فرقہ پرستی کی نمائندگی کرتی تھی، خلافت کانفرنس اور دوسری ایسی تنظیموں کے بھی ممبر تھے جو مذہبی قوم پرستی کی نمائندہ تھیں، نیشنل کانگریس میں بھی شامل تھے جو سیکولر قوم پرستی کی حامی تھی۔ ان دنوں مسلمانوں میں خالص سیکولر اور قوم پرستانہ موقف عنقا تھا۔ اور مسلمانوں ہی میں کیا ہندوؤں اور دوسرے فرقوں کی بھی یہی حالت تھی۔" [۹]

تحریک خلافت کا مسلمانوں پر براہ راست کیا اثر ہوا یہ بہت واضح طور پر ظاہر نہ ہو سکا کیونکہ اس تحریک کی ناکامی کے بعد مسلمان فرقہ واریت کی گرفت میں آتے چلے گئے۔ اور ساتھ ساتھ ان کے ذہنوں پر اکثریت کے ہاتھوں سیاسی طور پر پامال ہو جانے کا کابوسی خوف طاری و مسلط تھا ان کے خلاف ان کے عمل اور اُن کا وژن سب کے سب داخلیت زدہ اور فرقہ وارانہ عصبیت کا شکار ہو چکے تھے خود مولانا محمد علی کے ان الفاظ میں صورت حال کچھ یوں تھی:

"سیاسی ضعف نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی بصیرت پر اثر ڈالا۔ اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے ہر امر ور دیر ور میں بدلتا گیا ورد مشترک اور مشترک مصائب کا

---

[۸] سر شفاعت احمد خاں۔ دی انڈین فیڈریشن۔ لندن ۱۹۳۷ء صفحہ ۳۲-۳۳۲

[۹] سید عابد حسین دی ڈیسٹنی آف انڈین مسلمز، بمبئی، ۱۹۶۵ء صفحہ ۸۰-۷۹

احساس جاتا رہا اور بتدریج نظروں سے محو ہوگیا۔ یہاں تک کہ محض تھوڑا ہی سا وقت گزرنے کے بعد آج کی تکلیفیں کل کی خوفناک یادوں کو یکسر محو کر دیتی ہیں۔ اس پر طرفہ خرابی یہ کہ ضعفِ بصر کے ساتھ کج نگاہی کا اور اضافہ ہوگیا۔ ہر فرد کو صرف ان تکلیفوں کا خیال تھا جو اس نے اٹھائیں لیکن یہ دیکھنے کی زحمت نہ کی کہ اس فرقے نے دوسرے کو کتنی ایذا پہنچائی۔[1]

تحریک خلافت کا انجام مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے بھی تشویش کا باعث تھا۔ وہ بھی اپنے درد کا اظہار بڑی شدت سے کرتے ہیں۔ اس وقت کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے کل ہند خلافت کانفرنس منعقدہ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۵ء میں اپنے خطبۂ صدارت میں کہا:

"خلافت کی حرکت کے ساتھ ہی ملک کی آزادی و استقلال کی جو متحدہ حرکت شروع ہوئی تھی اور جس کی خصوصیتوں نے بہت جلد دنیا کی توجہ اور دلچسپی حاصل کر لی تھی ایک خاص منزل تک پہنچ کر رک گئی اور اس کے بعد اس کے ردعمل (ری ایکشن) کے اثرات نہایت تیزی کے ساتھ ظاہر ہونا شروع ہوگئے۔ اب سرگرمی کی جگہ افسردگی ہے۔ بیداری کی جگہ غفلت ہے۔ اتحاد کی جگہ انتشار ہے، ملک و قوم کی جگہ فرقہ و جماعت کی صدائیں ہیں اور کام کی رہی سہی قوتوں کے لیے نئے نئے گمراہ کرنے والے فتنے پیدا ہو رہے ہیں۔"[2]

ہندوستانی مسلمانوں کی تحریک سے قبل اور تحریک کے بعد کی ذہنی کیفیت کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"جہاں تک مسلمانانِ ہند کی جماعتی زندگی کا تعلق ہے ۱۹۲۰ء کی ابتدا سے ۱۹۲۵ء کا خاتمہ ہر اعتبار سے مختلف ہے۔ اگر انھیں دو مخالف سمتوں سے تعبیر کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ گذشتہ حرکت کا سب سے زیادہ موثر اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں میں متحدہ مقصد کے لیے متحدہ جدوجہد کی سرگرمی پیدا ہوئی۔ ان کی پراگندگی نظم و انضباط سے آشنا ہوئی۔ انھوں نے ہندوستان کے موجودہ دور میں پہلی مرتبہ مقصد، قوم، فرض اور ایثار کی راہ میں قدم اٹھایا ۔ لیکن موجودہ حالت بالکل اس سے متضاد ہے۔ گذشتہ حرکت جو پوری تیزی کے ساتھ جاری تھی، اچانک رک گئی اور اس کے صدمے سے ان کی جمعیت

---

[1] کامریڈ، ۹ جنوری ۱۹۲۵ء ص ۱۹

[2] خطبات آزاد، مرتبہ شورش کاشمیری، لاہور مکتبہ شعر و ادب، ۱۹۴۴ء، ص ۴۲

بھی بکھر گئی۔ اب نظم و انضباط کی جگہ ہر طرف پراگندگی ہے۔ افکار پریشان ہیں طبیعتیں غیر مطمئن ہیں یقین اور اعتقاد ہل گیا ہے۔ اور لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ کوئی راستہ ان کے سامنے [illegible] عام طور پر ملک میں غفلت و گمراہی کی جو آب و ہوا پیدا ہو گئی ہے وہ خود بھی اسی میں بہہ رہے ہیں۔ اور حالات کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے الگ ہو کر اپنے فکر و دماغ کی درستی کی انھیں مہلت نہیں ملتی[12]۔"

خلافت کمیٹی بھی گومگو کے عالم میں تھی۔ خلافت کا مسئلہ تو تقریباً ختم ہو گیا تھا لیکن اب ملک کے مختلف گوشوں سے ایک ایسی تنظیم کے قیام کے مطالبات ابھرنا شروع ہوئے جو شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں کا مقابلہ کر سکے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ خلافت کمیٹی، ہندو مہاسبھا کی مثنیٰ یعنی جواب بن جائے۔ یا پھر ایک بہت ہی ہمہ گیر تنظیم انجمن اسلام کے نام سے قائم کی جائے۔ مسلمانوں کے لیے اس تجویز سے بڑھ کر خوش کن کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن خلافت کمیٹی یہ مطالبہ اس وقت تک پورا نہیں کر سکتی تھی جب تک کہ اس کے دستور میں خاطر خواہ ترمیم ہو کر اس کے دائرۂ کار میں اضافہ نہ کر دیا جاتا۔" لیکن اس قسم کی تنظیموں کے قائم کرنے میں ان کے پس و پیش کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھیں اپنے ان ہندو بھائیوں کا پاس تھا جو ان کے ساتھ عدم تعاون کی تحریک میں شریک تھے اور دوسرے ان کو انھیں یہ خوف بھی تھا کہ وہ خواہ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں افتراق ضرور پیدا ہو جائے گا۔ اور اس سے وہ خلافت کے مفاد میں ہر قیمت پر احتراز کرنا چاہتے تھے

غرض یہ کہ ایک بے عملی اور جمود کی کیفیت طاری تھی۔ مگر یہ بے عملی ان کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مزید بے عملی اسلام اور مسلمانوں سے غداری تھی[14]۔" اس لیے ۱۱ مئی ۱۹۲۴ء کو خلافت تنظیم کی ورکنگ کمیٹی نے مولانا ابوالکلام آزاد اور اڈیٹر تبصرہ ہذا (مولانا محمد علی) کو سوچنے کے بعد بالآخر بمبئی میں یہ طے کیا کہ اس کے دائرہ عمل میں اضافہ کر دیا جائے اور اب ہندوستانی مسلمانوں کے اندرونی معاملات اور سرگرمیوں کو چلانے، منظم کرنے اور نگرانی کے فرائض بھی شامل کر دیے جائیں اور وہ تمام اقدامات کیے جائیں جو ان کی زندگی کے ہر شعبہ کے لیے مفید ہوں خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، اقتصادی ہوں یا تعلیمی[15]۔"

---

۱۲ ایضاً ص ۵۴ ۔ ۱۳ کامریڈ دہلی ۲۴ جولائی ۱۹۲۵ء صفحہ ۳۵

۱۴ ایضاً ص ۳۶ ۔ ۱۵ ایضاً ص ۳۶

بہرحال مسلمانوں میں تنظیم کی ضرورت ہر جگہ محسوس کی جارہی تھی۔ کامریڈ میں ایک مراسلہ نگار نے لکھا کہ گذشتہ چند برسوں سے مسلمان بڑے اشتیاق کے ساتھ اپنے دلوں میں اس امید کی پرورش کرتے رہے ہیں کہ ہندو مسلم تنازعات بالآخر ختم ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے اب مسلمانوں کی ازسرِ نو تنظیم وقت کی اہم ترین ضرورت بن گئی ہے۔ اب طے یہ کیا گیا ہے کہ ایک مسلم اخبار جاری کیا جائے اس مقصد کے لیے سر علی امام، حسن امام صاحب اور سلطان احمد صاحب نے کثیر رقمیں عطا فرمائی ہیں[۱۶] کچھ اسی قسم کے جذبات کا اظہار خلافت ورکنگ کمیٹی نے اس موقعہ پر کیا تھا جب مہاتما گاندھی نے اپنی سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تھی۔ "دی ورک بفور دی مسلمانز" کے عنوان سے خلافت ورکنگ کمیٹی نے ایک بیان شائع کیا جس میں کہا گیا تھا کہ :

"ان دنوں اکثر و بیشتر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آخر خلافت تنظیم کا اب پروگرام کیا ہے؟ سب سے صحیح جواب یہ ہے کہ "سب کچھ"۔ وہ کون سا کام ہے جسے مسلمان ٹھیک طور سے انجام دے رہے ہیں اور جس میں اصلاح کی ضرورت نہیں؟ خلافت آرگنائزیشن زندگی کے ہر شعبے میں تنظیم نو اور اصلاح کے کام اپنے ذمہ لے گی۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر اس کا مقصد اتحاد اور خود اعتمادی پیدا کرنا ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ مسلمان اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور اسلام اور ہندوستان کی آزادی کے لیے سب کے ساتھ مل کر سب کے خلاف لڑیں ... خلافت تنظیم آزادی کے لیے ہے غلامی کے لیے نہیں۔ اور جس طرح اس نے مسلمانوں کو برطانیہ کی محکومی میں نہیں رہنے دیا اسی طرح اب یہ مسلمان قوم کو کسی دوسری قوم یا پارٹی کے ماتحت بھی نہیں رہنے دے گی۔ یہ آزادی کی بھوکی ہے اور محض آقاؤں کی ادلا بدلی سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کو اپنی دونوں آنکھیں کھلی رکھ کر صورت حال کا مشاہدہ کرنا چاہیئے۔

مسلمان اپنی پوری قوت سے ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں جو آزادی کو ہندوستان کا پیدائشی حق سمجھتے ہوں۔ بشرطیکہ اسی طرح وہ ہندوستان کے انتظام و انصرام میں ہندوستانی مسلمانوں کی آزادانہ اور مساویانہ شرکت کے پیدائشی حق کو بھی تسلیم کریں[۱۸]"

---

[۱۶] ایضاً ۱۴ اگست ۱۹۲۵ء [۱۸] مسلمز اینڈ دی کانگرس، جنرل سکریٹری سنٹرل خلافت کمیٹی آف انڈیا بمبئی ۱۹۳۰

اس بیان سے اگر ایک طرف اکثریت کے خلاف بے اعتمادی وبے اعتباری اور شک وشبہ کی بو آتی ہے تو دوسری طرف اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ مسلمانوں کو نہ صرف اتحاد و شیرازہ بندی کی شدید ضرورت تھی بلکہ اپنی سیاسی حیثیت کا بھی مکمل احساس تھا۔ جو ملکی سیاسی زندگی میں ایسا مقام پیدا کرنے کا متقاضی تھا۔ اسی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا تھا کہ "مجھے اس سے انکار ہے کہ ہندوستان کی سیاست وعمل کی زندگی میں مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا چاہیے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ بحالت موجودہ اگر وہ کارکن حلقہ باقی نہ رہا جو خلافت کمیٹی کے نام سے پہچانا جاتا تھا تو لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ مسلمانوں کی جماعتی سرگرمیوں کو آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے ہٹنے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور گذشتہ تحریک نے اعتقاد وعمل کی جو ایک خاص آب وہوا پیدا کر دی ہے وہ ایک عرصے کے لیے معدوم ہو جائے۔"[18]

اس میں شک نہیں کہ خلافت تحریک نے "اعتقاد وعمل" کی فضا پیدا کر دی تھی۔ مسلمانوں میں آزادی کے خیال سے ایک نیا جوش وولولہ تھا لیکن "تحریک خلافت دوسرے ملکوں میں بسنے والے برادران اسلام کو یورپ کی غلامی سے آزاد کرانے کی ایک ایثار پسندانہ مہم تھی۔ گو تحریک والوں کو اس وقت اس کا احساس نہیں تھا لیکن ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں بلکہ مسلمانوں کو بڑے پیمانے پر ایک عوامی تحریک کو منظم کرنے اور چلانے کے فن سے آشنا کر دیا۔ اس میں خود اعتمادی پیدا کی۔ تحریک خلافت کے بعد اس برصغیر کے مسلمان سیاست دانوں کا لہجہ بدل گیا۔ انھوں نے اس خیال کو اپنے ذہنوں سے یکسر نکال دیا کہ وہ صرف انگریزوں یا ہندوؤں کے رحم وکرم پر زندہ رہ سکیں گے۔ اب وہ میدان عمل میں ایک تیسرے فریق کی حیثیت سے اتر آئے تھے۔"[19]

مسلمانوں کے ایک تیسرے فریق کی حیثیت سے میدان میں آجانے سے مستقبل کے سیاسی حالات نے مختلف رخ اختیار کر لیا۔ تقسیم ملک کے نقطۂ نظر کے محرکات اور پس منظر کو جواہر لال نہرو اس قوم پرستی کا مرہونِ منت سمجھتے ہیں جس کی اس ماحول میں پرورش ہوئی تھی۔ اس نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے جواہر لال نہرو کی ڈسکوری آف انڈیا سے ایک طویل اقتباس یہاں پیش کرنا ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔ تحریک خلافت اور ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں:

---

[18] خطبات آزاد۔ صفحہ ۵۸ [19] اشتیاق حسین قریشی۔ صفحہ ۲۷۸

"یہاں اسلام ازم کے قدیم تعصب انھیں کی کوئی معنویت اب باقی نہیں رہ گئی تھی۔ خلافت ختم ہو چکی تھی تمام اسلامی ممالک پوری طرح قوم پرست ہو گئے تھے انھیں دوسرے ملک کے مسلمانوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ترکی اس معاملہ میں پیش پیش تھا۔ دوسری جگہوں کی طرح ایشیا میں بھی دراصل نیشنلزم ایک حاوی قوت تھی۔ ہندوستان میں قومی تحریک اور زیادہ طاقت ور ہو چکی تھی اور اس نے برطانوی راج کو بار ہا چیلنج کیا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہنوں میں نیشنلزم کے لیے ایک زبردست اپیل تھی اور کثیر تعداد میں مسلمانوں نے آزادی کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا تھا لیکن اس کے باوجود ہندوستانی نیشنلزم پر ہندوؤں کا غلبہ تھا اور اس پر ہندو پن کی چھاپ تھی۔ اس لیے مسلمانوں کے ذہنوں میں ایک کشمکش سی پیدا ہو گئی بہت سوں نے اس نیشنلزم کو قبول کیا اور اپنی پسند کے مطابق اس کے رخ کو ایک مخصوص جہت دینے کی کوشش کی۔ کچھ لوگوں کو اس نیشنلزم سے ہمدردی تھی لیکن اس کے باوجود اس سے الگ تھلگ رہے۔ اور غیر یقینی کیفیت میں رہے۔ لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے ایک اور ہی رخ اختیار کیا جس کے لیے اقبال کی شاعری اور فلسفے نے ان کے ذہنوں کو تیار کیا تھا۔ میری نظر میں تو یہی وہ پس منظر ہے جس کی بنا پر حال ہی میں ہندوستان کی تقسیم کا نعرہ بلند ہوا۔"[20]

تحریک خلافت نے بلا شبہ مسلمانوں میں ایک ایسی بیداری پیدا کر دی تھی جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ "مسلمانوں میں یہ جو بیداری پیدا ہوئی تھی وہ پھیل کر سیاست کے میدان میں بھی داخل ہوئی اور اب وہ سیاسی برتری کی بات بھی سوچنے لگے۔"[21] ڈیسائی بھی یہی نظریہ پیش کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ "ہندوستانی مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے اعتبار سے عدم تعاون کی تحریک کی بڑی تاریخی اہمیت ہے۔ اس سے یہ بات آشکار ہوئی کہ سیاسی شعور جو اس سے پہلے مسلمان دانشور اور مسلمانوں کے اوپری متوسط طبقے تک محدود تھا وہ اب مسلم عوام کے حلقوں میں بھی نفوذ کر گیا ہے یہ درست ہے کہ خلافت کا مسئلہ ایک مذہبی مسئلہ تھا لیکن سوراج کی جدوجہد کے ساتھ اس کا

---

[20] جواہر لال نہرو۔ دی ڈسکوری آف انڈیا، کلکتہ، ۱۹۴۶ء، صفحہ ۱۸-۳۱۷

[21] راجندر پرشاد۔ آٹو بایوگرافی، ۱۹۵۰ء، صفحہ ۱۴۱

رشتہ جڑ جانے کی وجہ سے اس کا اثر یہ ہوا کہ اس سے مسلمانوں میں قومی شعور کی سطح بلند ہوئی۔" [۲۲]

اس بیداری اور اس شعور کو مسلمان نیشنلزم میں اور حکومت برطانیہ کے خلاف جد و جہد میں سمو دینے کے لیے تیار تھے۔ جس طرح دس برس کے عرصے میں مسلمانوں میں شعور بڑھا تھا اس سے اس بات کی نشان دہی ہوتی تھی کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مذہب کو نہ صرف یہ کہ سیاست سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سیاسی جدوجہد کے لیے یہ سنگِ بنیاد کا کام دے سکتا ہے۔ بعد میں پیدا ہونے والے سیاسی حالات نے جن کو وقتاً فوقتاً فرقہ وارانہ کشیدگی متاثر کرتی رہی، حریف سیاسی گروہوں کی ضد اور ان کے رہنماؤں کے غیر مصالحت پسندانہ رویے نے معاملات کو دوسرے رخ پر ڈال دیا۔ اس صورت حال کے ردِعمل میں مسلمان ملکی سیاسی زندگی کے اصل دھارے سے برگشتہ ہونے لگے۔ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے وہ اقلیتوں کے فطری ہراس کا شکار ہو گئے۔ اکثریت کے ہاتھوں اپنے انفرادی تشخص کے گم ہو جانے کے خوف سے مسلمانوں نے سیاسی مسابقت میں خود کو ایک تیسرے فریق کی حیثیت دے لی۔

حکومت کی طرف سے اصلاحات کی متعدد تجاویز نے اس مناقشے کو اور بڑھا دیا۔ فرقہ وارانہ اور دستوری مسائل پر مذاکرات اور مباحثات کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا اور دونوں مسائل کے حل کے لیے متعدد فارمولے وضع کیے گئے لیکن وہ سب غیر موثر اور بے کار ثابت ہوئے۔ ایک طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اور دوسری طرف کانگرس اور حکومت کے مابین سال بہ سال کشیدگی بڑھتی گئی۔ مسلمان اس بات پر بخوبی سمجھ گئے تھے کہ اقتدار کے تبادلے کے بعد وہ تین کے مقابلے ایک کی مستقل اقلیت میں رہیں گے۔ ہندوستان پر صدیوں تک حکومت کرنے والوں کے وارث ہوتے ہوئے وہ اپنی اس حالت پر آزردہ اور کبیدہ خاطر تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ برطانوی دفتر شاہی کے ہاتھوں سے جب اقتدار اکثریت کے ہاتھوں میں منتقل ہو گا تو یہ اکثریت عملاً ایک قلیل التعداد اور خود غرض چند سری حکومت بن کر رہ جائے گی جو اقلیتوں کے حوصلوں اور امنگوں کی طرف بے رحمانہ، غاصبانہ و حاکمانہ رویہ روا رکھے گی جس میں غرور و تکبر اور بے دردی بھی ہو گی۔ ڈاکٹر عبداللہ المامون سہروردی (رکن لیجسلیٹو اسمبلی) کا کم از کم یہی خیال تھا جو انھوں نے انڈین سینٹرل کمیٹی کے لیے اپنی

---

[۲۲] ڈیسائی، اے، آر، سوشل بیک گراؤنڈ آف انڈین نیشنلزم، بمبئی، ۱۹۴۸ء، صفحہ ۳۵۸

مائنورٹی رپورٹ میں ظاہر کیا تھا۔ یہ رپورٹ پارلیمنٹ میں بھی پیش ہوئی تھی۔ لیکن مسلمان اس پوزیشن کو بغیر کسی جدوجہد کے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ بقول ڈاکٹر سہروردی وہ جہد البقا اور بقائے اصلح کے فطری قانونوں کو یہ موقعہ دینا چاہتے تھے کہ یہ قوانین اس مسئلہ کا ایک پائیدار اور مستقل حل پیش کر دیں۔"

مذکورہ بالا قسم کے خدشات اور لیڈروں کے ان رویوں نے باہمی مفاہمت اور مصالحت کے بجائے نفرت، شک وشبہ اور بے اعتمادی کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا۔ دونوں فرقوں کے درمیان خلیج کچھ اس حد تک وسیع ہو گئی کہ اس کو پاٹنے کی ہر پُرخلوص کوشش بری طرح ناکام ہو گئی اور بالآخر تقسیم ملک پر منتج ہوئی۔

تحریک خلافت نے مسلمانوں میں ایک عظیم وطنی جذبہ پیدا کیا، ان کو محسوس ہوا کہ وہ ایک بڑی طاقت ہیں اور اگر وہ اس طاقت کو استعمال کریں تو برطانیہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینک سکتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی محسوس ہوا کہ اس طاقت کے استعمال کے لیے ملک کی تمام جماعتوں سے اتحاد و اتفاق لازمی ہے۔ ہجرت کی تحریک جس طرح ناکام ہوئی اس نے بھی مسلمانان ہند میں اپنے ملک اور وطن سے محبت کے احساس کو تیز کر دیا۔

جو نظارہ ہندو مسلم اتحاد کا خلافت تحریک کے زمانے میں آنکھوں کے سامنے آیا، اس کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئیں۔ تحریک آزادی نے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا، اب صرف ایک جذبہ کارفرما تھا کہ انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے اور اس لیے سارا ہندوستان پیلے کپڑوں، ننگے سر اور ننگے پیر والے رضاکاروں سے بھر گیا اور لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر نکل آئے اور صرف تین نعرہ ہندو مسلمان مل کر لگاتے تھے۔ اللہ اکبر۔ مہاتما گاندھی کی جے۔ مولانا محمد علی کی جے۔

قاضی محمد عدیل عباسی (تحریک خلافت صفحہ ۲۷۲)

انور صدیقی

شعلے کی سرگزشت

"اپنا جوش دریا دلی سے خرچ نہ کرو۔ ہمیں اتنا بڑا شعلہ نہیں چاہیے جو ایک ہی دفعہ بھڑک کر ختم ہو جائے۔ ہمیں تو وہ ٹمٹماتا ہوا چراغ چاہیے جو ساری اندھیری رات میں روشنی دے۔"

مولانا محمد علی، تقریر، لاہور، ۲۰ جنوری ۱۹۲۱ء

مولانا محمد علی کی سیاست، صحافت، شاعری اور خطابت کا جائزہ لیجیے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی سرگرمیوں کے تمام شعبوں پر ایک غضب ناک، تاریک و تند طوفان کی آسمان بوس لہریں سایہ کیے ہوئے ہیں اور اس طوفان کا مرکز ابتدا، مولانا محمد علی کا دماغ نہیں دل ہے۔ ایک طرح کا نیم متمدن قبائلی خروش اپنے تمام تر رومانی وفور کے ساتھ ان کے کاموں اور کارناموں کے جملہ گوشوں پر چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے یہ کیفیت ان کی سیاست کو رومانی، صحافت کو جذباتی اور شاعری کو کم ضبط رومانیت سے قریب کر دیتی ہے۔

مولانا محمد علی کی شخصیت ایک عرصے تک بحث و نظر کا موضوع رہی ہے۔ وہ خود ساری عمر لڑتے رہے، کبھی برطانوی سامراج سے، کبھی تاریک خیالی سے، کبھی دوسروں سے اور کبھی اپنوں سے، جنگ کا استعارہ ان کی زندگی کا غالب استعارہ ہے۔ ان کے بعض عقیدت مندوں کو اس جنگ میں رزمیہ شکوہ نظر آتا ہے۔ بعض اسے Mock Epic یعنی مضحک رزمیے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ارادت اور عداوت میں گھرے ہوئے محمد علی کی شخصیت انصاف طلب ہے۔ اب جب کہ زمانی فاصلے نے عداوت شعاری اور ارادت مندی کی لے کو مدہم کر دیا ہے، محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ وقت

آگیا ہے جب ان کی شخصیت کا حقیقت پسندانہ تعین ممکن رہے۔

اس مضمون میں میں اس بات کی کوشش کروں گا کہ ان کی شاعری کا جائزہ لوں اور ان تمام مسائل سے گفتگو کروں جو ان کی شاعری پیدا کرتی ہے۔

اس ضمن میں پہلا مسئلہ جو مجھ جیسے قارئین کے لیے درپیش ہے وہ یہ کہ مولانا محمد علی کی شاعری ایک خاص دور کی مسلم سیاست، صحافت اور خطابت سے کچھ اس درجہ مرلوط ہے یا مرلوط کر دی گئی ہے کہ آج کے قاری کو جو شاعری سے "شاعری کی حیثیت" سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے، بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ ادب شناسی کے لیے اگرچہ ان محرکات کا جاننا ضروری ہے جو تخلیق شعر میں معاون ہوئے ہیں پھر بھی یہ محرکات ایک اچھے شعر میں کیا سے کچھ بن جاتے ہیں یا اچھی اور بڑی شاعری ان سے کتنی ماورا ہو جاتی ہے، اس کا عرفان بھی ضروری ہے۔ اگر یہ عرفان نہ ہو تو شاعری اور تاریخ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ایک اچھے شاعر اور ناقد کے لیے ضروری ہے کہ وہ واقعہ Fact اور صداقت یعنی Truth میں جو فرق ہے اسے جان سکے ورنہ شاعری واقعہ نگاری اور تنقید، زبان فاری بن کر رہ جاتی ہے۔ اچھی اور بڑی شاعری وقتی اور لازمانی عناصر کو کچھ اس طرح ہم آہنگ کرتی ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دنیا کی بڑی شاعری میں وقت کی تکذیب یا تنسیخ کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ مولانا محمد علی کے مداحوں نے ان کی شاعری کو کچھ اس طرح ملکی سیاست سے پیوست کر کے دیکھا اور دکھایا ہے کہ اس پر صحافت کی طرح Period Literature کا گمان گزرتا ہے اور اسے سراسر ہنگامی سمجھ کر نظر انداز کر دینے کا رجحان پیدا ہوتا ہے اس ضمن میں سب سے بڑی غلطی مولانا محمد علی کی شاعری پر لکھنے والوں نے کی ہے، جو ان کی شاعری کو خلافت تحریک، ترک موالات اور دوسری تحریکوں سے وابستہ کر کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر یہ شاعری اتنی ہنگامی ہے تو اسے شاعری کے زمرے میں نہیں، صحافت اور قومی تاریخ کے زمرے میں رکھنا چاہئے۔ یہ طرز نظر مولانا محمد علی کی شاعری کی درجے کو بلند نہیں کرتا بلکہ شعر شناسوں میں ایک طرح کی تشکیک پیدا کرتا ہے

دوسری دشواری وہ شدید ترین قرب ہے جو مولانا محمد علی کی شخصیت اور شاعری میں پایا جاتا ہے یا جسے ان کی شاعری پر لکھنے والے نمایاں کرتے ہیں۔ شخصیت اور شاعری کا رشتہ جو صدیوں تک

بہت سی تنقیدی گمراہیوں کا موجب تھا۔ بیسویں صدی میں بڑی حد تک حل ہو چکا ہے۔ تخلیق شعر کے دوران شاعر کی ذات صرف Medium یا ذریعے کی حیثیت رکھتی ہے اور شاعری میں جو ذات جھلکتی ہے اور وہ ذہن جو تخلیق کرتا ہے بقول ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ شاعری جن جذبات کی تخلیق کرتی ہے وہ دراصل Art Emotions ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق شخص یا ذات سے فوری طور پر براہ راست نہیں ہوتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ مولانا محمد علی کی شاعری اور شخصیت میں فصل و فاصلہ بہت کم ہے۔ بڑی شاعری ہمیشہ توسیع ذات کا اظہار ہوتی ہے اور بہر طور اظہار سے پہلے آپ سے اور موضوع سخن سے ایک طرح کے Aesthetic Distancing کی طالب ہوتی ہے۔ کیا اس طرح کا فاصلہ محمد علی کی شاعری اور شخصیت میں نظر آتا ہے؟ اور اگر یہ جمالیاتی فاصلہ ان کی شاعری میں موجود ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے۔ یاد رہے کہ اس استعاراتی فاصلے کے تعین میں ان خارجی تلازموں، علامتوں اور پیکروں کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے جو شاعرانہ تجربے کے اظہار کے لیے وضع کرتا ہے۔

شخصیت اور شاعری کے مسئلے کو مذہبی اخلاقیات نے اور بھی الجھا دیا ہے یہ شاعری اور شخصیت میں فاصلے کو شبہے کی نظر سے دیکھتی ہے اور اس فاصلے کو قول و عمل کے تضاد پر محمول کرتی ہے۔ مولانا محمد علی شدید طور پر مذہبی ہونے کی حیثیت سے غالباً اس فریب میں مبتلا ہے کہ شاعر کی ذات اور اس کی شاعری میں فاصلہ کم سے کم رہے تو بہتر ہے۔ وہ یہ بات فراموش کر گئے کہ اس سے جمالیاتی اور فنی نقصان کس قدر ہوتا ہے۔ یہ استعاراتی فاصلہ نہ ہو تو جہاں ایک طرف شاعر صرف نجی جذبے کے ابتدائی استعار کی تنظیم نہیں کر پاتا وہیں دوسری طرف تجربے کی عدم تنظیم و تہذیب کی وجہ سے فنی اظہار کے تقاضے بھی مجروح ہو جاتے ہیں یا ان کی طرف شاعر خاطر خواہ توجہ نہیں کر پاتا۔

مضمون کے ابتداء میں میں نے ان کی سرگرمیوں کے تمام شعبوں پر رومانیت کے عنصر کی حکمرانی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ دراصل ان کی شخصیت اور شاعری کی تمام کوتاہیاں رومانیت کی کوتاہیاں ہیں اور ان کی ناکامی رومانی آدرشوں کی ناکامی ہے۔ رومانیت ذات کے اصرار و اثبات میں جیسے اور جس طرح کے غلو سے کام لیتی ہے وہ جس طرح فن کو صرف اظہار ذات بناتی ہے اور انا کے ستونوں کو جس طرح مستحکم بناتی ہے اس کا نتیجہ عام طور پر یورپ کے رومانی دور میں تباہ کن ثابت ہوا ہے۔ یہ رومانیت

سیاست میں مزاج کو تقویت دیتی ہے اور سماجی سطح پر ایسے افراد کی تخلیق کرتی ہے جو فوق البشر بننے کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یورپ بالخصوص جرمنی میں رومانی فکر و فلسفے کی بدولت آمرانہ رجحانات کو فروغ ہوا تھا۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ نطشے کے رومانی فلسفے کی سب سے اہم تصنیف ہٹلر ہے! ادبی سطح پر بیسویں صدی میں جو نو کلاسکیت کا رجحان ابھرا تھا وہ دراصل ایک اصلاحی ردعمل تھا رومانیت کے محدود تصور ذات کے خلاف اور اس جذباتی عدم تہذیب کے خلاف "جو رسم و رہ رومانیاں" نے پیدا کر دی تھی۔ سیاسی اور سماجی سطح پر یہی کام اسٹراکیت کے ظہور نے بھی انجام دیا ہے۔

مولانا محمد علی کی جذباتیت، ان کی تیز مزاجی، سرفروشی، شعلہ مزاجی، یا مہاہمت پسندی اور سیماب صفتی کو رومانی اسلوب حیات کی روشنی میں دیکھنا اور پرکھنا چاہیے اس لیے کہ مغربی تعلیم کے ذریعے جو عناصر فطری طور پر ان تک منتقل ہوئے ہوں گے، وہ برطانیہ کے اس دور کے عناصر تھے جب مابعد وکٹوریائی عہد کی نیم کلاسکیت کے، رومانی فکر و فلسفہ ایک طرح کی توسیع یافتہ شکل میں برگ و بار لا رہے تھے۔ مغرب سے اخذ کردہ رومانی فکر و فلسفہ کو تقویت اس نئی مشرقیت نے بخشی جو شبلی، سرسید اور اقبال کے ذریعہ ابھر رہی تھی۔ یہ نئی مشرقیت بھی Cantwell Smith کے قول کے مطابق دراصل رومانی تھی۔ مولانا محمد علی کی ذات انھیں دو رومانی اسالیبِ حیات کا مرکزِ اتصال ہے۔ اس نقطۂ نظر سے محمد علی کی شخصیت اور شاعری کو دیکھا جائے تو ممکن ہے ہم ان کے ساتھ بہتر طور پر انصاف کر سکیں۔

حال سے مقدس نا آسودگی رومانیت کی اساس ہے۔ مولانا محمد علی کی حریت پسندی، انقلابیت اور اپنے مخالفین کی طرف ان کے رویے، ان کے رومانی مزاج کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ غیر آسودگی انھیں ہر لمحہ مضطرب رکھتی تھی اور ہر طرح کی مہم جوئی پر آمادہ۔ اس نا آسودگی کے اظہار کے لیے انھوں نے کچھ علامتیں اور علامتیں ماضی میں تلاش کر لی تھیں اس لیے کہ رومانی نا آسودگی ہمیشہ یا تو ماضی کی طرف دیکھتی ہے یا پھر مستقبل میں ایک طرح کی یوٹوپیا بسا لیتی ہے۔ ماضی یا مستقبل میں خفیہ گلستانوں کی تعمیر کے بغیر رومانی مزاج کے شعراء کو اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ مولانا محمد علی نے اس عالم میں مستقبل کا کوئی زبردست وژن تو نہیں دیا ہے ہاں، یہ ضرور ہے کہ انھوں نے ماضی میں اپنی تسکین و تقویت کے لیے

چند علامتوں کو منتخب کر لیا تھا۔ مثلاً اُن کی شاعری میں کربلا اور اس سے متعلق بہت سارے تلازمات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کربلا سے متعلق علامتوں کی تکرار یا ان کا کلیدی طور پر استعمال یقیناً معنی خیز ہے اور تجزیہ طلب ہے۔ غیر شخصی طور پر انھیں واقعۂ کربلا حق و باطل کی جنگ کی حیثیت سے متاثر کرتا ہے۔ ذاتی سطح پر حضرت امام حسین انھیں باطل سے عدم مفاہمت کا پیکر نظر آتے ہیں، وہ اسی طرح کی عدم مفاہمت کو اپنی شخصیت کا جزو سمجھتے ہیں اور انھیں اس بات پر فخر ہے کہ وہ بھی سرفروشی کو باطل سے مفاہمت پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ تخیلی طور پر اپنے آپ کو حضرت امام حسین سے وابستہ اور ہم آہنگ کرتے ہیں اور اپنی پوری زندگی کو کربلا کا استعارہ سمجھتے ہیں۔ علامت سازی کے اس عمل میں انھیں تکمیل خواہش کا سامان نظر آتا ہے۔ انگریزی شاعر شیلی نے جو تسکین اور تائید پرومتھیوس Prometheus کے اساطیری کردار میں محسوس کی تھی اسی طرح کی تسکین و تائید مولانا محمد علی کو حضرت حسین کے کردار میں محسوس ہوئی۔ کربلا کی علامت اور اس کے تلازمات کس کس طرح ان کی شاعری میں بروئے کار آتے ہیں اس کا اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے:

روزِ ازل سے ہے یہی اک مقصدِ حیات
جائے گا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا

مطلب فرات سے ہے نہ آبِ حیات سے
ہوں تشنۂ شہادت و شیدائے کربلا

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

دیتا تھی دادِ تشنہ لبی یوں حسین کو
کوثر کا اک بہانہ بنی کربلائے دوست

جو تھی مسیح و خضر کو ملی نہیں یہ چیز
اور یوں نصیب سے تجھے مل جائے کربلا

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے
خود خضر کو شبیر کی اس تشنہ لبی سے
معلوم ہوا آب بقا میرے لیے ہے

جو دشت کہ آرام گہ سبطِ نبی ہے
اس دشت کو لاکھوں ابھی آباد کریں گے

مولانا محمد علی کے لیے کربلا صرف تاریخ کے ایک مخصوص مرحلے پر رونما ہونے والا واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ مولانا محمد علی خود کو اور اس صورت حال کو جو انھیں درپیش ہے کربلا کی توسیع سمجھتے ہیں، یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے گویا انھیں کربلا کی تلاش ہے۔ کربلا کی علامت کو جس ہنرمندی اور فن کارانہ سلیقے سے مولانا محمد علی نے استعمال کیا ہے اس کی مثال اردو غزل میں مشکل سے ملے گی۔ اسے وہ اپنی ذات کی تائید و توسیع کے عمل کی علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں مگر یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ مولانا محمد علی کربلا کی علامت کو اپنے متن اور ذات کی تائید اور اسے اعتبار و افتخار بخشنے کے لیے زیادہ استعمال کرتے ہیں، توسیع ذات کے لیے کم کہ ان کی رومانی سرشت انھیں ادّعائے ذات سے زیادہ آگے نہیں لے جا سکتی تھی۔

کربلا کی علامت کے مضمرات میں سے ایک اور تصوّر ابھرتا ہے جو ان کی شاعری میں غالب تصوّر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہے ان کا تصوّرِ مرگ۔ موت اور وہ بھی شہادت کی موت مولانا محمد علی کے لیے ایک بڑی خوشگوار حقیقت نظر آتی ہے۔ زندگی سے بھی زیادہ خوشگوار حقیقت۔ مولانا کی زندگی اور شاعری کے مطالعے کے بعد مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا ہے گویا وہ ساری زندگی اس اندیشے میں مبتلا رہے کہ وہ کہیں معمول کے مطابق طبعی موت نہ مریں۔ ایسی موت سے گریز کے شواہد ان کی شاعری پیش کرتی ہے۔ اس گریز کی ایک شکل ان کی خودکشی کے ارادے میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جس کا ذکر ان کے سوانح نگاروں نے بھی کیا ہے۔ رومانی جذبات پرست انسانوں کی زندگی میں ایسے لمحے ضرور آتے ہیں جب انھیں خواب

اور حقیقت کے درمیان ایک زبردست فاصلے کا احساس ہوتا ہے زندگی کی رائیگانی اور کچھ نہ پانے کا احساس ناحسودہ رہتا ہے۔ ایسے لمحوں میں انسان اپنے لیے جذباتی تلافی کے طور پر ایک ایسی موت کی خواہش کرنے لگتا ہے، جو غیر معمولی ہو اور اسے دوام عطا کردے۔ اگرچہ مولانا محمد علی کے مذہبی عقیدے نے اس کی خواہشِ مرگ "Death-Wish" کو شہادت کا رنگ دے دیا ہے اور اس کے رومانی مضمرات کو چھپا لیا ہے۔ پھر بھی وہ موت کا انتہائی رومانی تصور رکھتے ہیں۔ اس خواہشِ مرگ کے پیچھے شکستِ خواب اور زندگی کی لاحاصلی کا شدید ردعمل کارفرما ہے جو تمام رومانیوں کا مقدر رہا ہے۔ اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر!
مرکے جوہر آپ کے جوہر کھلے

کر گئی زندۂ جاوید ہمیں
تیغِ قاتل نے مسیحائی کی

اس طرح کے مرنے میں بھی جینے کا مزا ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہِ قضا دیکھ

میرے لہو سے خاکِ وطن لالہ زار دیکھ
اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ

شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی
اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

اور کس وضع کی جویا ہیں عروسانِ بہشت
ہیں کفن سرخ شہیدوں کا سنورنا ہے یہی

شمع ایماں کو خدا روشن رکھے
قبر میں جوہر کی پہلی رات ہے

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

رومانی شعریات میں جذبے کے بے محابا اظہار یا بے ساختگی کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے شعر کے حسن تعبیر، دروبست، استعارہ سازی اور پیکر تراشی کے سلسلے میں بے راہ روی کا اندازہ ملتا ہے۔ رومانی فلسفہ چونکہ تخیل کی زندگی پر زور دیتا ہے اور شدید جذبوں سے زندگی کو عبارت جانتا ہے اس وجہ سے رومانیت بالعموم ارتکاز سے محروم ہوتا ہے اور اس میں اختصار کا اعجاز خال خال نظر آتا ہے۔ مولانا محمد علی کی ابتدائی شعری تربیت داغ، امیر، تسلیم، جلال اور عروج کی پیدا کردہ کلاسیکی فضا میں ہوئی تھی۔ اس فضا نے انھیں اظہار کی سہولت سکھائی تھی۔ اردو کی کلاسیکی غزل کے علمبرداروں سے انھوں نے زبان اور محاورے کے استعمال کے گر سیکھ لیے پھر بھی جو چیز وہ نہ سیکھ سکے وہ ہے جذبے کی تہذیب اور تجربے کی تنظیم کا فن۔ علاوہ ازیں اردو غزل کی جو کلاسیکی روایت انھیں ورثے میں ملی تھی، وہ شعری زبان کا کوئی بڑا تخلیقی تصور نہیں رکھتی تھی۔ لفظوں اور محاوروں سے کھیلنے پر قانع تھی۔ جو شعری زبان محاوروں کے بل پر چلتی ہے وہ بالعموم غیر تخلیقی ہوتی ہے۔ نئی تخلیقی شعری زبان نئے نئے استعارے تراشتی ہے اور محاوروں کے سہارے چلنے والی شعری زبان مردہ استعاروں کو اپناتی ہے اور یہ بات بھول جاتی ہے کہ محاورے دراصل مردہ استعارے ہیں بہرحال مولانا محمد علی نے اس کلاسیکی روایت سے ایک طرح کی نیم تخلیقی شعری زبان کے گر سیکھ لیے تھے جو ان کی شاعری میں قدرے ڈھیلے پن سے بروئے کار آئی ہے اس لیے کہ مولانا محمد علی کا جذباتی اور رومانی مزاج کسی نہ کسی طور پر صرف اظہار کا قائل تھا، اس کے نزدیک جذبے کا فوری اظہار ہی اسے ایک طرح کے فشار سے نجات دلانے کے لیے کافی تھا۔ اگست ۱۹۲۹ء میں مولانا محمد علی عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں،

"آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں۔ جیل میں تو بہت سے ایسے سامان بہم ہو گئے تھے کہ میں

زلف و ابرو کی تعریف میں جاسے شعر نکال لیا کرتا تھا رام پور میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب کہ شہرت عروج پر تھا داغ، امیر، تسلیم، جلال عروج ــــــ دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے، سب رام پور کے آسمان پر نور افشانی کر رہے تھے ۔ میں نے دس برس کی عمر میں بہت سے لغو و فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے ۔ اب یہ حالت ہے کہ لکھنے بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں مگر طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا حملہ ہوتا ہے تو نہایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت کلام پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے مگر اس کو لٹریچر سے کیا تعلق یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لئے ہیں۔"

'دست افشانی' یا 'پاکوبی' کا عمل تخلیق شعر کا عمل ہرگز نہیں اس لیے کہ شعر صرف جذبات سے نجات پانا ہی نہیں، جذبات کی تہذیب و تزئین بھی ہے۔ ورڈس ورتھ کے Preface to Lyrical Ballads پر پلی بڑھی نسل تخلیق شعر کا اس سے بہتر تصور کہاں سے لاتی۔ مولانا محمد علی بھی اسی کے قتیل معلوم ہوتے ہیں۔ صرف جذبے کے خلوص اور شدت کے سہارے جہاں تک شاعری جا سکتی تھی، مولانا محمد علی اسے وہاں تک لے گئے۔ ارتکاز و ایجاز ان کے بس کے نہ تھے کہ انھوں نے مزاج ہی ایسا پایا تھا اور ان کی مصروفیات بھی بسیار جہت تھیں۔ جو بات انھوں نے اپنے مضامین کے سلسلے میں کہی ہے، وہ ان کی شاعری پر بھی صادق آتی ہے :

"ایک صاحب نے اپنے دوست کو بہت درست لکھا تھا کہ 'معاف کرنا، خط بہت طویل ہو گیا، مختصر لکھنے کے لیے وقت نہیں نکال سکا'۔ جو میری طرح قلم برداشتہ لکھنے پر مجبور ہو، وہ بیچارہ مختصر کیا لکھ سکتا ہے۔"

شاعری بالخصوص غزل کی شاعری جس ارتکاز و ایجاز کا مطالبہ کرتی ہے، اس کا حق مولانا محمد علی کم ہی ادا کر سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اچھی شاعرانہ شخصیت کے باوجود بہت اچھی اور بڑی شاعری کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مگر سیاسی غزل کی روایت میں ان کی ایک خاص حیثیت ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا حسرت اور مولانا محمد علی دونوں ہی شاعر بھی تھے اور سیاسی رہنما بھی۔ حسرت نے نہ جانے کیا

جتن کیے کہ شاعری میں صرف عاشق ہی رہے، سیاست کو داخل نہ ہونے دیا اور اگر وہ کہیں کہیں داخل بھی ہوگئی ہے تو وہ شعری تجزیہ نہیں بن پائی ہے مثلاً اس شعر میں باوجود شعری آہنگ کے کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اسے نثری بیاں سے جدا کر سکے :

دولت ہندوستاں، قبضۂ اغیار میں ‏ ‏ ‏ ‏ بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

مولانا محمد علی اس نسل کے شعراء میں اس اعتبار سے بہتر ہیں کہ انھوں نے غزل کے علامتی نظام اور عشقیہ محاورے کو قبول کر کے اعلیٰ درجے کی سیاسی شاعری کے امکانات کو وسعت بخشی۔ چونکہ ان کے یہاں مذہب اور سیاست کی دوئی کا تصور نہیں تھا اس وجہ سے انھوں نے اپنی سیاسی غزل میں مذہب سے جذبے کی صداقت بھی حاصل کی اور اس کی وسیع تاریخ سے تلازمات سے بھرپور استعارے بھی حاصل کئے۔ غزل کے تعمیمی انداز اور اس کے مخصوص علامتی نظام نے مولانا محمد علی کی غزل کو صحافت کی ہنگامیت سے بچایا، مذہب اور مذہبی تاریخ سے اخذ کردہ علامتوں نے اس کی بساط کو وسعت بخشی ــــ ایک ایسی وسعت جو خالص سیاسی شاعری کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان کے کچھ سیاسی اشعار سنئے جو شعری تقاضے بھی پورے کرتے ہیں :

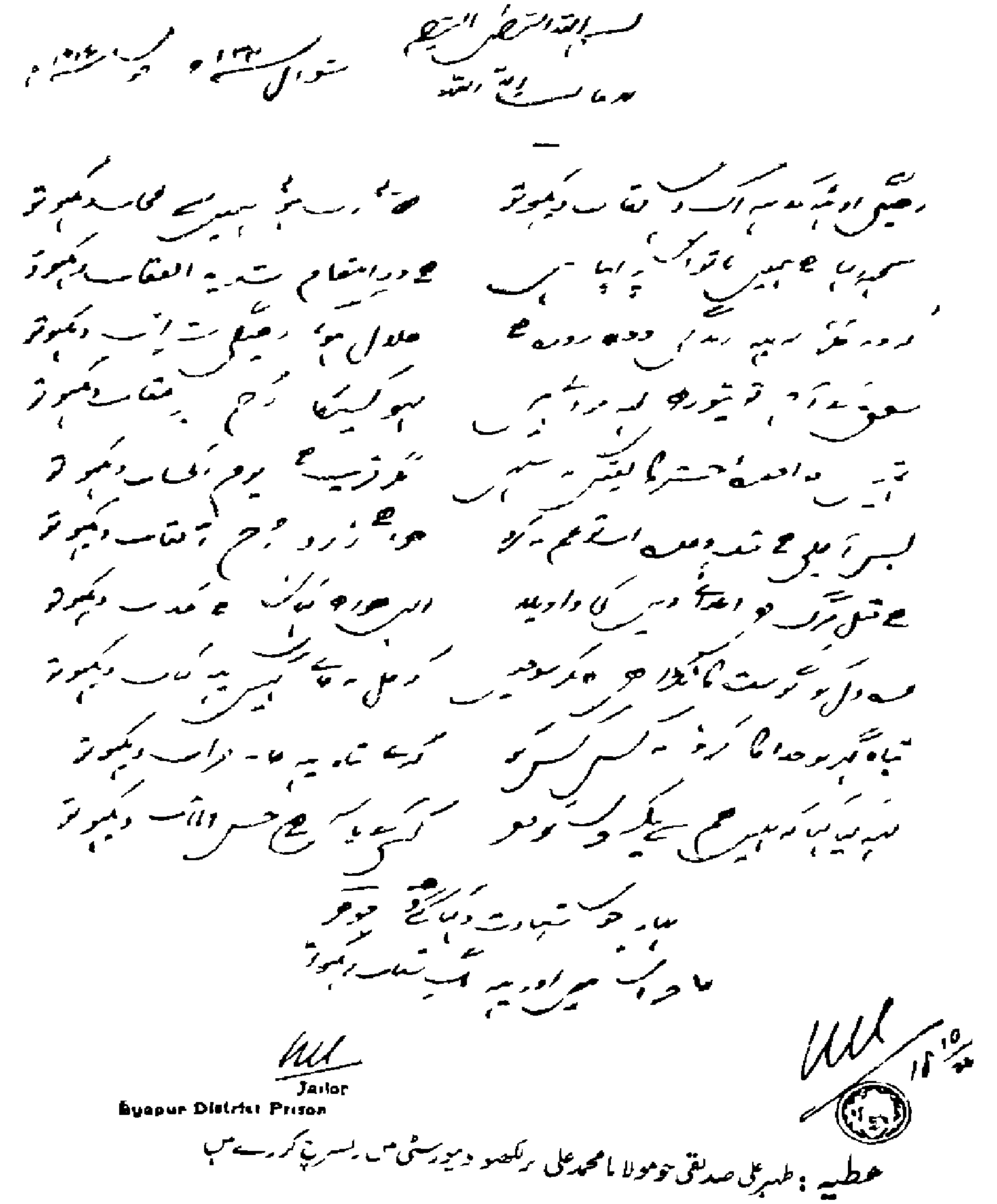
گر بوئے گل نہیں نہ سہی یادِ گل تو ہے
صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور

کیا عشق ناتمام کی سناؤں سرگزشت
دار و رسن کا اور ابھی انتظار دیکھ

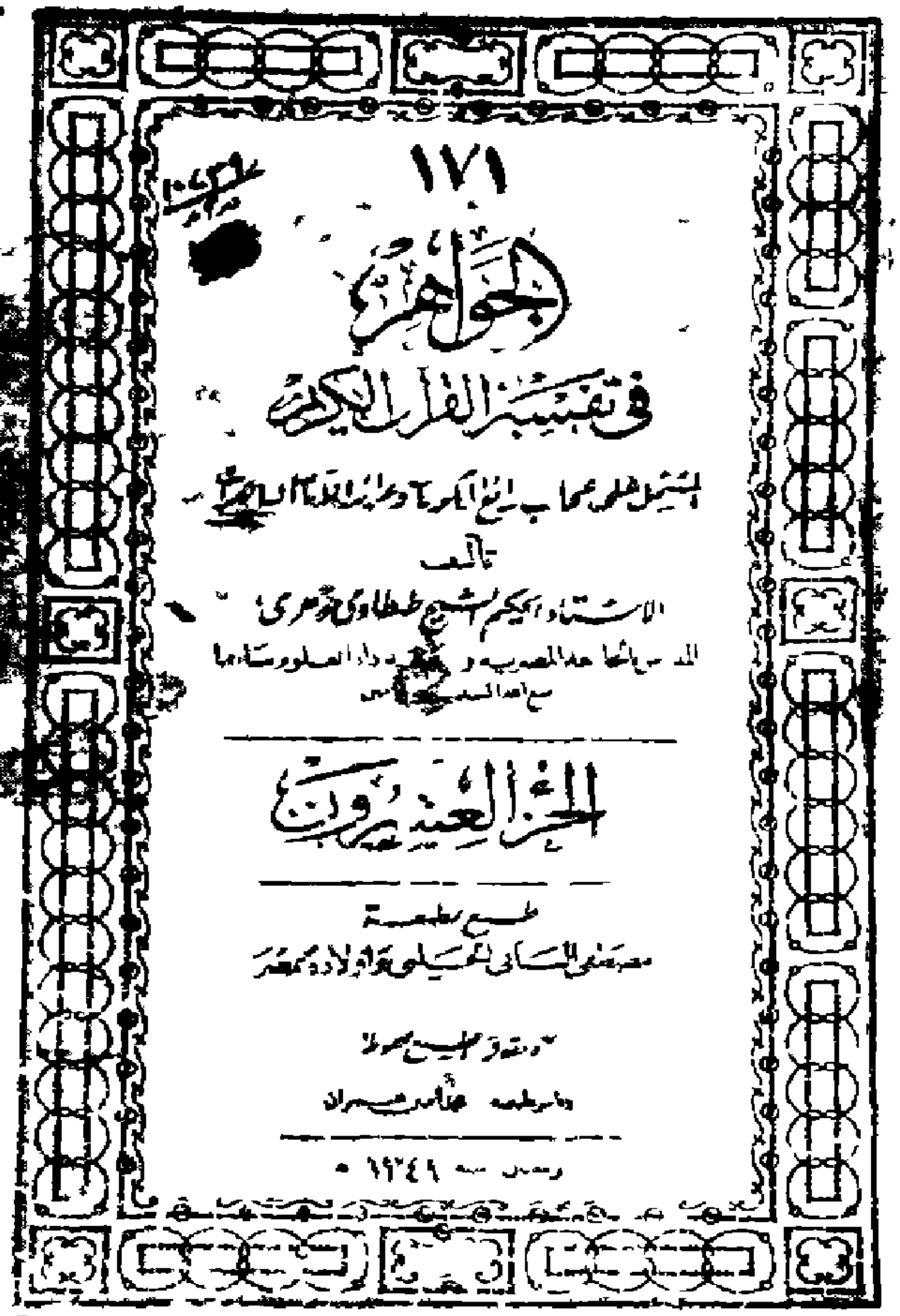
بے حرفِ عذرِ دل کی اگر ترجمان نہ ہو
بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زبان نہ ہو

یقیں آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیمان کا
تری آنکھ اے بتِ وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

مولانا محمد علی جوہر کی ایک غزل خود ان کے خط میں



عطیہ: ظہیر علی صدیقی جو مولانا محمد علی پر لکھنؤ یونیورسٹی میں ریسرچ کر رہے ہیں


١٧١

الجواهر

في تفسير القرآن الكريم

تأليف

الأستاذ الحكيم الشيخ طنطاوي جوهري

الجزء العشرون

طبع بمطبعة

مصطفى البابي الحلبي وأولاده بمصر

سنة ١٣٤٩



ان تصاویر کے بارے میں ملاحظہ ہو مضمون "جوہر ہند اور جوہری مصر" صفحہ ۱۳۰

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

خوفِ غمّاز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر،
ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے، قفس کے در کھلے

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

یہ سنانے کی نکالی ہے انوکھی ترکیب
ظلم کا نام ستم گر نے حیا رکھا ہے

مولانا محمد علی نے ایسے سیاسی اشعار بھی کہے ہیں جو سپاٹ، بے رنگ اور ہنگامی نوعیت کے ہیں اور ایسے اشعار کی تعداد کم نہیں ہے۔ غزل میں سیاسی اشعار کی روایت کو مولانا محمد علی نے اعتبار بخشا اور بعد کے دور میں اقبال سہیل اور ترقی پسندوں میں فیض نے غزل سے جو کام لیا ہے، وہ غالباً اس خوبی و خوبصورتی سے ممکن نہیں ہو سکتا تھا اگر مولانا محمد علی جوہر اس سلسلے کا ابتدائی کام انجام نہ دے چکے ہوتے۔
مولانا محمد علی نے چند نظمیں بھی کہی ہیں مثلاً عرض داشت بہ خدمتِ سرسید، فغانِ دہلی، نوحۂ حسین، شانِ کلکتہ، اور دعائے اسیر وغیرہ۔ ان نظموں میں کوئی ندرت اور انفرادیت نہیں ہے، اظہار کا اسلوب بھی غزلیہ ہے۔ دعائے اسیر البتہ اپنے غزلیہ اسلوب کے باوجود مولانا محمد علی کی سب سے اچھی نظم ہے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اقبال کی شاعری سے متاثر ہونے کے باوجود ان کی شاعری کہیں بھی اس بات کا پتہ نہیں دیتی کہ اردو میں اقبال پیدا ہو چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ محبت اور

نفرت کی وہ کشمکش ہو' جس میں مولانا محمد علی اقبال سے ایک معمولی سے اختلاف کی وجہ سے مبتلا ہوگئے تھے یہ اختلاف خلافت کے سلسلے میں اقبال کی عدم ہم نوائی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد سے وہ اقبال کو 'مرحوم' لکھنے لگے تھے۔ اقبال سے ان کا جو رشتہ رہ گیا تھا' اس کا بیان مولانا محمد علی کی زبان میں سنیے

"ڈاکٹر اقبال صاحب کو میں 'اقبال مرحوم' اسی زمانے سے کہنے لگا اور انھیں میں یقین دلاتا چاہتا ہوں کہ ان کے سیکڑوں اشعار جو مجھے یاد تھے جب کبھی بیجاپور کے جیل خانے میں یاد آجاتے تھے تو قلب پر وہی اثر ہوتا جو ایسے خاندان والوں کا ہوتا ہے جس کی ایک لڑکی کسی شرمناک فعل کے ارتکاب کے باعث گھر سے نکل گئی ہو اور انھوں نے خاندانی عزت و آبرو کی تباہی کے باعث اسے دل سے بھلانے کی کوشش کی ہو اور اتفاقیہ اس کے اوڑھنے پہننے کی کوئی چیز نکل آئے اور یکایک ان کی اس پر نظر پڑ جائے۔ محبت اور شرم دونوں کی کشمکش اس سے زیادہ دل پر چوٹ لگانے والی کون سی جنگ ہو سکتی ہے۔"

اقبال کے سلسلے میں مولانا محمد علی کی Ambivalence نے انھیں شعری سطح پر متاثر نہ ہونے دیا ورنہ ممکن ہے کہ مولانا محمد علی اپنے کلاسیکی لسانی رویے سے کچھ آگے بڑھتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان کے شعری محاورے میں کوئی معنی خیز تبدیلی رونما ہوتی مگر دیکھا آپ نے کہ وہ کس طرح شخصیت اور شاعری کا محدود تصور رکھنے کی وجہ سے اقبال سے برہم ہوگئے اور اقبال کے فکر و شعر دونوں کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیے۔ یہاں بھی ان کی شعلہ بکف جذباتیت ان کی رہنمائی کرتی ہے اور ان کے ردِ عمل کے سانچوں کا تعین کرتی ہے۔ ان کی اسی اور ایسی ہی جذباتیت نے انھیں رومانی سیاست کی بھی راہ دکھائی جو کم ثبات اور ناپائیدار بھی اور ان سے ایسی شاعری بھی کروائی جو کلاسیکیت کی چند ظاہری شکلوں کو قبول کرنے کے باوجود اپنے مزاج اور طینت کے اعتبار سے رومانی شعری رویوں کا اظہار کرتی ہے اور اس میں جذبے اور پیکر کے عدم تعین، حسن تعبیر کے احساس کی کمی' اپنی ذات کا مبالغہ آمیز اور اناگرفتہ احساس جس میں خودگری کے شعور سے بے خبری اور خودشکنی کی طرف مائل ہونے کے وہ سارے عیب موجود ہیں جو بیسویں صدی کے نقادوں نے رومانیت میں دیکھے اور دکھائے ہیں۔ وہ اگر ایک دنیا سے خفا ہونے اور لڑنے کے ساتھ کچھ دیر خود اپنے آپ سے لڑنے کا فن سیکھ لیتے تو ممکن ہے کہ بڑی نہ سہی خاصی اچھی شاعری ضرور کر لیتے مگر اس کو کیا کہیے کہ انھوں نے اپنا جوش خود اپنی ہدایت کے

سلاف بڑی دریادلی سے خرچ کیا اور رات بھر ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے مقابلے میں ایک ایسا شعلہ بنا
سمدکیا جو ایک دفعہ بھڑک کر خاموش ہو جاتا ہے اس شعلے کی سرگزشت ان کی سیاست بھی
ہے اور شاعری بھی۔ دونوں روشن بھی ہیں اور گرم بھی مگر ہیں کم ثبات، شعلے کی طرح!

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا وہی رنگ یہاں بھی ہے، شعر کہتے ہیں،
معلوم ہوتا ہے بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں، نہ کسی قسم کی تیاری نہ کوئی اہتمام، کیسی لطرتابی
درکہاں کا غور و فکر، نہ اصلاح و ترمیم، بس جو دل میں آگیا جھٹ کہہ گذرے، یہی حال نثر کا ہے
یہی حال نظم کا ہے۔

زمانہ حکومت کی اصطلاح میں "نظربندی" کا تھا، الحکم الحاکمین کے اجلاس میں یہ وقت
"نصرت الٰہی" کا قرار پایا، خوب خوب چیتے کی کہنے لگے:

سوز دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو
ہے درد دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو
دیروحرم میں ڈھونڈھ کے سب تھک گئے اسے
اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

پھر سنئے:

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لیے
یہ کیا کہ مئے حلال وہاں اور یہاں نہ ہو
سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا
جو ہو وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

(مولانا عبدالماجد دریا آبادی (محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ حصہ دوم صفحہ ۲۲۴)

مولانا محمد عبدالملک جامعی

مولانا محمد علی
کی
آخری تقریر اور آخری تقریب

جناب محمد عبدالملک صاحب جامعہ کے ان چند خوش قسمت قدیم طلبا میں سے ہیں جن کی مکمل تعلیم و تربیت جامعہ ملیہ میں ہوئی اور جنھیں مولانا محمد علی کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کی عزت بھی حاصل ہوئی۔ موصوف مشہور خطاط منشی عبدالقیوم مرحوم کے صاحبزادے ہیں جنھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمان القرآن کی کتابت کی تھی اور جن کا خط مولانا آزاد کو بہت پسند تھا۔ ملک صاحب تقریباً تیس سال سے مستقل طور پر مدینہ منورہ میں مقیم ہیں اور حفظ قرآن کے مدارس کے نگراں ہیں جو مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں قائم ہیں۔ موصوف کو مولانا محمد علی مرحوم سے شروع ہی سے بڑی عقیدت تھی اور اپنی نوعمری کے باوجود مولانا کی خدمت کے لیے زیادہ سے زیادہ مستعد رہتے۔ اسی زمانے میں انھوں نے مولانا کی جامع مسجد دہلی کی آخری تقریر اور مولانا کی سب سے چھوٹی صاحبزادی گلنار کی شادی کے بارے میں کچھ نوٹ لیے تھے جنھیں ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔ ہم مولانا افتخار فریدی (مراد آباد) کے ممنون ہیں جن کی عنایت سے ہمیں یہ دونوں نوٹ موصول ہوئے ہیں

آخری تقریر

سنہ ۱۹۳۰ء کا سنہ تھا اور اپریل کی جمعرات کا دن صبح کا وقت میں خدمت میں حاضر ہوا، فرمانے لگے کل میں آخری تقریر کروں گا۔ آخری تقریر بس اس کے بعد پھر کوئی تقریر نہیں ہوگی سب سے

دینا ذاکر سے بھی سعید سے بھی (ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ سعید انصاری صاحب) اور فلاں اور فلاں ہم سے فوراً ہی سب کو اطلاع کر دی۔ اصل میں ۱۹۴۷ء کے بعد مولانا کا ان کے پرانے رفقاء، اساتذہ اور طلبا سے مسلسل تعلق ہوتا چلا جا رہا تھا جامعہ بھی اس کی زد میں آ چکی تھی۔ ہاں یہ ڈاکٹر ذاکر صاحب کا کمال تھا کہ انھوں نے مولانا کو محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کی عقیدت میں کوئی فرق آ گیا ہے، اگرچہ یاسد خاصی مذل ہو چکی تھی۔ بہر حال دوسرے دن جامعہ کے اکثر حضرات دہلی کی جامع مسجد میں جمع ہو گئے یہ وہی مسجد تھی جو محمد علی کی ہنگامہ خیز زندگی کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ عموماً ہر جمعہ کو ان کی یہاں تقریر ہوا کرتی تھی، اب ایک زمانے سے سیاسی مباحث چھوڑ دیے تھے، تبلیغی تقریریں ہوتی تھیں موضوع ہوتا "اسلام عقل کی روشنی میں" مگر آج انھیں سیاسی تقریر کرنی تھی۔ میرے ایسی سب سے خوب اولاد جامعہ کو خاص طور پر انھوں نے جمع کیا تھا مجمع یوں بھی اچھا خاصا تھا۔ اگر شہر میں کوئی اہم اعلان ہوتا تو اس سے بھی زیادہ ہو سکتا تھا۔ بہر حال تقریر ہوئی مولانا نے اپنی ساری سیاسی زندگی پر ایک نظر ڈالی پھر موجودہ مسائل سے بحث کی اور ان کے نزدیک جو حل تھا وہ سامنے رکھ دیا تقریر مجھے تسلسل کے ساتھ مطلق یاد نہیں صرف چند فقروں کی ۳۵ برس سے حفاظت کر رہا ہوں۔ اچھا ہے آج سپرد قلم ہو جائیں اور حوالۂ ملت ــــ اپنی حد سے گذری ہوئی صحت کے بارے میں فرمایا:

اگر میرے ایک پاؤں کے نیچے برف کی سل رکھ دی جائے اور ایک کے نیچے آگ کے انگارے تو میں نہیں بتا سکوں گا کہ آگ کس پاؤں کے نیچے ہے اور برف کس پاؤں کے نیچے ــ درمیانی تقریر میں ذاکر صاحب وغیرہ کا نام لے کر اطمینان کر لیا کہ وہ واقعی موجود ہیں ــ

اسی ذیل میں انھیں شفیق صاحب (مولوی شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم سابق وزیر تعلیم دہلی اسٹیٹ) یاد آئے، فرمایا، ــ ہاں وہ تو جیل گیا ہوا ہے جیل کا نام آیا تو یہ بھی جان لینا چاہئے کہ اس وقت گاندھی جی کی تحریک ــــ نمک سازی شروع ہو چکی تھی۔ یعنی کانگریس کی طرف سے سول نافرمانی کی ایک تازہ تحریک اور جامعہ کے بعض طلبہ اور اساتذہ اس میں عملاً شریک ہو کر جیل جا چکے تھے شفیق صاحب ہمارے ہاں تاریخ و جغرافیہ کے استاد تھے، مولانا کا اس وقت کانگریس سے کوئی علاقہ نہیں تھا اور وہ اس تحریک کو کچھ زیادہ مفید نہیں سمجھتے تھے۔ اسی فرق رائے اور حالات کی بنا پر فرمایا: میں آج بھی اس کے گال اسی طرح کاٹتا جیسے ہمیشہ کاٹا کرتا تھا۔ وہ مجھے اب بھی اتنا ہی

پیارا ہے جتنا پہلے تھا۔ شاید نئی نسل کو معلوم نہ ہو کہ یہ مولانا کی مستقل عادت تھی کہ وہ اپنے بوڑھے، جوان، اور ہم عمر دوستوں کے گال کاٹا کرتے تھے جس طرح عام محبت میں آدمی اپنے بچوں کو پیار کرتا ہے اور یہ عادت ایسی طبعی بن گئی تھی کہ امیر امان (اللہ خاں) جن کی سطوت کا اس وقت ڈنکا بج رہا تھا، "۱۹۲۸ء" میں بمبئی آئے تو برسرِ عام ہی مولانا نے ان کے گال کاٹنے شروع کر دیے تھے۔ اس زمانے میں مولانا پر ایک الزام یہ چل رہا تھا کہ ان کو حکومت سے روپیہ مل رہا ہے "انقلاب" (مولانا سالک و مہر کے اخبار) نے لکھا تھا کہ مولانا کو ڈھائی سو روپے یا کچھ زیادہ ماہوار حکومت دے رہی ہے اس سلسلے میں فرمایا:

ارے بھائی! افضل جیسیں میرا ساتھی ہے اس کو سات ہزار ملتے ہیں، سر جوزف بھور بھی میرا ساتھی ہے، اس کو بھی سات ہزار ملتے ہیں۔ میری تم نے اتنی ہی قیمت لگائی۔ ہمارے ہاں مثل مشہور ہے، آدمی کھائے تو ہتھی کا نوکھائے، اگر مجھے حکومت سے لینا ہی تھا تو دو سو ڈھائی سو پر کیوں راضی ہو جاتا

ـــ میں نے بھی کانگریس کا ساتھ دیا ہے۔ میں بھی متحدہ قومیت کا علم بردار تھا۔ مگر جو کچھ میں نے اُس وقت کیا تھا، اِس وقت اس سے کام نہیں چلے گا۔ اس کی مثال اس لال بجھکڑ کے قصے سے ملتی جلتی ہے جس نے درخت میں پھنسے ہوئے آدمی سے کہا کہ کمر میں رسّی باندھ لے، پھر لوگوں سے کہا کہ اس کو کھینچو جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ درخت سے گرا اور گرتے ہی مر گیا۔ لوگوں نے کہا یہ کیا کیا؟ جواب دیا: یہ تو قسمت کی بات ہے اس کا کیا علاج ہے ورنہ ہم نے سینکڑوں آدمی اسی طریقے سے زندہ کنوئیں سے نکالے ہیں اس کی تو موت آئی تھی مر گیا۔ اُس وقت کی کانگریس اور تھی آج کی کانگریس اور ہے۔ درمیانی تقریر میں یہ بھی فرمایا۔ میں آج جو کچھ کہہ رہا ہوں صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کل قیامت میں میرا دامن نہ پکڑا جائے کہ تو زندہ تھا اور تو نے نہیں راہ نہ بتائی

نمک سازی کی تحریک اس زمانے میں شروع ہو چکی تھی۔ لوگوں میں سیاسی جوش و خروش تھا اس لیے شفیق صاحب بھی چھٹی لے کر تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ جمیعتہ علماء سخت پریشان تھی، وہ تحریک میں حصہ لینا چاہتی تھی مگر کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس ضمن میں فرمایا:

ـــ مفتی کفایت اللہ صاحب میرے پاس آئے تھے مشورہ کے لیے کہ شراب خانوں پر پکٹنگ کی جائے۔ میں نے کہا بات تو ٹھیک ہے مگر کل گاندھی جی کی حکومت سے صلح ہو جائے گی

وہ ملک سازی بند کردیں گے۔ تو پھر آپ کیا کریں گے؟ کیا آپ بھی پکٹنگ بند کر دیں گے؟ گویا شراب اس وقت تک حرام تھی اور اب حلال ہو گئی، جس کا جی چاہے پیے۔ اس پر مفتی صاحب خاموش ہو گئے۔ مولانا نے جہاں بھی خرابیٔ صحت کے سلسلے میں پاؤں کی بے حسی کا ذکر کیا تھا۔ وہاں آنکھوں کا حال بھی بتایا تھا کہ ڈاکٹر نے مجھے تقریر کرنے سے ہی نہیں مطلق بولنے سے منع کر دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر تم نے کسی وقت زور کو دراز دور سے آواز بھی دی تو ہو سکتا ہے کہ آنکھ کا پردہ پھٹ جائے اور آنکھ بیکار ہو جائے۔

مولانا کی یہ آخری تقریر تھی ملک کے دارالسلطنت جامع مسجد شاہجہانی میں۔ اس کے بعد آخر مئی ۱۹۳۰ء میں ایک آخری تقریر ہوئی۔ یہ آل انڈیا کانفرنس کا موقعہ تھا۔ اس طرح "یہ کل ہند" آخری تقریر تھی اس کے بعد جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں۔ ایک عالمی آخری تقریر لندن میں ہوئی اس کے بعد وہیں انتقال ہوا۔ مولانا جامع مسجد دہلی میں ایک بار اور بھی دیکھے گئے مگر تھوڑی دیر کے لیے۔ امروہہ کانفرنس کے سلسلے میں کوئی بات کہنی تھی، آدمی بہت کم تھے۔ صدر جمعیۃ مفتی کفایت اللہ صاحب سے بہت ناراض تھے۔ ایک بات ایسی بھی کہی جس کو میں نقل نہیں کر سکتا۔ کوئی دیکھنا چاہے تو مولانا مظہر الدین کے مشہور روزنامہ "الامان" میں مل جائے گی۔

آخری تقریب

مولانا کی چار صاحب زادیاں تھیں۔ زہرہ، آمنہ، حمیدہ، گلنار بیگم۔ بڑی دو لڑکیوں کی شادی [illegible] میں اس حال میں ہوئی کہ اپنے وطن رام پور سے جلاوطن تھے، شہر میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ ابتلا کی یہ خاص شکل صرف محمد علی شوکت علی کے لیے پیش آئی تھی۔ نواب رام پور اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لیے کم از کم اتنا ضرور کر سکتے تھے کہ اپنے حدود ریاست میں ان کو قدم نہ رکھنے دیں سو ایسا کر دیا۔ مولانا کو چھندواڑہ کی نظربندی سے آکر بہت سے ضروری کاموں میں سے ایک یہ بھی تھا۔ رام پور جا نہیں سکتے تھے تو اس کے متصل شہر مرادآباد آکر کہ وہ وطن ثانی تھا، شادی کی رسم ادا کی جس میں حلقۂ خواص و احباب میں سے صرف مولانا عبدالباری اور ڈاکٹر انصاری ہی شامل ہو سکے تھے۔ آمنہ وہی ہیں جن کے بارے میں مولانا کا شعر مشہور ہے ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

گلنار سب سے چھوٹی تھیں۔ ان کی پیدائش سنہ ۱۲ء کی ہے، کامریڈ اخبار کے جاری ہونے کے بعد دو سال کے اندر گلنار پیدا ہوئیں۔ پھر مولانا کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ گویا دورِ قیادت و سیاست کے شروع ہونے کے بعد مولانا کی ساری توجہ امتِ اسلامیہ کی طرف منعطف ہوگئی۔ بہرحال یہی گلنار ہیں جن کی شادی مولانا کی آخری تقریب ہے۔ یہ بھی سنہ ۳۰ء کی بات ہے ماہ جون کی۔ ہمارے بورڈنگ ہاؤس بشیر منزل (قرول باغ) میں یہ تقریب منائی گئی تھی۔ مولانا کو اس کا بہت خیال تھا۔ خود مولانا کا مسکن "اقبال منزل" بھی بشیر منزل سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ درمیان میں ایک کھلا میدان تھا، اس کے جنوب سمت میں مولانا تھے اور شمال مشرقی جہت میں ہم لوگ۔ مہمانوں کا قیام تو اقبال منزل میں ہی ہوا یا ڈاکٹر انصاری صاحب کے یہاں دریا گنج میں، لیکن شادی بہرحال ہمارے ہاں ہوئی۔ مولانا عبدالماجد بدایونی اس وقت تک حیات تھے، ان ہی نے نکاح پڑھایا تھا۔ باہر سے تشریف لانے والوں میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی بھی تھے اور عبدالرحمٰن صدیقی تو وہ تھے جن کے انتظار میں یہ شادی ملتوی ہوتی رہی تھی۔ وہ پہلے سے آئے ہوئے تھے۔ رشتہ داروں میں خصوصیت گوہر علی خاں کی تھی یہ مولانا کے بڑے بھائی تھے لیکن قادیانی ہوجانے کی وجہ سے ان سے تعلق ٹوٹ گیا تھا، مگر اس موقعہ پر وہ موجود تھے۔ شعیب قریشی دولہا تھے۔ مولانا اس رشتے پر بہت خوش تھے، وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ایک طرف وہ بیٹی کے فرض سے فارغ ہوجائیں گے، دوسری طرف اپنے بعد بیگم محمد علی کا بھی ایک باعزت ٹھکانا چھوڑیں گے اگرچہ یہ زمانہ محمد علی اور انصاری کے اختلافات کے عروج کا زمانہ تھا۔ انصاری صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے، اپنے قدیم ساتھی اور دوست شعیب قریشی کی برات، دولہا کے باپ کی حیثیت سے لے کر آئے تھے۔ برات کے ساتھ نہایت عمدہ فلاقند کی پلیٹیں آئی تھیں۔ پلیٹیں بھی چینی کی تھیں۔ اس شام کو مولانا کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ برات کے آنے کے بعد یہ خوشی اور بڑھ گئی تھی۔ اس موقع پر دولہا کے لیے کپڑے بیٹی والوں کے ہاں سے آئے تھے مولانا کپڑے لے کر خود پہنچے اور شعیب صاحب کو پہنانا شروع کیا۔ اتفاق سے جوتا کہیں اِدھر اُدھر ہوگیا۔ اب ڈھونڈتے پھر رہے ہیں نوشہ میاں کا جوتا کہاں گیا، نوشہ میاں کا جوتا کہاں ہے۔ شادی کے موقعہ پر اقبال منزل میں دوبار قلعی کرائی گئی تھی۔ ستر روپے خرچ ہوئے تھے، تصویروں کا بہت شوق تھا، کمروں میں آویزاں کی گئیں قدِ آدم

ایک کمرے میں ایک بہت بڑی قلمی تصویر ان کے دادا علی بخش خاں کی نواب عظمت خاں والی ریاست رامپور کے ساتھ تھی۔ اس کے بالمقابل مصر و ترکی کے مشہور عالم و مفتی شیخ عبدالعزیز کی تھی۔ اس کو آویزاں کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ عالم ایسے ہونے چاہئیں ایسے کہ ایک طرف شریعت سے واقف ہوں، دوسری طرف علوم جدیدہ سے۔ یہ سب تصاویر بہت قیمتی تھیں اور مولانا کو بہت عزیز تھیں مگر مجھے آج تک نہیں معلوم کہ مولانا کے بعد ان کا کیا حشر ہوا۔ بیگم صاحب کے کمروں میں تو کبھی ان تصویروں کو دیکھا نہیں۔ کامریڈ والی میز، نہایت شاندار ٹیبل۔ ساگوان کی لکڑی کی، ہاتھی جیسے پیر کی، وہ بعد میں ہمارے دفتر میں آگئی تھی۔ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب جو ہمارے ادارے کی ڈائرکٹر تھے، اسی پر کام کرتے تھے اور ان کی حیثیت میں بطور نائب یہ شرف مجھے حاصل ہوتا تھا۔ ۱۹۳۸ء کے بعد میں یہ ادارہ نذر آتش ہوگیا۔ میں حجاز کے سفر میں تھا میز کے متعلق بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ابھی موجود ہے اور رضا مدعلی کی لائبریری میں گئی ہوئی ہے۔[1]

نئی نسل میں شعیب صاحب کے جاننے والے بھی اب کم ہوں گے۔ ڈاکٹر آف فلاسفی ہونے کے علاوہ اتنی ڈگریوں کے مالک تھے کہ شاید ہی اس زمانے میں اتنی ڈگریاں کسی اور کے پاس رہی ہوں گی۔ انگریزی قابلیت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں، مگر شہرت بہت ہے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ گرفتار ہوگئے تو ان کے مشہور اخبار "ینگ انڈیا" کو یہی چلاتے رہے۔ مختصر لفظوں میں یہ کہنا صحیح ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں ان کی وہی حیثیت تھی جو ملک میں جواہر لال کی تھی۔ قومی و سیاسی تحریک سے تعلق ترکی وفد سے شروع ہوا جبکہ اس میں (جرمنی سے آکر ترکی) میں شامل ہوگئے تھے اس کے بعد برابر محمد علی اور انصاری کے ساتھ ہی رہے یہاں تک کہ ہندوستان کی سیاست نے کروٹ بدلی۔ نہرو رپورٹ سے ان کا دل کھٹا ہوگیا اور سیاست سے دست کش ہوگئے۔ مولانا محمد علی اس وقت یورپ میں زیر علاج تھے مولانا شوکت علی نے شعیب کو ضروری کاغذات دے کر یورپ بھیجا تھا۔ جوہر قابل تھا۔ نواب صاحب بھوپال نے اپنی وزارت کے لیے ان کا انتخاب کیا۔

---

[1] کچھ عرصے سے وہ دفتر شیخ الجامعہ میں ہے اور میرے استعمال میں ہے جامعہ کے مرکزی کتب خانہ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کے اہتمام میں مولانا محمد علی نمائش کی تیاریاں ہو رہی ہیں، ارادہ ہے کہ اس یادگار میز کو نمائش کے حوالے کردیا جائے۔ لطیف اعظمی

بھوپال میں ان کے ایک ساتھی کرنل عبدالرحمٰن بحیثیت معالج خصوصی پہلے سے موجود تھے۔ یہی بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد صاحب کے معالج خاص مقرر ہوئے تھے اور ان کے ساتھ یہاں حج کو بھی آئے تھے۔ میں نے حرم مکہ اور کعبہ شریف دونوں کو اور اس مقام ابراہیم میں دیکھا تھا جو ابھی پرسوں منہدم کیا گیا ہے۔ اسی وزارت کے زمانے میں شادی ہوئی اور شادی کے چار پانچ ماہ بعد جب مولانا محمد علی "گول میز کانفرنس" کی شرکت کے لیے لندن تشریف لے گئے۔ تو نواب حمیداللہ خاں صاحب کے ساتھ شعیب بھی وہاں پہنچے۔ قدرتی انتظامات تھے کہ ادھر مولانا اپنے ساتھ بیگم کو بھی لے گئے، ادھر گلنار بھی شعیب کے ساتھ گئیں۔ گلنار سب سے چھوٹی صاحبزادی تھی۔ اس لیے مولانا کو غایت درجہ محبت تھی۔ اس کا وہاں ہونا مولانا کے لیے بہت تسکین کا سبب تھا۔ وہاں گلنار کی سالگرہ کی تاریخ آگئی۔ گلنار امید سے تھیں، ولادت میں کچھ دیر تھی، مولانا بچے کی خوشی کا انتظار نہیں کر سکتے تھے اس لیے گلنار بیگم کی سالگرہ کی ٹھانی، شوکت صاحب منع کرتے رہے مگر نہیں مانے، اس پر بہت خفا ہوئے اور دھوم دھام سے سالگرہ منائی۔ لندن میں اس وقت قیام ہائیڈپارک میں تھا۔ وہاں ہی یہ تقریب منائی گئی اور بے شک مولانا کی یہ آخری تقریب تھی۔ اس کے چند ہی دن بعد مولانا اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس تقریب میں گھر کے لوگوں میں مولانا شوکت علی اور ان کے صاحبزادے زاہد علی بیگم محمد علی اور ان کے بھائی مظفر علی، دوستوں میں شعیب کے علاوہ عبدالرحمٰن صدیقی تھے وہ حقیقت میں مولانا کے "صدیق" ہی تھے۔ یار غار۔ اخیر دم تک مولانا کے ساتھ رہے۔ اور مولانا کے انتقال کے بعد انگریزی صحافت میں یہی مولانا کے جانشین بھی ہوئے، بعد میں مشرقی پاکستان کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔ شعیب کی اور ان کی دوستی بہت پکی تھی۔ خود صدیقی صاحب کے کوئی اولاد نہیں تھی ان کے ایک بھانجے ہیں ڈاکٹر صدیقی، شعیب نے اپنی لڑکی کی شادی ان ہی سے کی اور اس طرح اپنی دوستی کے رشتہ کو خون کے رشتے میں تبدیل کر دیا۔

عتیق صدیقی

مولانا محمد علی کے خاندانی حالات

(مقتبس از تذکرۂ کاملان رام پور)

مولانا محمد علی کے خاندانی حالات بڑی حد تک ہماری دست رس سے باہر رہے ہیں۔ اس موضوع کی طرف نہ تو خود مولانا محمد علی نے توجہ کی اور نہ ان کے سوانح نگاروں ہی نے اسے تحقیق و تفتیش کا موضوع بنانے کی کوشش کی۔ 'بی اماں' کی وفات کے فوراً بعد "والدہ کی یاد میں" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ مولانا محمد علی نے انگریزی میں لکھا تھا، جو کامریڈ میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے اپنے مادری سلسلے ہی کے کچھ حالات ضمناً قلم بند کیے تھے۔ اپنی خودنوشت میں بھی انھوں نے برسبیل تذکرہ اپنے والد کی مسرفانہ زندگی کا، اپنے چچاؤں کے تمول کا اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کا ذکر کرنے ہی پر اکتفا کی ہے۔

مولانا محمد علی کے خاندانی حالات کا جہاں تک تعلق ہے، احمد علی خاں شوقؔ کی تالیف[1] "تذکرہ کاملانِ رام پور" خصوصیت سے قابل ذکر ہے، جو اس موضوع پر قابل قدر اور مستند معلومات اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس تذکرے کے مولف مولانا محمد علی کے حقیقی چچازاد بھائی اور ان کی بیوی امجدی بیگم کے حقیقی چچا تھے۔ مولانا محمد علی کی وفات سے اکیس ماہ قبل یہ تذکرہ ان ہی کے "ہمدرد پریس" واقع کوچۂ چیلان دہلی میں طبع ہوا تھا۔ کتاب کے آخر میں احمد علی خاں شوقؔ نے "حالات خاندان مؤلف" تفصیل کے ساتھ قلم بند کیے ہیں، جو ایک سو دو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں

---

[1] یہ تذکرہ دراصل امیر مینائی کے تذکرۂ "انتخاب یادگار" (۱۸۷۳ء) کا تکملہ ہے۔ امیر مینائی کا تذکرہ دو طبقات پر مشتمل ہے۔ پہلے میں فرماں روایانِ رام پور کے حالات ہیں اور دوسرے میں شعرائے رام پور کا تذکرہ ہے۔ احمد علی خاں شوقؔ کا تذکرہ "ریاست رام پور کے علماء اور اہلِ کمال" کے احوال پر مشتمل ہے۔

احمد علی خاں رام پور میں ۱۴ر جنوری ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ "ابتداً کلام اللہ حفظ کیا اور پھر فارسی تعلیم بقدر نصاب مقررہ حاصل کی" ۱۸۸۳ء میں ریاست رام پور کے رسالہ سواروں میں جمعدار مقرر ہوئے۔ پھر وہ اندور چلے گئے اور وہاں کی پلٹن میں کپتان کا عہدہ پایا۔ ۱۸۸۹ء میں واپس آگئے۔ ۱۸۹۷ء میں نواب حامد علی خاں نے ریاست کے "کتب خانے کا مہتمم بہ ماتحتی حکیم محمد اجمل خاں دہلوی بنایا۔ ابتداً تیس روپے تنخواہ مقرر کی۔ اس خدمت کو قبول کرنے میں سب عزیزوں کو انکار تھا، مگر مجھے کتابوں کا شوق تھا، اس لیے یہی خدمت پسند کی۔"

مولف کے مندرجہ بالا بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاندان میں یہی پہلے شخص تھے جنہیں موروثی فن سپہ گری کے علاوہ "کتابوں کا شوق" بھی تھا، اور جنھوں نے یہ تذکرہ مرتب کرکے اپنے علمی ذوق کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ان کے بعد مولانا محمد علی کا نمبر آتا ہے، جو ان سے عمر میں پندرہ سال چھوٹے تھے۔

"حالات خاندان مولف"

مولف نے اپنے خاندانی سلسلے کا بیان محبوب بخش خاں کے سوانح سے شروع کیا ہے، جو ان کے اور مولانا محمد علی کے پردادا تھے۔ ان کے "مورث اعلیٰ پشاور کے اطراف سے اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ پنجاب کے اکثر حصوں میں بود و باش کرتے ہوئے دہلی، اور دہلی سے ضلع مرادآباد کے اغوان پور، موضع میں جو حاکم نشین مقام تھا، آئے۔ کہا جاتا ہے کہ محبوب بخش خاں کے اجداد میں شیخ محمد دائم اس علاقے کے صوبہ دار تھے۔"

مولف نے یہ نہیں بتایا ہے کہ ان کا خاندان کہاں سے اطراف پشاور میں آیا تھا۔ نایہ کہ اصلاً وہ عربی تھے یا افغانی۔ لیکن مولانا محمد علی نے گول میز کانفرنس کی اپنی آخری تقریر میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ "میں نسلاً سامی ہوں۔"

بہرکیف "محبوب بخش کے والد شیخ امان اللہ اور ان کے نانا دونوں نواب نجیب الدولہ بہادر کے دربار میں معتمد ملازموں میں تھے محبوب بخش خاں کی ولادت اغوان پور (۱۱۸۴ھ / ۱۷۷۰ء) میں ہوئی۔ اسی سال نواب نواب نجیب الدولہ کا انتقال ہوا۔ یہ بھی ہوشیار ہوکر باپ اور نانا کے

ساتھ خدمت کرنے لگے ہفتم صفر ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء کو محبوب بخش خاں کا انتقال نجیب آباد میں ہوا تین بیٹے اور ایک بیٹی یادگار چھوڑیں "

محبوب بخش خاں کے سب سے بڑے بیٹے علی بخش خاں جو مولانا محمد علی کے دادا تھے" ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء میں نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ نواب معین الدین خاں بہادر مرحوم نے اپنے فرزندوں کی طرح پالا پرورش کیا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں گو باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، مگر نواب صاحب نے اس رنج کو محسوس نہیں ہونے دیا' اور انھیں باپ کی خدمت پر مامور کر دیا نواب صاحب بہادر جو باپ سے زیادہ شفیق تھے ان کا انتقال ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں ہوا۔ باپ پہلے مر چکے تھے، نواب صاحب پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ تمام و کمال اخراجات کے کفیل تھے۔ یہ وقت بڑا سخت تھا اور گویا کہ آفت کا آسماں ٹوٹ پڑا "

محبوب بخش خاں کے ترجمہ میں مولف نے زوال روہیلکھنڈ کی اجمالی تاریخ بھی بیان کی ہے، جسے 'نواب نجیب الدولہ بہادر کے عروج کے وقت سے لے کر انتقال تک نہایت سخت انقلابوں کا سامنا کرنا پڑا تھا" اس دور میں ہندوستان جس طوائف الملوکی کا شکار تھا، اس کے پیش نظر یہ حیرت ناک نہیں ہے کہ صفدر جنگ اور مرہٹوں کے ہاتھوں روہیلکھنڈ کی سلطنت تباہ ہوئی اور رفتہ رفتہ اقتدار انگریزوں کی طرف منتقل ہو گیا' اور نواب نجیب الدولہ کا خاندان انگریزوں کا وظیفہ خوار بن گیا۔ نواب معین الدین" کے انتقال کے بعد تنخواہ انگریزوں نے بند کر دی' اس سلسلے میں نواب مرحوم کے بیٹوں اور سرکار انگریزی سے جو مراسلت ہوئی' وہ مولف نے نقل کی ہے۔ جولائی ۱۸۳۵ء میں نواب مرحوم کے" دونوں صاحبزادوں نے علی بخش خاں کو اپنا مختار اور سربراہ کار مقرر کیا" اور اس طرح سے علی بخش خاں "کا تعلق گورنمنٹ انگریزی سے نیا پیدا ہوا" اور تمام کاروبار جو انگریزوں سے متعلق تھا اُن کے سپرد" ہوا۔

۱۸۴۲ء تک علی بخش خاں نجیب آباد میں مقیم رہے۔" لیکن نواب محمود خاں صاحب بہادر کی آمدنی قلیل اور اخراجات کثیر" تھے، اس لیے علی بخش خاں کی " گذر اوقات کی کوئی صورت نہ تھی " جب انھوں نے نواب صاحب سے اجازت لے کر لکھنؤ کا سفر کیا" تقریباً سال بھر وہاں قیام رہا۔ لیکن کامیابی کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔

۱۲۶۳ھ میں نواب محمد سعید خاں والی رام پور نے علی بخش خاں کو لکھنؤ سے طلب کر کے اپنے ولی عہد نواب محمد یوسف خاں سے متعلق کر دیا۔ اس کے بعد تا حیات وہ ریاست رام پور سے وابستہ رہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران ریاست رام پور ہی روہیلکھنڈ کی ایک ایسی ریاست تھی جس نے دامے درمے، قدمے وسخنے انگریزوں کی مدد کی۔ اس سلسلے میں سب سے اہم خدمات علی بخش خاں نے انجام دیں، خصوص والی ریاست کا اور انگریز حکام کا پورا پورا اعتماد حاصل تھا۔

ان حالات میں یہ حیرت ناک نہیں ہے کہ علی بخش نے "جو" موروثی نمک خوار نجیب آباد کے تھے . . . . بہ نظر خیر خواہی نواب محمود خاں صاحب کے پاس اپنے بھائی حسین بخش خاں کو بھیجا اور عرض کرایا کہ آپ ستورسنس میں شریک نہ ہوں۔ اس عرض معروض کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ وہاں حسین بخش خاں کی جان کے لالے پڑ گئے۔"

ریاست رام پور نے انگریزی حکام کو امداد پہنچانے کا جو پروگرام بنایا تھا، اس پر عمل درآمد کے سلسلے میں علی بخش خاں کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے سپرد حسب ذیل خدمات تھیں۔

۱۔ نینی تال کو رسد پہنچانا اور روپیہ بھیجنا۔
۲۔ دہلی، لکھنؤ، مراد آباد، نجیب آباد، بجنور، میرٹھ اور بریلی سے روزانہ خبریں منگانا اور نینی تال تک پہنچانا۔
۳۔ نینی تال سے میرٹھ تک یورپین افسروں کی خط وکتابت کا پہنچانا اور بھیجنا۔
۴۔ برٹش گورنمنٹ کے ہاتھیوں کے کھیدہ کی نگرانی اور کل مصارف کا انتظام۔
۵۔ برٹش فوج کے افسروں کو سامان اور فوج کے لیے آدمیوں کا مہیا کرنا۔
۶۔ کان فی ڈنشل کل معاملات کی ذمہ داری
۷۔ باغیوں کے متعلق نگرانی اور ان کی گرفتاری
۸۔ کان فی ڈنشل معاملات میں خود نینی تال جا کر مسٹر الگزینڈر کمشنر سے گفتگو کرنا۔
۹۔ کل مصارف ایام غدر فوجی و ملکی کی نگرانی۔"

علی بخش خاں نے یہ خدمات بڑی مستعدی اور ہوشیاری سے انجام دیں۔ اس سلسلے

میں ایسی شدید خطرات سے بھی دوچار ہو پڑا۔" روہیلکھنڈ میں جب انگریزی تسلط تام وکمال ہوگیا، تو ۱۹ نومبر ۱۸۵۹ء کو گورنر جنرل نے فتح گڑھ میں غدر کے خیر خواہوں کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے عالی شان دربار کیا۔۔ اسی دربار میں گورنمنٹ کی طرف سے ایک خلعت مع تلوار و طلائی گھڑی کے علی بخش خاں کو عطا ہوا۔ جس ہزار چودہ روپے سالانہ کی جمع کا علاقہ ضلع مرادآباد میں دیا۔۔۔۔۔۔۔ نواب فردوس مکان نے بھی خلعت عطا کیا۔" اور متعدد مواضعات بہ طور جاگیر عطا کیے۔

" محرم کی دوسری تاریخ ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء کو" علی بخش خاں کا رام پور ہی میں انتقال ہوا۔۔۔۔۔۔ نواب خلد آشیاں نے تجہیز و تکفین کے لیے پانچ سو روپے بھیجے اور خود مزار پر فاتحہ خوانی کو تشریف لے گئے۔"

مولانا محمد علی کے والد" عبد العلی خاں خلف نجم علی بخش خاں" کے تھے۔ " ان کی پیدائش رام پور میں ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں ہوئی۔ ابتداءً حفظ کلام اللہ کیا۔ مس پارے کر کے چھوڑ دیے فارسی تعلیم اچھی حاصل کی۔ صرف و نحو عربی میں بھی خوب دستگاہ تھی۔ پیدائش کے وقت سے دس روپے ماہانہ وظیفہ ریاست سے پاتے تھے۔ جواں ہو کر رسالہ ششم سواروں میں جمعدار مقرر ہوئے۔ طبیعت رنگین پائی تھی۔"

" ریاست رام پور سے قطع تعلق کر کے جے پور چلے گئے۔ وہاں ملازمت کی کوشش میں بہت روپیہ صرف کیا۔ ۱۲۹۷ھ کے رمضان میں رام پور آئے۔ ۱۷ رمضان کو زدہ کی حالت میں ہیضہ ہوا اس وقت رام پور میں ہیضہ کی نہایت شدت تھی۔ ۱۷ رمضان ۱۲۹۷ھ مطابق ۲۰ اگست ۱۸۸۰ء کو آخیر شب میں انتقال ہوا۔ تئیس سال کی عمر ہوئی۔ اپنی یادگار بندہ علی خاں، ذوالفقار علی خاں، شوکت علی خاں، نوازش علی خاں، محمد علی خاں اور ایک لڑکی چھوڑی۔

" بندہ علی خاں اور نوازش علی خاں کا انتقال ہوگیا ذوالفقار علی خاں گورنمنٹ انگریزی کے مختلف عہدوں پر رہے اور انسپکٹر آبکاری کے عہدے سے پنشن لے کر قادیان ضلع گورداسپور میں مقیم ہوگئے۔ احمدی جماعت کے شریک غالب رہے۔" شوکت علی خاں بی اے برٹش گورنمنٹ کے محکمۂ افیون میں ڈپٹی کے عہدے سے پنشن لے کر علاحدہ ہوئے۔ سیاسی جماعت میں شامل ہوئے۔ قید بھی بھگتی۔ خلافت کے علم بردار رہے۔ محمد علی خاں بی اے آکسن عالی جناب نواب سید محمد حامد علی خاں

بہادر روہلی رام پور دام ملکہم کی توجہ سے ولایت گئے۔ سول سروس کے امتحان میں ناکامیاب ہوئے۔ ریاست رام پور اور بڑودہ میں ملازم رہے۔ اردو کا ہمدرد روزنامہ اخبار اور انگریزی کا مریڈ ہفتہ وار پرچہ جاری کیا۔ سیاسیات کے لیڈروں میں شمار ہوگیا۔ ان کی سوانح عمریاں چند بار شائع ہو چکی ہیں اور ایک عالم ان کے حالات سے واقف ہے اور آئندہ زمانہ ان کے متعلق بہت کچھ حالات لکھے گا۔"

مذکورہ بالا مضمون اس لحاظ سے تشنہ ہے کہ اس میں مولانا محمد علی کی والدہ اور ان کی آل اولاد کا ذکر نہیں ہے، اس لئے ذیل میں ان کے بارے میں ضروری معلومات درج کی جاتی ہیں۔

مولانا محمد علی کی والدہ کا نام آبادی بیگم تھا، امروہہ ضلع مراد آباد کی رہنے والی۔ ۱۸۸۰ء میں ۲۷/۲۸ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں، بعد میں بی اماں کے نام سے مشہور ہوئیں، ۱۹۲۴ء میں ۱۲/ اور ۱۳/ نومبر بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب میں ۲ بجکر ۱ منٹ پر دہلی میں انتقال ہوا، درگاہ شاہ ابوالخیر دہلی میں آسودۂ خاک ہیں۔

مولانا کی رفیقۂ حیات کا نام امجدی بیگم تھا جو مولانا کے چچا زاد بھائی عظمت علی خاں کی صاحبزادی تھیں، ۱۹۰۲ء میں مولانا سے شادی ہوئی، مولانا کی وفات کے وقت وہ ساتھ تھیں۔

مولانا کی نرینہ اولاد نہیں تھی، صرف چار لڑکیاں تھیں سب سے بڑی زہرہ، جن کی شادی تقریباً ۱۸ سال کی عمر میں ۱۹۲۰ء میں مولانا شوکت علی کے لڑکے زاہد علی صاحب سے ہوئی۔ دوسری آمنہ جن کی شادی تقریباً ۱۷ سال کی عمر میں ۱۹۲۰ء ہی میں محمود اللہ صاحب سے ہوئی۔ ۱۱/ مارچ ۱۹۲۴ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئیں۔ تیسری صاحبزادی حمیدہ بانو کی شادی ۶/ مئی ۱۹۲۶ء کو رام پور کے ایک عزیز ماجد علی خاں صاحب سے دہلی میں ہوئی، ان کا انتقال آخر جولائی ۱۹۲۹ء میں بعارضہ دق مسوری میں ہوا، دہلی میں دفن کی گئیں۔ سب سے چھوٹی گلنار تھیں جن کی شادی مولانا کے عقیدت مند شعیب قریشی صاحب سے ۲۹/ مئی ۱۹۳۰ء کو جامعہ ملیہ دہلی میں ہوئی، تقسیم ملک کے بعد پورا خاندان کراچی چلا گیا اور وہیں ۲۵/ فروری ۱۹۶۲ء کو شعیب صاحب کا انتقال ہوا، اہلیہ کا اس سے پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ (عبداللطیف اعظمی)

سید غلام ربانی مرحوم

ہفتہ وار کامریڈ

[پیش نظر مضمون نومبر ۱۹۷۰ء کے ماہنامہ "جامعہ" میں شائع ہو چکا ہے، موقع و محل کی مناسبت سے اس خصوصی شمارے میں دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ تقریباً ڈھائی سال ہوئے فاضل مضمون نگار کا ۲۰ ستمبر ۱۹۶۹ء کو تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں حیدرآباد میں انتقال ہو گیا، مرحوم کے بارے میں اکتوبر ۱۹۷۰ء کے "جامعہ" میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔]

ساٹھ سال سے اوپر ہوئے، مسٹر محمد علی (اس وقت وہ مسٹر ہی کہلاتے تھے) کلکتہ سے دہلی آئے اور اپنے ساتھ اپنے کامریڈ کو بھی لائے۔ کامریڈ ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار تھا۔ بڑھیا کاغذ پر چھپتا تھا۔ اس کا معیار اتنا بلند تھا کہ انگلستان کے اخباروں کی ہمسری کرتا تھا۔ ملک میں اس کا مطالعہ ایک فیشن ہو گیا تھا۔ کالج کے طالب علم اپنی استعداد بڑھانے کے لیے اس کو پڑھتے تھے۔ کامریڈ کی "گپ" مشہور تھی۔ اس میں حالات حاضرہ پر طنز و مزاح کے پیرایہ میں تبصرہ ہوتا تھا۔ اس کے لکھنے والے ولایت علی بمبوق (وکیل بارہ بنکی) تھے۔ سروجنی دیوی اور سر نظامت جنگ کی نظمیں بھی اس اخبار میں چھپتی تھیں۔ انگلستان میں اس کے خریدار دو تین سو تھے۔ آٹھ روپے سالانہ اس کا چندہ تھا، خریداروں کی تعداد آٹھ ہزار تھی، میں اس اخبار سے وابستہ تھا۔

ان دنوں جنگ بلقان زوروں پر تھی، بلقانی ریاستوں نے ترکوں کو نرغے میں لے لیا تھا۔ ملک کے مسلمانوں کو ترکوں سے ہمدردی تھی اس جنگ نے اور جوش پیدا کر دیا۔ مولانا محمد علی نے اخبار "ہمدرد" جاری کیا۔ اس کو انھوں نے ۲۲ فروری سنہ ۱۹۱۲ء کے پہلے شمارہ کے افتتاحی مقالہ میں یوں بیان کیا ہے:

"ہمدرد جاری کرنے کا خیال کوئی فی البدیہہ نتیجۂ فکر نہیں کہ وزن اور قافیہ کے

قالب میں ڈھل کر ذرا دیر میں احباب کی مجلس میں ہل چل ڈال دے۔ کسی گھبرائے ہوئے دل کا عارضی جذبہ نہیں جسے قوت واہمہ پلک مارتے صورت کا لباس پہنا کر موجود کر دے بلکہ یہ نتیجہ ہے اخباری دنیا میں عرصے تک رہ نوردی کرنے، سینکڑوں ٹھوکریں کھانے اور بہت سے نشیب و فراز دیکھنے کا، قوم کی زندگی کا خلوت کدوں سے لے کر بازاروں تک مطالعہ کرنے کا۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ قوم کے لیے ایک ایسا رفیق سفر تیار کریں جو منزل مقصود کو دور سے نہ دکھائے بلکہ گم گشتگانِ راہ کے ساتھ برہنہ پا ہو کر ایسے قصے کو پیدا کریں جو اس داستاں کو الف لیلہ کی طرح دہرایا کرے اور جب تک قوم کی ہلاکت اور نکبت ختم نہ ہو یہ داستان بھی ختم نہ ہو۔"

اب جاننے والے جانتے ہیں کہ جس غرض سے یہ اخبار جاری کیا گیا تھا، وہ کہاں تک پوری ہوئی۔ یہ اخبار اس تیزی سے بڑھا کہ دیکھتے دیکھتے اس کی اشاعت پچیس ہزار پہنچ گئی جو اس زمانہ میں کسی اردو اخبار کے لیے ایک معراج تھی۔ اس کا سالانہ چندہ پندرہ روپے تھا اس نے مسلمانوں میں اخبار بینی کا شوق اور سیاسی شعور پیدا کیا۔ کامریڈ کی "گپ" کی طرح ہمدرد کا "تجاہل عامیانہ" مشہور تھا اس کو میر محفوظ علی بدایونی لکھتے تھے۔ مصر، فلسطین، شام اور ایران کے اخبارات دفتر میں آتے۔ ان کے اہم مضامین کے ترجمے ہمدرد میں چھپتے تھے۔

ہمدرد اور کامریڈ کے چیف ایڈیٹر مولانا محمد علی تھے، ان کے مددگاروں میں راجہ غلام حسین، سر جالب دہلوی، میر محفوظ علی بدایونی، قاضی عبدالعزیز، قاضی عبد الغفار، عارف ہسوی، غلام محمد طور، ضیاء الدین برنی، قاری عباس حسین شامل تھے۔ سید ہاشمی فرید آبادی غیر ملکی اخباروں کے ترجمے کر کے دیتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب کو بھی بلایا گیا تھا مگر وہ نہیں آئے۔ عملہ کے ارکان میں برادرانہ تعلقات تھے ایک دوسرے کو آدھے نام سے پکارتے تھے۔ عملہ ایک خاندان تھا جس میں محمد علی صاحب کی حیثیت صدر خاندان کی تھی۔ کبھی بیت بازی ہوتی تھی، چاندنی رات میں فالیز پر جاتے تھے، خربوزے اور تربوز کھائے جا رہے ہیں اور مولانا شوکت علی سب کو ہنسا رہے ہیں۔

مولانا محمد علی جامع مسجد دہلی میں نماز کے بعد تقریر کیا کرتے تھے۔ دلی کے کمشنر نے ان کو منع کیا انھوں نے صاف کہہ دیا کہ اللہ کے گھر میں تقریر کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ ان کی تقریریں

سب جوشیلی ہوتی تھیں لوگ شوق سے سنتے تھے۔ شہر میں وہ بہت مقبول ہوگئے اور یہیں سے ان کی لیڈری شروع ہوگئی۔

کامریڈ میں ٹرکش ریلیف فنڈ کھولا گیا۔ لوگوں میں اس قدر جوش تھا کہ روپے کی بارش ہونے لگی۔ اُنہی دنوں ترکی حکومت نے جنگ میں مالی امداد کے لیے پچاس لاکھ پونڈ کے قرض حسنہ کا اعلان کیا۔ ہمارے دفتر سے ترکی تمسکات بھی جاری ہوئے تھے، میں اس زمانہ میں ہمدرد اور کامریڈ کا خازن تھا۔

مولانا محمد علی نے ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ترکی کو طبی وفد روانہ کیا۔ اس وفد کی روانگی کا منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ جامع مسجد دلّی کے صحن میں جو مکبّر ہے، اس کی سیڑھیوں پر وفد کے ارکان کھڑے ہوئے، سب فوجی وردی پہنے ہوئے تھے، ان کی ٹوپیوں پر ہلال احمر چمک رہا تھا۔ دلی والوں نے اللہ اکبر کے نعروں میں ان کو وداع کیا، اس وفد کے اخراجات کوئی چار لاکھ کے قریب ہوئے۔ جب یہ وفد واپس آیا تو اس کے حسابات کی جانچ مجھ سے ہی کرائی گئی تھی۔

کامریڈ کا دفتر کوچہ چیلاں میں تھا، یہ ایک بہت بڑی دو منزلہ عمارت تھی، ایک حصے میں دفتر اور پریس تھا دوسرے حصہ میں مولانا محمد علی رہتے تھے۔

ایک دن ان کے ہاں کی ماما آئی اور مجھ سے کہا۔ بیگم صاحبہ (بیگم محمد علی) نے پچیس روپے منگائے ہیں صاحب کے سگار کے لیے۔ میں نے اس سے کہا بیگم صاحبہ کی چٹھی لاؤ، وہ چلی گئی، تھوڑی دیر میں پھر آکے کہنے لگی، بیگم صاحبہ خفا ہو رہی ہیں، کہتی ہیں فوراً روپے لاؤ۔ میں نے پھر انکار کر دیا۔ انکار تو میں نے کر دیا مگر سوچنے لگا میاں بیوی کا معاملہ ہے کہیں مولانا خفا نہ ہوجائیں۔ ان کا غصہ مشہور تھا۔ دوسرے دن دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کسی نے پیچھے سے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور زور سے دبایا، میں نے مڑ کر دیکھا تو مولانا محمد علی کھڑے مسکرا رہے تھے کہنے لگے ''ربانی میں تم سے بہت خوش ہوا۔''

مجھے خوب یاد ہے، ایک دن شام کا وقت تھا مولانا نے اپنے کمرہ سے باہر آکر پکارا محفوظ! وہ اپنے کیبن سے نکل کر آئے۔ مولانا نے کہا بھئی، اب میں جلد گرفتار کر لیا جاؤں گا۔ بات یہ تھی کہ اس دن انھوں نے وہ معرکۃ الآرا مضمون لکھا تھا جس کا عنوان "The Choice of the Turks" تھا

اس میں ترکوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اتحادیوں کے خلاف جرمنی سے مل جائیں (یہ پہلی جنگ عظیم کی بات ہے) کوئی دو ہفتے بعد ترکوں نے اتحادیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور وہ جرمنی سے مل گئے۔ اب کیا تھا مولانا کو مہرولی میں نظر بند کر دیا گیا وہاں سے چھندواڑہ جیل پہنچا دیے گئے اس طرح ہمدرد اور کامریڈ دونوں دم توڑ کر رہ گئے۔ مولانا نے صحافت کی جو بساط بچھائی تھی وہ الٹ گئی اور تمام مہرے تتر بتر ہو گئے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا محمد علی کا دفتر صحافت کا ایک تربیتی ادارہ تھا چنانچہ ان کے مددگار اس فن میں پختہ ہو گئے تھے۔ بعضوں نے اپنے اپنے اخبار نکالے۔ سید جالب صاحب لکھنؤ پہنچے اور وہاں سے روزنامہ ہمدم جاری کیا جو بہت مقبول ہوا قاری عباس حسین ہمدرد میں کام کرتے تھے، انھوں نے لکھنؤ سے ''تمدن'' جاری کیا۔ قاضی عبدالغفار صاحب نے کلکتہ سے ''صداقت'' نکالا، پھر ''جمہور'' جاری کیا۔ آخر میں حیدرآباد سے ''پیام'' جاری کیا۔

راجہ غلام حسین کامریڈ کے سب ایڈیٹر تھے ان کی عمر مشکل سے تیس سال ہو گی مگر صحافت میں ایک پیر طریقت تھے۔ مولانا محمد علی آخر میں بہت بڑے لیڈر بن گئے ان کا زیادہ وقت قومی اور سیاسی کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ کامریڈ کی ادارت کا بار زیادہ تر راجہ صاحب کے کندھوں پر تھا انھوں نے لکھنؤ سے ''نیو ایرا'' نکالا، اس کے لیے روپیہ لکھنؤ کے سربرآوردہ حضرات نے دیا جس میں بڑی رقمیں وہاں کے ہندو وکیلوں اور بیرسٹروں نے دی تھیں، یہ اخبار کامریڈ کا جانشین تھا، وہی پالیسی، وہی اڈیٹر اور وہی پڑھنے والے تھے۔ چنانچہ چند ہی مہینوں میں اس کی اشاعت ہزاروں تک پہنچ گئی۔ میں اس اخبار کا منیجر تھا، اس کی اٹھان غیر معمولی تھی، مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ اس کی اشاعت میں کچھ دیر ہو گئی تو مسز اینی بسنت نے راجہ صاحب کو خط لکھا:

''میرے پیارے بچے! تمہارا اخبار اب تک نہیں، تم اچھے تو ہو؟''

سر اکبر حیدری نے ان کو حیدرآباد بلایا تھا مگر وہ نیو ایرا چھوڑ کر نہیں جا سکے۔ ایک دن شام کے وقت راجہ صاحب ''ہندوستانی'' کے اڈیٹر کے ساتھ باتیں کرتے رفاہ عام کلب سے آ رہے تھے پیچھے سے ایک گھوڑا ٹم ٹم مڑا کر بھاگا آ رہا تھا اس نے راجہ صاحب کو اس زور کی ٹکر دی کہ وہ گر پڑے

اور بے گرے کہ پھر اٹھ نہ سکے۔ بے ہوشی کی حالت میں ان کو ٹرام ہو رہسپتال پہنچا دیا گیا۔ دوسرے دن الہ آباد اور کانپور کے کئی سرجن آ گئے۔ دہلی سے ڈاکٹر انصاری بھی پہنچ گئے۔ سب نے کوشش کی مگر تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔

آٹھ دن وہ ہسپتال میں بے ہوش رہے، لکھنؤ میں وہ بے حد مقبول تھے، دن بھر ہسپتال کا احاطہ لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ تین آدمی دن رات ان کے پاس رہتے تھے، ایک چودھری خلیق الزماں دوسرے اسحاق علی علوی (ایڈیٹر انباط) اور تیسرا راقم الحروف۔ آٹھویں دن وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اب سوال یہ تھا کہ نیو ایرا کی ادارت کون سنبھالے۔ مولانا محمد علی اس وقت متول جیل میں تھے، انھوں نے کہلوایا کہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کو بلا لیا جائے مگر بیگم صاحبہ بھوپال ان کو بہت عزیز رکھتی تھیں، وہ نہیں آ سکے۔ آخرکار شعیب قریشی نے اخبار کو سنبھالا، شعیب قریشی صاحب "ینگ انڈیا" کے چوتھے اڈیٹر تھے جب گاندھی جی جیل میں تھے، انھوں نے بڑے سلیقہ سے کام شروع کیا۔ اس زمانے میں چودھری خلیق الزماں اور عبدالرحمن سندھی نے بڑی مدد کی، بلا معاوضہ کئی مہینے کام کرتے رہے۔

نیو ایرا کی اشاعت میں خوب اضافہ ہو رہا تھا مگر حکومت کی نظر میں یہ اخبار کھٹک رہا تھا، چنانچہ اس کی ضمانت ضبط ہو گئی اور اس طرح نیو ایرا کا گلا گھونٹ دیا گیا، یہ کامریڈ کی دوسری موت تھی۔

۱۔ ۱۴؍جنوری ۱۹۱۱ء کو بروز سنیچر کلکتہ سے کامریڈ کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔

۲۔ ۱۴؍ستمبر ۱۹۱۲ء کو کامریڈ کا آخری شمارہ (جلد ۴ شمارہ ۱۱) کلکتہ سے نکلا۔

۳۔ ۱۲؍اکتوبر ۱۹۱۲ء کو دہلی سے پہلا شمارہ (جلد ۴ شمارہ ۱۲) شائع ہوا۔

۴۔ ستمبر ۱۹۱۴ء میں ضبطی ضمانت کی وجہ سے کامریڈ بند ہو گیا۔

۵۔ ۲۱؍اکتوبر ۱۹۲۴ء کو دہلی سے کامریڈ دوبارہ جاری ہوا

۶۔ ۲۲؍جنوری ۱۹۲۶ء کو ناقابل برداشت خسارے کی وجہ سے کامریڈ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا

(عبداللطیف اعظمی)

مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم

روزنامہ ہمدرد

مولانا محمد علی مرحوم کے معتقدوں اور مخلصوں میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم کو ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے۔ انھوں نے "محمد علی ۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق" کے نام سے دو حصوں میں جوگراں قدر کتاب لکھی ہے، پیش نظر مضمون ان ہی دونوں جلدوں سے مرتب کیا گیا ہے اور اس کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ الفاظ اور جملے مولانا ہی کے قائم رہیں صرف ایک جگہ ربط کی خاطر مرتب کو کچھ لکھنا پڑا تو اسے مولانا کی عبارت سے الگ کرنے کے لیے قوسین میں کر دیا گیا ہے۔ اس مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جن خیالات اور رایوں کا اظہار کیا گیا ہے وہ براہ راست معلومات اور ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں۔ مدیر معاون

۱۹۱۲ء ختم ہو رہا تھا کہ سرکار انگریزی نے دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل ہونے کا اعلان کیا۔ کچھ روز بعد اس پر عمل درآمد بھی ہو گیا۔ مسٹر محمد علی اور ان کا کامریڈ ان دونوں کو بھی اب دہلی آنا پڑا۔ کامریڈ ستمبر ۱۲ء میں کلکتہ سے ہٹا اور ۱۲ اکتوبر ۱۲ء کو دہلی سے نکلنا شروع ہو گیا۔ ہمدرد نکلا تو نہیں لیکن نکلنے کا اعلان اس کے بھی ہو گیا، بلکہ کچھ عرصے کے بعد لقب ہمدرد کے نام سے ایک مختصر سا روزنامہ نکلنے بھی لگا۔ ہمدرد کی ادارت کے ساز و سامان جس پیمانے پر شروع ہوئے اس زمانے میں اردو اخبارات کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھے۔ بدایوں کے ادیب جلیل میر محفوظ علی بی اے (علیگ) کسی زمانے میں محمد علی کے ہم استاد رہ چکے تھے، وہ اس وقت مالک و مدیر ہمدرد کے مشیر خاص تھے، ان ہی کے مشورے سے ایڈیٹری کے لیے پہلے تو مولوی عبدالحق صاحب بی اے

(جو اب "بابائے اردو" کے لقب سے مشہور ہیں اور اس وقت حیدرآباد دکن میں انسپکٹر آف اسکولز تھے) ریاست رہی، لیکن پہلا تقرر بالآخر اس عہدے پر اردو زبان کے نامور ادیب و ناول نویس مولانا عبد الحلیم شرر کا ہوا، چنانچہ ستمبر میں شرر مرحوم دہلی روانہ ہو گئے۔

محمد علی کا معیار پرچے کے ایڈیٹوریل اسٹاف اور لکھنے والوں ہی کے لیے اعلیٰ نہ تھا بلکہ کاغذ، چھپائی وغیرہ ظاہری لوازم کے اعتبار سے بھی وہ اردو کے ہمدرد کو اپنے انگریزی کامریڈ ہی کی سطح پر دیکھنا چاہتے تھے اور کامریڈ ظاہری صفائی اور زینت کے معیار سے ولایت کے ہفت روزہ جریدوں کا گویا ہم سطح تھا۔ چھپائی لیتھو کے بجائے ٹائپ کی ہمدرد کے لیے طے پائی اور خوشنما ٹائپ کے لیے آرڈر بیروت (شام) اور مصر کو بھیجے گئے۔ قدرتاً وہاں سے آنے میں ہفتوں کی دیر لگی۔ ٹائپ اور پریس کے انتظار سے جلد ختم ہونے والے نہ تھے۔ نقیب ہمدرد تو جوں کا توں نکلتا رہا، اصل روزنامہ صفحے کی ضخامت والا، ملتوی ہی ہوتا چلا گیا اور ۱۹۱۲ء مدت ہوئی ختم ہو چکا، کچھ روز بعد شرر صاحب بھی اکتا کر لکھنؤ واپس آ گئے۔

شرر صاحب کے بعد محمد علی کو ایڈیٹوریل صیغے کے لیے قاضی عبد الغفار بی اے مراد آبادی کے سید جالب دہلوی مل گئے اور کچھ روز بعد محمد فاروق ایم، اے دیوانہ گورکھپوری بھی ہاتھ آ گئے۔ جون ۱۹۱۳ء سے خدا خدا کر کے ہمدرد نکلنے لگا اور اردو صحافت کی تاریخ میں ظاہری، معنوی دونوں جہتوں سے گویا ایک نیا باب کھل گیا۔

کامریڈ کی دھوم تو مچی ہوئی تھی ہی، ہمدرد نکلا تو اس کی بھی دھوم مچ گئی۔ بڑے چھوٹے سب اس کے گرویدہ، لیکن محمد علی کا قدم اب روز بروز اسلامیت کی طرف اور زیادہ ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ مئی ۱۹۱۳ء میں شہر کانپور میں ایک سڑک نکالنے کے سلسلے میں میونسپلٹی اور کلکٹر نے ایک مسجد کے غسل خانہ کو گرا دیا اور اس پر جب مسلمانوں نے اپنے پرجوش احتجاج کا مظاہرہ کیا تو ان کے مجمع پر گولیاں تک چل گئیں، بڑا ہنگامہ برپا ہوا اور اس کے لیڈروں میں مولانا محمد علی بھی تھے۔ کامریڈ نے اپنے احتجاجی اور تنقیدی مضامین میں کلکٹر تو الگ رہے، خود صوبے کے حاکم اعلیٰ سر جیمس مسٹن کی بھی خوب خبر لے ڈالی۔ حکام اس وقت یوں بھی مسلمانوں کی زبان سے کسی کڑی نکتہ چینی کے عادی نہ تھے اور پھر یہ سر جیمس مسٹن تو محمد علی کو اپنا بڑا پرانا "یار وفادار" سمجھ رہے تھے، قدرتاً

بہت گرتے، ادھر جنگِ بلقان کے سلسلے میں ٹرکی کی ہمدردی میں بھی محمد علی پیش پیش اور اب جیسے دار ھی بھی ـــ یہ سب تو تھا ہی کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں یورپ کی پہلی جنگ عظیم میں ٹرکی بھی حرمنی کے صف کی حیثیت سے برطانیہ کے مقابل آگیا اور کامریڈ نے اپنے ایک بڑے بڑے اور بڑے رو ردار مقالے میں جو "جوائس آف دی ٹرکس" کے زیر عنوان "ٹائمس" (لندن) کے ایک مقالے کے جواب میں تھا، ترکوں کو اپنے اس انتخاب میں معذور ٹھہرایا۔ یہ خراج عقیدت کا تھا۔ حکام انگریز اب کیسے اور کب تک درگزر سے کام لیتے۔ کامریڈ فوراً بند اور محمد علی فوراً نظر بند ہوئے ـــ وہی محمد علی جو ابھی سال دو سال قبل تک بڑے بڑے حکام کی آنکھوں کے تارے اور منظور نظر بنے ہوئے تھے

(۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کے کامریڈ میں "جوائس آف دی ٹرکس" شائع ہوا۔ اس کے فوراً بعد کامریڈ کی ضمانت ضبط ہوئی اور اخبار بند ہوگیا، مگر روزنامہ ہمدرد جاری رہا۔ لیکن اس زمانے میں مولانا محمد علی کو جن حالات سے گذرنا پڑا، اس کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہوگئی اس لیے ۱۵ اپریل ۱۹۱۵ء کو ڈیڑھ ماہ کی رخصت لے کر آرام کرنے کے لیے اپنے وطن رام پور چلے گئے، لیکن وہاں نظر بند کر دیے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد بحالی صحت کے لیے پہاڑ پر جانے کی اجازت ملی چنانچہ اپنی صحت کے بارے میں ڈاکٹر انصاری سے مشورہ کرنے کے لیے ۱۳ مئی کو دہلی آئے اور ارادہ یہ تھا کہ ان سے مشورہ کرنے کے بعد ۱۵ مئی کو مسوری چلے جائیں گے مگر ۱۵ مئی کو انھیں دہلی کے قریب مہرولی میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس نظر بندی کے بعد چند ماہ تک ہمدرد جاری رہا مگر ۱۰ اگست (۱۹۱۵ء) کو بند ہوگیا۔ کوئی پانچ پونے پانچ سال کے بعد آخر دسمبر ۱۹۱۹ء کو مولانا بیتول جیل سے رہا ہوئے۔ اس کے بعد ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا دوبارہ گرفتار کیا گیا اور مقدمے کے بعد دو سال کی سزا ملی۔ ۲۹ اگست ۱۹۲۳ء کو رہا ہوئے تو کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور اسی سال ۲۸ دسمبر کو کوکناڈا میں مولانا کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے بعد دوسرے سال ۱۹۲۴ء میں ۱۳ اکتوبر کو کامریڈ ۹ نومبر کو ہمدرد دوبارہ جاری ہوئے۔ اب مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم کی زبانی دوسرے دور کے حالات سنیے۔)

قیام اب تک علی گڑھ میں تھا، گویا یہی گھر تھا اب دہلی منتقل ہوئے اور کامریڈ اور ہمدرد کے دوبارہ اجراء کا ارادہ پختہ ہوا۔ فضا کا حال دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے تھے اور اخبارات نکالے

قصداسی خیال سے کیا کہ ان کے ذریعہ فضا درست کریں گے۔ ہندو مسلمان بات بات پر لڑ رہے تھے۔ اور قوتوں کا رخ بجائے حکومت سے مقابلے کے خانہ جنگیوں کی طرف پھرا ہوا تھا۔ اگست ستمبر کا زمانہ ہوگا سب دہلی آگئے اور وہی مکان پھر کرایہ پر لیا جس میں دس برس پہلے رہا کرتے تھے۔ کوچہ چیلان کا اجڑا ہوا نشیمن مدت کے بعد پھر آباد ہوا۔ مکان بہت بڑا اور وسیع، پیچھے کے حصے میں رقی پریس کی مشینیں اور پریس کا سارا کاروبار، کوٹھے پر مینیجر، خزانچی اور عملۂ کتابت وغیرہ کے دفتر۔ صیغۂ ادارت کے بھی چھوٹے چھوٹے، لیکن الگ الگ کمرے اور کامریڈ کے سب اڈیٹر کا کمرہ تو بالکل ہی الگ، مختصر صحن، پاخانہ، غسل خانہ۔ دوسری طرف خود مولانا کا بڑا سا آفس اور ڈرائنگ روم اسی طرف سے نیچے رہائشی مکان کا بھی راستہ، اوپر اور نیچے دونوں منزلوں میں دو تین فاضل کمرے، اچھے خاصے وسیع، مولانا کے عزیزوں اور مہمانوں کے لیے۔ کبھی کبھی پھر بھی اتنا ہجوم ہوجاتا کہ مکان کی وسعت ناکافی ہوجاتی۔ مکان کا موقع بھی برا نہ تھا۔ دریا گنج کا ڈاکخانہ قریب ہی اور جامع مسجد بھی دہلی کے فاصلوں کے معیار سے قریب ہی، اسٹیشن بھی کچھ ایسا دور نہیں۔ ملا واحدی صاحب اور مفتی کفایت اللہ صاحب اور راشد الخیری صاحب کے مکانات اسی محلے میں۔

اخبار نکالتے وقت تجارتی پہلو نام کو بھی پیش نظر نہ تھا۔ مقصد تمام تر اصلاحی تھا لیکن اب اخبار نکالنا آسان نہ تھا۔ ۱۹۱۲ء اور ۱۹۲۴ء میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس بارہ سال کی مدت میں جنگ یورپ کے اثرات مابعد سے دنیا کی دنیا بدل چکی تھی

نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

پہلی چیز تو مصارف ہی کی زیادتی تھی۔ ہر شے پہلے سے کہیں زیادہ گراں ہو گئی تھی۔ کاغذ کی قیمت، کاتبوں کی اجرت، اسٹاف کی تنخواہ، ہر شے کا معیار بلند ہو چکا تھا

غرض جہاں تک ظاہری مصلحت اندیشیوں کا تعلق ہے، اس وقت محمد علی کے اخبار نکالنے

---

[1] اشارہ شدھی، سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کی طرف ہے۔ بقول مولانا دریا آبادی: "جیل جاتے وقت محمد علی ملک کی جو فضا چھوڑ گئے تھے، اب اس کے بالکل برعکس تھی، بات بات پر بدگمانی اور بے اعتمادی ایک طرف شدھی اور سنگھٹن کا زور، دوسری طرف اس کے جواب میں تبلیغ و تنظیم"

(محمد علی — ذاتی ڈائری کے چند ورق (حصہ اول) صفحہ ۱۵۴)

کے کوئی معنی نہ تھے، لیکن اس جوش و اخلاص کے پتلے کو ان ظاہری مصلحت شناسیوں کے ہوش کہاں تھے ہی کب؟ . . . اب پہلی بار سوال سرمایے کا پیدا ہوا۔ ماکر پریس کی مشینیں پہلے کی موجود تھیں اور کچھ اب منگالی گئی تھیں لیکن ظاہر ہے کہ مشین ہی تو سب کچھ نہیں، کاغذ کی قیمت، اسٹاف کی تنخواہوں کے لیے ہزاروں روپیہ ماہوار، مکان کا کرایہ وغیرہ وغیرہ۔ آخر ان سب کے لیے کیا سبیل تھی؟ ——— اب اللہ جانے محمد علی نے کن کن دوستوں، مخلصوں سے جوڑ توڑ کر کچھ روپیہ فراہم کیا۔ احمد آباد سے تو کل مشینیں آگئی ہیں۔ کلکتہ سے لتھو کی مشینیں بھی روانہ ہو چکی ہیں، ایک دو یوم میں وہ بھی یہاں پہنچ جائیں گی۔ صرف مشینوں کا لگانا باقی ہے، دوسرے ہفتے میں نہیں تو تیسرے ہفتہ ستمبر[2] (۱۹۲۴ء) میں اخبار نکلنے میں کوئی شبہ ہی نہیں۔

ایڈیٹوریل اسٹاف (عملۂ ادارت) کا سوال سرمایے کے مسئلے سے کچھ کم اہم نہ تھا۔ مولانا اس پر تلے ہوئے تھے کہ ان کی جیب خرچ تک بھی پڑ جائے، اسٹاف بہرحال بہتر سے بہتر ہی منتخب ہو لیکن آہ! کہ محمد علی کی بیسیوں دوسری آرزوؤں کی طرح اس آرزو کا بھی بالکل کیا معنی بڑی حد تک ہی پورا ہونا مقدر میں نہ تھا۔ "کامریڈ" کے لیے تو کہنا چاہیے کہ آخر تک بھی کوئی مددگار نہ ملا۔ درخواستیں جتنوں کی آئیں، وہ مولانا کی نظر میں نہ جچے اور مولانا جنہیں لینا چاہتے وہ خود کسی نہ کسی معذوری سے نہ آسکے۔ مولانا کی نظر پنجاب کے ملک عبدالقیوم بیرسٹر ایٹ لا پر تھی جو لندن سے "مسلم آؤٹ لک" نکال چکے تھے، مولانا ان کے مضامین سے بہت خوش تھے لیکن ان کی امداد کبھی اس سے آگے نہ بڑھی کہ بس کبھی کبھی کامریڈ کے لیے کوئی مضمون بھیج دیتے۔ صوبہ بہار کے مبین الرحمٰن بی اے، ایل ایل بی کے مضامین مولانا نے "ممبئی کرانیکل" میں پڑھے اور انہیں بہت پسند کیا، مدتوں ان سے مراسلت رہی اور برابر ان کی آمد کا انتظار رہا، بالآخر نہ آئے اور اپنے صوبے کے ممبر ہو گئے۔ سب سے زیادہ انتظار شعیب قریشی صاحب کا رہا (جن کی قسمت میں ۲ سال کے بعد مولانا کا داماد ہونا لکھا تھا) علی گڑھ کے ایم اے ایل ایل بی تھے، لندن میں بیرسٹری پڑھے ہوئے، بڑے مخلص اور پرجوش، "نیو ایرا" (لکھنؤ) کو مدت تک سنبھالے رہے، پھر گاندھی جی کی گرفتاری پر ان کے انگریزی ہفتہ وار ینگ انڈیا کے ایڈیٹر رہ چکے تھے، "کامریڈ" کی سب ایڈیٹری کے ہر طرح اہل تھے، ان کے لیے سب کوششیں ہوئیں ان کا

---

[2] دوسرے دور کا پہلا شمارہ ۸ نومبر ۱۹۲۴ء کو نکلا۔ (مدیر معاون)

ل نہ بھیجنا تھا نہ بھیجا۔ بمبئی سے ایک صاحب کی درخواست آئی، بڑے ہی نیاز مندانہ اور معتقدانہ لب و لہجہ میں (اس سلسلے کی ہر مراسلت اور ہر درخواست میری نظر سے گزرنا لازمی تھی)، مولانا نے ان ہی کو غنیمت سمجھا۔ ہمت کوشی سے تو نہیں لیکن بہرحال انھیں بلا لیا، کچھ روز تو انھوں نے بھی اپنی درخواست کے انداز تحریر کو خوب نبھایا، اس کے بعد "کامریڈ" ہی سے علیحدہ نہیں ہوئے بلکہ مولانا کے بھی شدید ترین دشمن ہو گئے، اور انھیں اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

"ہمدرد" کے لیے امیدواروں کی کمی نہ تھی، مگر وہی دقت یہاں بھی تھی، جنھیں ہمدرد چاہتا تھا وہ عنقا تھے اور جو جو آنے کو تلے رہتے تھے ان کی میزبانی میں ہمدرد کو تامل تھا۔ مولانا کو اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ ہر درخواست کو پڑھ سکیں، ساری ذمہ داری اسی نیاز مند کے سر تھی۔ جالب صاحب سے بے زبانی گفتگو کی، وہ حضرت اب لکھنؤ کے قطب بن چکے تھے، وطن کی کشش بھی ہٹنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ زمیندار (لاہور) کے سالک صاحب سے بھی مراسلت رہی مگر بے نتیجہ، آخری قرعۂ انتخاب ان چھ صاحبوں کے نام پڑا: (۱) محمد فاروق صاحب دیوانہ گورکھپوری ایم اے (علیگ) ہمدرد کے دور اول میں بھی رہ چکے تھے (۲) احتشام الدین صاحب دہلوی ایم اے (علیگ)، بعد کے مشہور نعت نویس (۳) عارف ہسوی صاحب، پرانے نیشنلسٹ اور کانگریسی پرچوں میں کام کیے ہوئے (۴) قاری عباس حسین صاحب دہلوی، ہمدم وغیرہ میں کام کیے ہوئے، ایک ماہنامہ تمدن بھی نکال چکے تھے (۵) محمد جعفری صاحب جامعی مچھلی شہری، جامعہ کے ہونہار نوجوان، ہمدرد میں شروع سے آخر تک رہے، بعد کو اپنا روزنامہ ملت نکالا (۶) حسن ریاض صاحب بلند شہری، اپنا ایک ہفتہ وار نکال چکے تھے، مدت کے بعد لکھنؤ سے روزنامہ ہمت اور پھر دہلی سے لیگی روزنامہ منشور نکالا۔

اردو کے کسی روزنامہ میں اس وقت تک نہ سب ایڈیٹروں اور مترجموں کی اتنی تعداد تھی اور صحافت کے اعتبار سے اتنا بہتر اسٹاف کہیں اور جمع تھا، غرض کچھ نہ ہونے پر بھی ہمدرد کا اسٹاف کیفیت اور کمیت دونوں حیثیتوں سے اپنی نظیر آپ تھا۔ یہ بھی ٹھہری کہ مختلف مرکزی مقامات میں ہمدرد کے "وقائع نگار خصوصی" مقرر ہوں، چنانچہ لکھنؤ، بمبئی، علی گڑھ وغیرہ میں وقائع نگاروں کا تقرر ہوا اور مشاہیر اہل قلم سے درخواست کی گئی کہ سیاسی، علمی، ادبی، مذہبی عنوانات پر اپنے ماہرانہ فاضلانہ مقالات سے وقتاً فوقتاً ناظرین ہمدرد کو مستفید کرتے رہیں۔

۳۱ اکتوبر [۱۹۲۴ء] کو خدا خدا کر کے کامریڈ کا پہلا پرچہ نکلا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، آٹھ دن کے بعد ۸ نومبر کی شام کو ۹ نومبر کا پہلا پرچہ ہمدرد کا شائع ہوا۔ ۱۲ سو پرچے خاص دہلی میں نکل گئے۔ اور مانگ برابر جاری رہی۔ محمد علی کا سکہ اب دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔

کامریڈ کی مالی حالت، اس دور ثانی میں، اچھی کبھی بھی نہ رہی، بس پرچہ پشتم پشتم کسی طرح چلے گیا، ایک مہینے میں اگر بڑا زور لگانے سے سو خریدار کہیں بڑھے تو دوسرے مہینے سوا سو خریدار گھٹ بھی گئے فروری ۱۹۲۶ء میں محمد علی سخت علیل ہوئے، ذیابطیس تو تھا ہی، اب جسم میں پھوڑے جا بجا نکل آئے اور بالکل ہی صاحب فراش ہو کر پڑ گئے۔ کامریڈ چار مہینوں سے قرض چلا آ رہا تھا، چار نمبروں کا مجموعہ ایک نمبر ۲۲ جنوری کی تاریخ ڈال کر نوجبر کسی طرح نکال ہی دیا، اس کے بعد کا پرچہ نکلنا کسی طرح ممکن نہ ہوا۔ پریس والوں، مشین مینوں، کمپازیٹروں وغیرہ کے مطالبات مدت کے چڑھے ہوئے تھے، اس ہی کا چکانا اور بیباق کرنا دشوار ہو رہا تھا، نئے مصارف کی گنجائش کہاں سے نکلتی۔ اس طرح کوئی ۱۵ مہینے کی آب و تاب کے بعد یہ آفتاب صحافت غروب ہو گیا اور اب کی مرتبہ اس کی تدفین انگریز حکومت کے جبر و تشدد کے ہاتھوں نہیں، خود اپنی قوم کی ناقدریوں کے ہاتھ ہوئی۔

وسط مارچ ۱۹۲۹ء میں میں وطن سے حج کے لیے بمبئی روانہ ہو گیا اور مئی میں مدینہ منورہ میں تھا کہ مدینہ (بجنور) کے ایک پرچے سے ہمدرد کے بند ہو جانے کی نہایت درجہ اندوہناک خبر ملی، ہاتھ مل کر رہ گیا، کر ہی کیا سکتا تھا اور خود مولانا بیچارے بھی کیا کرتے، مسلسل مالی خسارہ کب تک اٹھاتے رہتے۔

——— کامریڈ ہفتہ وار فروری ۱۹۲۶ء میں بند ہو چکا تھا، ہمدرد اردو روزنامہ اپریل ۱۹۲۹ء میں بند کرنا پڑا۔ یہ تھا قوم کی طرف سے قوم کے سب سے بڑے خادم اور سب سے بڑے مخدوم کو گل صلہ! کوئی دوسرا ہوتا تو عجب نہیں جو اتنی ہمت شکنیوں اور حوصلہ فرسائیوں کے بعد اس کا جگر شق ہو جاتا یا کم از کم قومی خدمات کا تو ان کے بعد نام بھی نہ لیتا۔

[illegible] داللطیف اعظمی

مولانا محمد علی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ

مولانا محمد علی مرحوم جامعہ ملیہ کے بانیوں میں سے اور پہلے شیخ الجامعہ ہیں۔ جامعہ ملک کے مخصوص حالات میں وجود میں آئی، اس لیے عام اداروں اور یونیورسٹیوں کے برخلاف، اس کا کوئی ایک بانی نہیں ہے بلکہ وہ تمام بزرگ ہیں جن کی کوششوں سے اس کا وجود عمل میں آیا۔ خود مولانا نے اپنے ایک مضمون میں جو جامعہ ملیہ کے بارے میں لکھا تھا، جامعہ کے پہلے امیر جامعہ حکیم اجمل خاں صاحب کو اس کا بانی قرار دیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا محمد علی نے اس کے قیام کے لیے جو انتھک کوششیں کیں، وہ کسی اور کے بس کی نہ تھی، یہ ان کی ہی پرجوش اور مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ تھا کہ انتہائی نامساعد حالات کے ہوتے ہوئے جامعہ ملیہ نہ صرف یہ کہ قائم ہوگئی بلکہ ملک و قوم کے دلوں میں اس نے ممتاز جگہ حاصل کرلی۔ افسوس کہ ملک کے سیاسی حالات کی وجہ سے وہ زیادہ عرصے تک شیخ الجامعہ کے فرائض انجام نہ دے سکے، انھوں نے پہلے کوشش کی کہ شاعر مشرق علامہ اقبال اس عہدے کو قبول فرمالیں اور جب انھوں نے معذوری ظاہر کی تو ان کی گرفتاری سے یہ مسئلہ خود بخود حل ہوگیا، ان کی جگہ جناب عبدالمجید خواجہ صاحب شیخ الجامعہ مقرر ہوئے اور اس وقت تک وہی اس خدمت کو انجام دیتے رہے جب تک ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے، فروری ۱۹۲۶ء میں جرمنی سے واپس آکر اس عہدے کا چارج نہیں لے لیا۔ اگرچہ اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے مولانا شیخ الجامعہ کی ذمہ داریوں سے الگ رہے مگر جامعہ اور ارباب جامعہ سے ان کا تعلق آخر دم تک قائم رہا۔ جب تک جامعہ علی گڑھ میں رہی، مولانا کا مستقل قیام جامعہ ہی میں تھا۔ اپنے وطن رام پور میں قدم رکھنے کی انھیں اجازت نہیں تھی اس لیے وطن اور گھر سب کچھ جامعہ ہی تھا اور

جب دوجون ۱۹۲۵ء میں جامعہ دہلی آگئی تو کامریڈ اور ہمدرد کے بند ہونے کے بعد اگر کوئی جگہ تھی جسے مولانا اپنا گھر کہہ سکتے تھے تو وہ جامعہ تھی، چنانچہ انھوں نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی گلنار بیگم کا عقد جامعہ ہی کی عمارت میں کیا اور باہر کے تمام مہمان جامعہ ہی میں ٹھہرے۔ جامعہ سے غیر معمولی تعلق اور محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ جب پہلے امیر جامعہ حکیم اجمل خاں صاحب کا انتقال ہوگیا اور جامعہ کی مالی حالت بہت زیادہ خراب ہوگئی تو انھوں نے ۱۹۲۸ء کے اوائل میں جامعہ کی خصوصیات پر متعدد مضامین لکھے جو ان کے روزنامہ ہمدرد میں شائع ہوئے۔ غرصہ ہوا جامعہ نے ان مضامین کو کتابچے کی صورت میں شائع کیا تھا جس کا پہلا عنوان ہے "جامعہ ملیہ ہے کیا؟" اور دوسرا عنوان ہے۔ "از کلید دین در دنیا کشاد" اس میں مولانا نے بنیادی طور پر جامعہ کی تین خصوصیات بیان کی ہیں پہلی یہ کہ جامعہ میں دنیاوی علوم کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی بھی تعلیم دی جاتی ہے، دوسری یہ کہ اس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے اور تیسری خصوصیت ہے خدا پرستی، ملت پروری اور وطن دوستی۔ آج بھی جبکہ ملک کے سیاسی و سماجی حالات اور تعلیمی نظام میں بڑی تبدیلی آگئی ہے، مگر ان خصوصیات کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ ذیل میں ان تینوں خصوصیات کا خلاصہ خود مولانا کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے:

پہلی خصوصیت کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے کہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ نے عربی زبان کو ہر مسلمان طالب علم کے لیے لازمی کردیا ہے اور علاوہ تفسیر و حدیث عقائد و فقہ کی تعلیم کے زبانِ عربی کے ادب میں نثر کا کورس، قرآن کریم اور صرف قرآن کریم کو رکھا ہے۔ اس کے بعد جامعہ کا ایک تعلیم یافتہ علماء کرام سے مستغنی تو نہیں ہوسکتا مگر ان کا دست نگر بھی نہیں رہتا۔ افسوس کہ ہمارے دینی مدارس کے طلبہ کو مدتوں علوم دینی سے یہاں تک محروم رکھا گیا کہ اکثروں نے دین کو ایک پیشہ اور اسی کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنا رکھا ہے جس کے باعث انھیں نہ دین ہی کی دولت صحیح معنوں میں نصیب ہوتی ہے، نہ دنیا کی اور بقول شاعر:

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم   نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے ہوئے
گئے دونوں جہان کے کام سے ہم   نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے

انگریزی مدارس میں اول تو کہیں تعلیم دی ہی نہیں جاتی۔ الا ماشاء اللہ اور جہاں کچھ برائے نام دی بھی جاتی ہے، اس کی حقیقت کوئی ہم سے پوچھے جو مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ سے

دینیات کے درجنوں امتحان پاس کرکے کورے کے کورے نکلے تھے، وہ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ قرآن کریم میں ہے کیا؟ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شانِ امتیاز کو دیکھو کہ وہاں دین دنیا دونوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جامعہ کی دوسری خصوصیت کے بارے میں "مادری زبان میں تعلیم" کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہوئے مولانا نے فرمایا ہے کہ۔ "ہماری غلامانہ ذہنیت کسی چیز سے اس قدر ثابت نہیں ہوتی جس قدر کہ ایک غیر زبان میں تحصیل علوم کی مشقت رائیگاں سے ثابت ہوتی ہے۔ ہم مشرقی تو وحشی لوگ ہیں اور بربریت میں مبتلا ہیں لیکن خود تہذیب یافتہ مغربیوں کا کیا شعار ہے؟ کیا کوئی انگریز اپنے بچے کو تاریخ یا سائنس فرانسیسی یا جرمن زبان میں پڑھواتا ہے؟ کیا کوئی فرانسیسی یا اطالوی اپنے بچے کو جغرافیہ یا ریاضی انگریزی یا روسی زبان میں سکھواتا ہے؟ لیکن ہماری غلامی اور اب ہماری غلامانہ ذہنیت کو دیکھ کر ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے ہندوستانی اساتذہ بھی جو اکثر انگریزی زبان کو خود بھی اس طرح نہیں جانتے جس طرح کہ انگریز جانتے ہیں، ہندوستانی بچوں کو تاریخ اور سائنس، جغرافیہ اور ریاضی انگریزی میں سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ زبان ہے کیا؟ اظہارِ خیالات کا ذریعہ لیکن اگر ایک شخص ایک زبان سے ناواقف ہے یا اس سے کم واقفیت رکھتا ہے تو وہ زبان اس کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو ایک گاڑی کے بے پختہ سڑک جس پر گھوڑا گاڑی کو بآسانی کھینچ کر لے جا سکتا ہے۔ اگر سڑک ہموار ہے تو گھوڑے پر صرف گاڑی کھینچنے ہی کی مشقت کا بار پڑتا ہے یہی تحصیل علوم کا حال ہے۔ اگر شاگرد و استاد دونوں ایک زبان سے بخوبی واقف ہیں تو استاد کے واسطے اظہارِ خیالات کے لیے ایک اچھا ذریعہ موجود ہے، لیکن اگر استاد کی زبان ہی شاگرد کو اچھی طرح نہ آتی ہو تو پھر سبق یاد کرنا تو درکنار، زبان سمجھے یا سبق سمجھے؟ ... شاگرد کی مادری زبان اس کے تحصیل علوم کے لیے وہی حکم رکھتی ہے جو ایک کشتی یا جہاز کے لیے پانی اور ایک غیر زبان جس سے وہ پوری طرح واقف نہیں اس کے لیے وہ حکم رکھتی ہے جو ایک کشتی یا جہاز کے لیے زمین اور اس کے روڑے۔ سب سے زیادہ تیز رو ہوائی جہاز ہوتے ہیں، کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہوائی رگڑ زمین کی رگڑ تو کیا پانی کی رگڑ سے بھی بدرجہا کم ہوتی ہے۔ یہی حال تحصیل علوم کے لیے مادری زبان اور غیر زبان کی رگڑ کا ہے لیکن ہماری غلامی اور غلامانہ ذہنیت کو دیکھو کہ کچی میں گاڑی چلاتے ہیں اور ریل گاڑی کو ہم نے ریل کی پٹڑی سے اتار ڈالا ہے، کشتی کو ریتے میں چلا رہے ہیں اور پھر بھی

امید ہے کہ ہم یورپ کے ہوائی جہازوں سے زیادہ تیز رفتار ثابت ہوں گے اور یورپ والوں سے پہلے ہم منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ خدا ہماری حماقت پر رحم کرے۔ جامعہ کے بانی (مراد حکیم اجمل خاں) کو تجربہ ہو چکا ہے اور اس لیے اس نے جامعہ میں تحصیل علوم کے لیے صرف مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم [illegible] کا نتیجہ یہ ہوا کہ جامعہ میں کم از کم دو سال کم صرف ہوتے ہیں اور اس کے طالب علموں کی معلومات دوسری درس گاہوں کے طلبہ سے اس قلیل عرصے میں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔"

جامعہ کی تیسری خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ: "جامعہ ملیہ اسلامیہ نے قومیت مشترکہ ہندیہ اور ملت اخوت اسلامیہ کے اجزائے معرد کو اس طرح مرکب کیا ہے کہ باوجود سارے ملک کی فضا کے بے حد مکدر ہو جانے کے، جس کا اثر اکثر کالجوں اور اسکولوں پر پڑا ہے اور بالخصوص دہلی میں آئے دن فسادات کے رونما ہونے کے ایک شخص نے بھی اب تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ اور طلبا کی شکایت نہیں کی۔ ان میں تنگ نظری اور تعصب کی زیادتی یا احساس مذہبی دلی کی کمی نظر نہیں آئی، بلکہ جس کسی نے جامعہ کی جانچ کی اس پر روشن ہو گیا کہ اس کے طلبا، خدا پرست بھی ہیں، ملت پرور بھی ہیں اور وطن دوست بھی ہیں۔۔۔۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سات سوا سات برس کی زندگی خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے جہاں اپنی خدا پرستی اور ملت پروری کو اپنا شعار بنایا، وہیں اس نے وطن دوستی کو بھی اپنے طلبا کی زندگی کا ایک ولولہ انگیز جذبہ سمجھا اور اس کو ہمیشہ ابھارا۔"

مولانا نے اپنے ایک مضمون میں جامعہ کی ایک چوتھی خصوصیت بھی بیان کی ہے اور وہ ہے دستکاری کی تعلیم۔ مولانا لکھتے ہیں: "جامعہ میں تاریخ و فلسفہ، ادب اور سائنس ہر مضمون کے پڑھنے والے کے لیے یہ بھی لازمی کر دیا گیا ہے کہ ہفتے میں چند گھنٹے کسی نہ کسی دستکاری کی نذر کیے جائیں تاکہ اس کے طلبہ اگر ضرورت پڑے تو اکل حلال کو چھوڑ کر حرام خوری پر مجبور نہ ہو جائیں اور اگر اپنی دماغی قابلیت کی کبھی اتنی کساد بازاری پائیں کہ قوت لا یموت بھی اس کے ذریعے سے حلال طریقے پر نہ کما سکیں تب بھی اپنے تئیں بے دست و پا نہ سمجھیں۔۔۔۔"

جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کی ابتدائی زندگی



مردِ حق پسند

بیادگار مولانا محمد علی جوہر

جذبِ عمل کی، جوش کی، دریا دلی کی بات
دیوانہ ہو کے کرتا تھا وہ آگہی کی بات
اس کی ہر اک ادا میں تھی اک شانِ حریت
اس کی ہر ایک بات تھی غیرت دہی کی بات
بے باکئ خیال و عمل اس کو تھی عزیز
اس کی نظر میں جرم تھی افسردگی کی بات
سرگرمئ حیات کا پیکر تھی اس کی ذات
کرتا رہا وہ زندگی بھر زندگی کی بات
چھڑتا ہے جب کبھی کہیں دار و رسن کا ذکر
اُس پر ہی ختم ہوتی ہے حق دوستی کی بات
اپنی مثال آپ تھا وہ مردِ حق پسند
دل کھول کر ہمیشہ کہی راستی کی بات

یہ تو محمدؐ اور علیؓ کا ہے فیض خاص
سب کو کہاں نصیب محمد علی کی بات

فکر و نظر کے جوہرِ نایاب بکھیر کر
کی اس نے کیا ابھرتی ہوئی روشنی کی بات

تعبیر اس کے خواب حسیں کی ہے "جامعہ"
اس میں اے دوستو، رہے قائم اسی کی بات

حسنِ بیاں کا، زورِ قلم کا دھنی تھا وہ
ہر شخص کہہ رہا ہے، عجب آدمی تھا وہ

روح کا خطاب

(مدتوں بعد یومِ مولانا محمد علی جوہر منائے جانے پر)

مدتوں بعد سہی، آج تو دل شاد کیا — دوستو، کم نہیں یہ بھی کہ مجھے یاد کیا
میں اگر جاں دادۂ گلہائے رہِ الفت ہوں — اب بھی ویسا ہی گرفتارِ غمِ ملت ہوں
جب بھی دنیا سے پلٹ کر کوئی سال آتا ہے — جانے کیوں مجھ کو تمہارا ہی خیال آتا ہے
ے پوشیدہ تمہارے سحر و شام نہیں — ہائے وہ پیار، کہ جس پیار کا کچھ نام نہیں

یہ تھا جب تم میں، تم اتنے کبھی معذور نہ تھے — اہلِ دل کے کبھی پہلے تو یہ دستور نہ تھے
ے ماضی کو بھلا دو، یہ ادا خوب نہیں — آپ اپنے سے بھی کیا، سچ کہو، محجوب نہیں
تم سے روشن تھی کبھی شمعِ شبستانِ وطن — اے عزیزانِ وطن، روحِ وطن، جانِ وطن
ہی گرمیٔ اندازِ وفا یاد نہیں — اپنے جینے کی بھی کیا تم کو ادا یاد نہیں
ھی ماتھے پہ تمہارے جو شکن آتی تھی — برق بھی آنکھ ملاتے ہی تڑپ جاتی تھی

جب بھی زنداں میں کھنک جاتی تھی کوئی زنجیر
بن کے رہ جاتے تھے دربان سراپا تصویر

تم سے دنیا کے اولوالعزم سبق لیتے تھے
دیکھ کر دار و رسن تم تھے جو ہنس دیتے تھے

وہ برستے ہوئے شعلے، وہ گرجتے بادل!
بن کے تم اُٹھے تھے ان کے لیے پیغام اجل

دل میں شعلوں کو سدا تم نے دبائے رکھا
پھر بھی ہونٹوں پہ تبسّم کو جگائے رکھا

ایشیا، آج بھی ممنون تمہارا ہی تو ہے
رگِ ہر گل میں جو ہے خون، تمہارا ہی تو ہے

دل کے ہر نغمے کو تم ساز دیا کرتے تھے
کوئی آواز ہو، آواز دبا کرتے تھے

تم اور اس درجہ پریشان، یہ کوئی بات ہوئی
اس طرح سر بہ گریباں، یہ کوئی بات ہوئی

دھوپ کچھ دیر کی مہماں ہے اتر جانے دو
رنج جتنے بھی ہیں، راہی ہیں گذر جانے دو

یوں بھی آپ اپنے کو للہ نہ بدنام کرو
میری یادوں سے گلے مل کے ہی کچھ کام کرو

دور افتادہ سہی، تم سے مگر دور نہیں
اپنے پیاروں کو بھلا دوں، مرا دستور نہیں

غم کسی کا ہو، خوشی دل کی سمو دیتا ہوں
جب کبھی یاد وطن آتی ہے رو دیتا ہوں

اِس گلستان میں کلی دل کی مرے کھل نہ سکی
مجھ کو دو گز پئے مدفن بھی زمیں مل نہ سکی

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

نذرِ جوہر

ے مجاہد اے امیرِ کاروانِ حریت — سرزمینِ ہند پر اے آسمانِ حریت
تیرے اربابِ وطن کو آرہی ہے تیری یاد — ملک میں ہر سو منائی جا رہی ہے تیری یاد
حفہ حسنِ ارادت لے کے آیا ہے وطن — نذرِ گل ہائے محبت لے کے آیا ہے وطن
ہر طرف چرچے ہیں تیری عظمتِ کردار کے — تذکرے ہیں تیری قربانی، ترے ایثار کے
تونے پیدا کر دیا فکر و نظر میں انقلاب — تونے دیکھا ہند کی آزادیٔ کامل کا خواب
سرنگوں تیرے مقابل تھا فرنگی کا غرور — تو وہ شیشہ تھا کہ تھا پتھروں کو جس نے چور
تونے گاندھی جی کے قومی زاویہ ہائے نظر — کر دیے اسلامیانِ ہند سے نزدیک تر
نے فرقِ کیش و مذہب کو فسانہ کر دیا — تونے ہم کو صف بہ صف، شانہ بہ شانہ کر دیا
ل سے تھا تحریکِ قومی کا علم بردار تو — تھا ہمارے کارواں کا قافلہ سالار تو
فکر سے تیری صحافت کی نئی سمتیں ملیں — آج تک اس صنفِ فن میں ترا کوئی ہمسر نہیں
رق خاطف تھا اپنی تلوار تھا تیرا قلم — تیرے سوزِ دل سے شعلہ بار تھا تیرا قلم
رے نہ پائے گی صحافت اور خطابت کی کتا — تیری بذلہ سنجی و حاضر جوابی کا جواب

ہند والوں کی زبوں حالی کا غم بھی تھا تجھے
اور پاسِ عزّ و ناموسِ حرم بھی تھا تجھے

رشک کے قابل یہ شانِ سرفرازی بھی تری
نغمہ ہندی تھا مگر لَے تو حجازی بھی تری

تیرا دل تھا مِلّتِ اسلام کا درد آشنا
اس لیے ڈالی تھی تحریکِ خلافت کی بِنا

تجھ کو اپنے اس گداز دل کی قیمت مل گئی
دفن کی بیت المقدس میں سعادت مل گئی

حق کی راہوں سے قدم ترا بھٹک سکتا نہ تھا
ٹوٹ تو سکتا تھا تو لیکن لچک سکتا نہ تھا

ہر طرف اس نک ترے عزم و عمل کے سائے ہیں
ہم کو تیرے نقشِ پا ہی تا بہ منزل لائے ہیں

اے دیارِ ہند کے فردوس مسکن رہنما
حق تو ہم سے کیا ادا ہو گا تری خدمات کا

ہاں مگر دامن میں ہیں یہ چند آنسو، چند پھول
اے گرامی قدر، بہ نذرِ عقیدت ہو قبول

شذرات (بہ سلسلہ صفحہ ۱۰)

۔ باز رکھے لیکن وہ اس 'ملیت' کا بھی طرفدار نہیں ہو سکتا جس کی طرف اسے بعض مسلمان گھسیٹنا
۔ ہتے ہیں اور وہ ہمیشہ اسے اپنا فرض سمجھے گا کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم پر ظلم کرے تو یہی نہیں کہ
اس کو اس ظلم میں مدد نہ دے بلکہ اسے اس ظلم سے باز بھی رکھے۔ کیا قومیت کے نئے دلدادہ اپنی
۔ پرستی کے لیے اس سے بہتر کوئی اصول آج ایجاد کر سکتے ہیں؟" مولانا نے یہ بات ۱۹۲۶ء
میں ہی کہی، تقریباً چار سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ مسلسل جدوجہد، محنت و مشقت اور ایثار
نی سے بھری پُری زندگی کے آخری چند برس مولانا پر سخت گزرے، اپنے بھی ان سے خفا ہے
اور بیگانے بھی ناخوش ہوئے، خطا ان کی یہ تھی کہ وہ زہر ہلاہل کو قند کہنے کے لیے تیار نہ تھے۔
" قومیت" اور " ملیت" کے مابین مطابقت اور ہم آہنگی کی بات کے لیے اس وقت کی سیاسی
فضا بالکل سازگار نہ تھی۔ لیکن وہ اس طوفان میں بھی اپنے موقف پر جمے رہے اس تغیر پذیر
دنیا میں اکثر مخلص، نیک نیت اور صاحب عزیمت انسانوں کا یہی انجام ہوتا ہے لیکن
ان کے خلوص، نیک نیتی اور عزیمت کی داستانیں دلوں پر نقش اور ذہنوں میں محفوظ رہتی ہیں

ہم شکرگزار ہیں ان تمام مضمون نگاروں کے جنھوں نے ہماری درخواست پر اس خصوصی نمبر
کے لیے زحمت اٹھائی اور مضمون لکھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ان تمام حضرات کا کرم اور قلمی تعاون
ہمیں حاصل نہ ہوتا تو اتنا ضخیم نمبر ہم نہ نکال سکتے، ہم ان کے بھی ممنون ہیں جنھوں نے اس خاص
شمارہ کے لیے انگریزی کے مضامین کا ترجمہ کیا۔ آپ محسوس کریں گے کہ ان ترجموں سے شمارہ کی
افادیت بڑھ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام ارباب قلم کو جزائے خیر دے۔

عبداللطیف اعظمی

تعارف و تبصرہ

مولانا محمد علی پر چند کتابیں اور خصوصی شمارے

مولانا محمد علی مرحوم کی شخصیت اور خدمات پر اور انھیں ہندوستان کی تحریک آزادی، مسلم عالمی سیاست اور اردو صحافت و شاعری میں جو ممتاز اور منفرد مقام حاصل تھا، اس کے بارے میں قارئین جامعہ اس خصوصی شمارے کے پچھلے صفحات میں ان کے عقیدت مندوں، مخلصوں، ناقدوں اور دانشوروں کی رائیں، تاثرات اور خیالات ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے غالباً یہ مجموعی تاثر بھی قائم ہوا ہوگا کہ اس مجاہد آزادی کے ایثار و خلوص کی جس طرح قدر و عزت ہونی چاہیے تھی نہیں ہوئی اور ان کی سیاسی بصیرت اور ملکی خدمات کا جیسا اعتراف کرنا چاہیے تھا نہیں کیا گیا، نہ جس بسط و تفصیل اور تحقیق کے ساتھ ان کے بارے میں لکھنا چاہیے تھا نہیں لکھا گیا۔ ویسے تو ایک قومی رہنما کے ناطے سے ان کے تعلقات سبھی ہندوستانیوں سے تھے اور یہ ذمہ داری سبھی پر عائد ہوتی ہے، مگر مسلم یونیورسٹی سے ایک ممتاز اور قابل فخر اولڈ بائے کی حیثیت سے، جامعہ ملیہ سے اس کے بانی اور پہلے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے، دارالمصنفین سے اس کے بانی علامہ شبلی سے شاگردی اور اس کے پہلے ناظم مولانا سید سلیمان ندوی سے استاد بھائی کی حیثیت اور مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم سے عقیدت اور نیازمندی کا جو خصوصی تعلق تھا، اس کی بنا پر علی گڑھ کے علاوہ یہ خوشی اور فخر کی بات ہے کہ دونوں اداروں اور مولانا دریابادی نے مرحوم کی یاد کو تازہ رکھنے اور ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے کی مناسب طور پر کوشش کی ہے۔ مولانا کی وفات پر ماہنامہ جامعہ، معارف اور ہفتہ وار سچ نے مرحوم کی شخصیت اور خدمات پر مضامین اور نظمیں شائع کیں، مکتبہ جامعہ نے سب سے پہلے مرحوم کی سیرت و شخصیت پر ایک مفصل سوانح حیات شائع کی جسے جامعہ ملیہ کے ایک ہونہار

"طالب علم" مولوی رئیس احمد جعفری ندوی نے لکھی تھی، بعد میں انھوں نے مولانا کے مضامین، تقاریر اور خطبات کے متعدد مجموعے مرتب کرکے جامعہ سے طالب علمانہ اور مولانا محمد علی سے نیازمندانہ اور عقیدت مندانہ حق کا اظہار کیا۔ اسی طرح ایک اور جامعی ـــــ رئیس صاحب سے کہیں سینئر اور جامعہ کے سابق پروفیسر اور راقم الحروف کے استاد جناب محمد سرور صاحب نے متعدد کتابیں لکھیں اور مرتب کیں، مضامین محمد علی (دو حصے)، خطوط محمد علی، مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر اور مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ دارالمصنفین نے بھی مولانا پر بیش قدر کتابیں شائع کی ہیں جن کی تفصیل آگے آئے گی۔ مولانا دریا آبادی نے جس خلوص اور عقیدت مندی سے مولانا مرحوم کے تعلق کو تادم حیات نبھایا وہ اپنی آپ مثال ہے۔ مولانا دریا آبادی کی وفات کے بعد ایک تعزیتی جلسے میں ایک فاضل مقرر نے فرمایا تھا کہ مولانا کی پسند اور ناپسند میں انتہا پسندی اور بڑا تلون تھا، مگر مولانا محمد علی کے بارے میں مولانا نے بڑی استقامت کا ثبوت دیا، برصغیر ہند و پاک کے علما اور دانش وروں میں وہ تنہا شخص تھے جنھیں زیادہ سے زیادہ مدت تک مولانا کی انتہائی قربت کی سعادت حاصل تھی اور وہ صحیح معنوں میں جلوت و خلوت کے رازداں اور واقف کار تھے اور انھوں نے اپنی اس واقفیت کو اچھے انداز میں نئی نسل تک پہنچایا تھا جو کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے قابل قدر اور قابل تعریف ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد ان کتابوں اور رسالوں کے خصوصی شماروں کے مختصر تعارف ملاحظہ ہوں جو مولانا محمد علی یا ان کے عہد کی سیاست کے بارے میں ہیں اور جو تبصرے کے لیے موصول ہوئے ہیں

لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی از ڈاکٹر افضل اقبال

سائز $\frac{22 \times 18}{8}$، حجم ۴۴۳ صفحات، مجلد مع گردپوش، قیمت ۴۵ روپے۔ سنہ طباعت ۱۹۷۴ء

ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، کلب روڈ، لاہور (پاکستان)

زیر تبصرہ کتاب، پیش لفظ اور انڈکس وغیرہ کے علاوہ پندرہ ابواب پر مشتمل ہے جس کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(۱) وکٹوریہ ہندوستان میں مسلم ذہن (۱۸۷۸-۱۹۰۲) (۲) کار منصبی کی تلاش میں (۱۹۰۲-۱۹۱۰)
(۳) سیاست میں شرکت (۱۹۱۱-۱۹۱۳) (۴) کھلی جنگ (۱۹۱۳-۱۹۱۵) (۵) نظربندی اور قید ۱۹۱۵-۱۹۱۹ء (۶) ترکی پر حملہ ہندوستان میں اس کا ردعمل (۱۹۱۵-۱۹۱۹) (۷) تحریک خلافت اور یورپ کو وفد کی روانگی (۱۹۱۹-۱۹۲۰) (۸) ہندوستان میں خلافت کی سورسنس (۱۹۲۰ء) (۹) غیر متشدد عدم تعاون (۱۹۲۱) (۱۰) تحریک ترک موالات اور ناکامی (۱۹۲۲) (۱۱) رہائی اور کانگریس کی صدارت (۱۹۲۳-۲۴) (۱۲) کانگریس سے دوری، شبہات اور اختلاف (۱۹۲۵-۲۶) (۱۳) دستوروں کا انبار (۱۹۲۷-۲۹) (۱۴) زندگی کا آخری سال (۱۹۳۰-۳۱) (۱۵) ایک جائزہ۔

ابواب کے عنوانات سے اس کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ زیر تبصرہ کتاب بنیادی طور پر سیاسی سوانح عمری ہے اور اس لحاظ سے، اب تک مولانا مرحوم پر اردو انگریزی میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں، تبصرہ نگار کے علم کے مطابق یہ سب سے زیادہ مفصل، مکمل اور بہتر ہے، خاص طور پر تاریخوں کا بہت لحاظ رکھا گیا ہے اور واقعی مصنف نے بڑی محنت اور تجسس سے کام لیا ہے۔ کتاب کے آخری حصوں میں اہم واقعات کی تاریخیں بھی دی گئی ہیں، ان کو غور سے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شاید مصنف نے اسے مرتب نہیں کیا ہے، کیونکہ اس میں متعدد غلطیاں ہیں اور اندرونی کتاب میں یہ صحیح ہیں، مثلاً مولانا کے والد کی وفات کا مہینہ ان تاریخوں میں صفحہ ۱۷ پر اکتوبر لکھا ہے اور اندرونی کتاب میں صفحہ ۲ پر اگست درج ہے یا صفحہ ۲۰۴ پر کل ہند خلافت کانفرنس کی تاریخ جون ۱۹۲۱ء چھپی ہے اور صفحہ ۲۷ پر جولائی ۱۹۲۱ء ہے جو صحیح ہے، اسی طرح ہمدرد ثانی کے بند ہونے کی تاریخ ۴۱۲ پر ۲ مئی ۱۹۲۷ء ہے اور صفحہ ۳۷۵ پر اپریل ۱۹۲۹ء ہے جو درست ہے۔ اس غلطی کی وجہ سے جو لوگ محض ان "اہم تاریخوں" پر بھروسہ کریں گے وہ غلطی کے شکار ہو جائیں گے اس لیے اس کی جس قدر جلد تصحیح ہو جائے بہتر ہے۔ ویسے، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اپنے موضوع پر یہ کتاب بہت اچھی اور قابل تعریف ہے اور مصنف اور ناشر دونوں قابل مبارکباد ہیں۔

محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق از مولانا عبدالماجد دریاآبادی

ناشر ... سائز $\frac{20 \times 26}{8}$، حصہ اول حجم ۲۰۴ صفحات، غیر مجلد، سنہ طباعت ۱۹۵۴ء حصہ دوم حجم ۳۰۸ × ۸ = ۲۱۶ - سنہ طباعت ۱۹۵۶ء - ان کی کتابوں میں، حصہ اول پر ساڑھے چھ

دے اور حصہ دوم پر پانچ روپے درج ہے، اگر یہ ۲۰-۲۵ سال پہلے کی قیمتیں ہیں، آج بازار میں یہ کتابیں دگنی ڈھائی گنی قیمت پر ملتی ہیں۔ ناشر: دارالمصنفین شبلی منزل۔ اعظم گڈھ (یو پی) -۲۷۶۰۰۱

[illegible]ے جامعہ کے اس خصوصی شمارے کا غور سے مطالعہ کیا ہوگا یا جس نے بھی مولانا محمد علی پر کچھ کام [illegible] ہوگا، اسے یقیناً اندازہ ہوگا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی یہ کتاب اپنے موضوع پر کس قدر اہم اور مفید ہے۔ فاضل مصنف مولانا محمد علی سے عمر میں تقریباً ۱۴ سال چھوٹے تھے، مگر کوئی ۱۸ سال تک — ۱۹۱۲ء تا ۱۹۳۰ء، ایسا گہرا اور بے تکلفانہ تعلق رہا ہے کہ اگر خلوت و جلوت کا انھیں واقف کار اور راز دار کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا، اس لیے ان دونوں حصوں میں مولانا محمد علی کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ براہ راست معلومات اور ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے اور یقیناً اس کتاب کی حیثیت ایک حد تک دستاویزی ہے اور مولانا محمد علی پر کوئی کام کرنے والا اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

مولانا محمد علی کی یاد میں — از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

سائز ۲۰×۲۶/۸، حجم ۲۷۸ صفحات، غیر مجلد، قیمت درج نہیں، سنہ طباعت ۱۹۷۷ء۔ ناشر: دارالمصنفین۔ شبلی منزل۔ اعظم گڈھ (یو پی)۔ ۲۷۶۰۱

اس کتاب کے مرتب یا مولف جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب دارالمصنفین کے ناظم اور درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں اور مولانا محمد علی کے پرستاروں میں سے ہیں، اور مرحوم کی کمزوریوں کو تسلیم کرتے ہوئے بھی، ان پر اعتراض کو پسند نہیں کرتے۔ ایک کتاب کی تالیف کے سلسلے میں موصوف نے لکھا ہے کہ: "ایک روز ان [مولانا محمد علی] پر ایک مختصر مضمون لکھنے بیٹھا تو کچھ ایسا خمار چھا گیا کہ یہ مختصر مضمون ۲۷۸ صفحے پر ختم ہوا۔" (دیباچہ صفحہ ۲) مجھ سے زبانی موصوف نے فرمایا تھا کہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی انگریزی کتاب "انڈین مسلمس" شائع ہوئی تو مولانا محمد علی کے متعلق ان کے آخری جملے سے متاثر ہو کر یہ مضمون لکھنے بیٹھا تھا۔ مجیب صاحب کے اس مضمون کا ترجمہ اس شمارے میں شامل ہے اور آخری جملے کا ترجمہ یوں ہے: "... اس موقع پر برطانوی حکومت سے ان کی یہ اپیل کہ وہ ہندوستان کو آزادی دے، ورنہ وہ ایک غلام ملک کو زندہ واپس نہیں ہوں گے، ایک اذیت ناک شکست کا اعتراف تھی۔" تبصرہ نگار کو ذاتی طور پر خوشی ہے کہ مجیب صاحب کا یہ جملہ ایک کتاب کی تصنیف کا

باعث ہوا۔ اگرچہ فاضل مصنف نے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ: "یہ کتاب مولانا کی زندگی کی کوئی مکمل سوانح عمری نہ سمجھی جائے بلکہ میں صدسالہ تقریب پر ان کو جو خراجِ عقیدت و تحسین پیش کر سکتا تھا، اس کا ایک ہلکا سا پرتو اس کو سمجھا جائے۔" مگر بہرحال یہ کتاب مولانا محمد علی کی کتابوں میں ایک مفید اضافہ ہے اور ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

مکتوباتِ رئیس الاحرار (سیاسی) مرتبہ۔ ابو سلمان شاہجہاں پوری

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۱۹ صفحات، مجلد، قیمت ۲۸ روپے۔ تاریخ طباعت ۱۰ر دسمبر ۱۹۷۸ء

ناشر: موڈرن پبلشرز۔ ۸۶ گول ایرپس مارکیٹ۔ کراچی (پاکستان)

مولانا محمد علی مرحوم کے جشن ولادت کا آغاز پچھلے سال ۱۰ر دسمبر کو برصغیر ہند و پاک میں کیا گیا تھا، اسی موقع پر زیر تبصرہ کتاب کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ اس سے پہلے مولانا کے خطوط کا صرف ایک ہی مجموعہ شائع ہوا ہے جسے جامعہ کے ایک قدیم طالب علم پروفیسر محمد سرور صاحب نے جو اس وقت جامعہ میں استاد تھے، مرتب کیا تھا اور مکتبہ جامعہ دہلی سے اکتوبر ۱۹۴۰ء میں "خطوط محمد علی" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ پروفیسر محمد سرور صاحب ہی نے ایک اور کتاب مرتب کی تھی جو دسمبر ۱۹۴۱ء میں لاہور سے "مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر" کے نام سے شائع ہوئی جس میں ایسے متعدد خطوط شامل ہیں جو خطوط محمد علی میں نہیں ہیں۔ اس کی اشاعت کے چند سال کے بعد اواخر ۱۹۴۴ء میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم نے "مشاہیر خطوط" کے نام سے ان خطوط کا ایک مجموعہ شائع کیا جو ان کے نام لکھے گئے تھے، ان میں مولانا محمد علی مرحوم کے وہ خطوط بھی شامل ہیں جو "خطوط محمد علی" میں شائع ہو چکے تھے۔ اب مولانا محمد علی کے ۳۹ خطوط کا یہ دوسرا مجموعہ شائع ہوا ہے جس کے بارے میں اس کے فاضل مرتب، مولانا ابو سلمان شاہجہاں پوری نے لکھا ہے کہ: "صرف مکاتیب جمع کر کے چھاپ دینا ہی مقصد نہیں رہا بلکہ متن کی صحت کا اہتمام بھی کیا ہے اور محل بیانات و اشارات کی وضاحت بھی کی ہے اور جن مسائل کے تمام پہلو آج قاری کے لیے معلوم اور روشن نہیں ہیں، ان پر ضروری حواشی اور آخر میں تمام خطوط کی شخصیات پر نوٹس بھی شامل کئے ہیں۔ ان شخصیات کے سوانحی نقوش اجاگر کرنے کے ساتھ ان کے افکار اور سیرت کے خصائص اور مولانا محمد علی سے

ان کے حلقات پر روشنی ڈالی ہے۔" (صفحہ ۱۰)

اس میں شبہ نہیں کہ ان خطوط کی تلاش و جستجو اور ترتیب میں کافی محنت کی گئی ہے، خاص طور مجموعے کا مبسوط مقدمہ اور "تذکرۂ رجال" بہت مفید اور قابل تعریف ہیں، مگر ان خوبیوں کے باوجود خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً جو خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں ان کے حوالے نہیں دیے گئے ہیں کہ کہاں سے لیے گئے ہیں، بہت سے خطوط انگریزی سے ترجمہ ہیں، اس کی وضاحت کر دی جانی چاہیے تھی خاص طور پر اس لیے کہ ان خطوط میں زبان و بیان کی جو خامیاں ہیں بہت سے ناواقف انھیں مترجم کے بجائے مولانا محمد علی کی سمجھ لیں گے۔ تذکرۂ "رجال" میں ایک خاتون کے نام "سروپ" کو مسز وجے لکشمی پنڈت کے کنوارپنے کا نام لکھا گیا ہے، حالانکہ "سروپ رانی" پنڈت جواہر لال نہرو کی والدہ کا نام تھا نوٹ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "علی برادران نے انھیں ہر جگہ سروپ بہن یا سروپ آپا لکھا ہے۔" ہم اسی سے فاضل مرتب کو سمجھنا چاہیے تھا کہ علی برادران وجے لکشمی کو آپا یا بہن کیسے کہہ سکتے تھے جب کہ علی برادران ان سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ مسز پنڈت کی تاریخ پیدائش ۱۸ اگست ...ء ہے، اس لحاظ سے مولانا محمد علی سے تقریباً ۲۲ سال اور مولانا شوکت علی سے کوئی ۲۸-۲۹ سال چھوٹی ہیں۔

ان معمولی فروگذاشتوں سے قطع نظر، اس کتاب کی اشاعت سے مولانا محمد علی سے متعلق جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں اور اردو کے مکتوباتی ادب میں مفید اضافہ ہوا ہے۔

تحریک خلافت　　از قاضی محمد عدیل عباسی

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۷۹ صفحات، غیر مجلد، قیمت ۱۲ روپے۔ سنہ طباعت: ۱۹۷۰ء۔
ناشر ترقی اردو بورڈ، وزارت تعلیم اور سماجی بہبود حکومت ہند۔ نئی دہلی۔

ہندوستان کی تاریخ آزادی میں تحریک خلافت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، مگر افسوس کہ اس پر کوئی مفصل اور مبسوط کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ ہمیں خوشی ہے کہ ترقی اردو بورڈ نے زیر تبصرہ کتاب شائع کر کے ملک و قوم کی بڑی مفید خدمت کی ہے اور اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ کیا ہے اس کتاب کے فاضل مصنف قاضی محمد عدیل عباسی صاحب ہیں، جو نہ صرف یہ کہ ایک اچھے صحافت نگار

باعث ہوا۔ اگرچہ فاضل مصنف نے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ: "یہ کتاب مولانا کی زندگی کی کوئی مکمل سوانح عمری نہ سمجھی جائے بلکہ میں جذباتی طور پر ان کو جو خراجِ عقیدت و تحسین پیش کر سکتا تھا، اس کا ایک ہلکا سا پرتو اس کو سمجھا جائے۔" مگر بہر حال یہ کتاب مولانا محمد علی کی کتابوں میں ایک مفید اضافہ [illegible] ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

مکتوباتِ رئیس الاحرار (سیاسی) مرتبہ: ابو سلمان شاہجہاں پوری

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۳۱۹ صفحات، مجلد، قیمت: ۳۸ روپے۔ تاریخ طباعت ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء

ناشر: موڈرن پبلشرز۔ ۸۶ گول ایمپریس مارکیٹ۔ کراچی (پاکستان)

مولانا محمد علی مرحوم کے جشن ولادت کا آغاز پچھلے سال ۱۰ دسمبر کو برصغیر ہندو پاک میں کیا گیا تھا، اسی موقع پر زیر تبصرہ کتاب کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ اس سے پہلے مولانا کے خطوط کا صرف ایک ہی مجموعہ شائع ہوا ہے جسے جامعہ کے ایک قدیم طالب علم پروفیسر محمد سرور صاحب نے جو اس وقت جامعہ میں استاد تھے، مرتب کیا تھا اور مکتبہ جامعہ دہلی سے اکتوبر ۱۹۴۰ء میں "خطوط محمد علی" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ پروفیسر محمد سرور صاحب ہی نے ایک اور کتاب مرتب کی تھی جو دسمبر ۱۹۴۱ء میں لاہور سے "مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر" کے نام سے شائع ہوئی جس میں ایسے متعدد خطوط شامل ہیں جو خطوط محمد علی میں نہیں ہیں۔ اس کی اشاعت کے چند سال کے بعد اواخر ۱۹۴۴ء میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم نے "مشاہیر خطوط" کے نام سے ان خطوط کا ایک مجموعہ شائع کیا جو ان کے نام لکھے گئے تھے، ان میں مولانا محمد علی مرحوم کے وہ خطوط بھی شامل ہیں جو "خطوط محمد علی" میں شائع ہو چکے تھے۔ اب مولانا محمد علی کے ۹۳ خطوط کا یہ دوسرا مجموعہ شائع ہوا ہے جس کے بارے میں اس کے فاضل مرتب، مولانا ابو سلمان شاہجہاں پوری نے لکھا ہے کہ: "صرف مکاتیب جمع کر کے چھاپ دینا ہی مقصد نہیں رہا بلکہ متن کی صحت کا اہتمام بھی کیا ہے اور مبہم بیانات و اشارات کی وضاحت بھی کی ہے اور جن مسائل کے تمام پہلو آج قاری کے لیے معلوم اور روشن نہیں ہیں، ان پر ضروری حواشی اور آخر میں تمام خطوط کی شخصیات پر نوٹس بھی شامل کئے ہیں۔ ان شخصیات کے سوانحی نقوش اجاگر کرنے کے ساتھ ان کے افکار اور سیرت کے خصائص اور مولانا محمد علی سے

ان کے حلقات پر روشنی ڈالی ہے۔" (صفحہ ۱۰)

اس میں شبہ نہیں کہ ان خطوط کی تلاش و جستجو اور ترتیب میں کافی محنت کی گئی ہے، خاص طور مجموعے کا مبسوط مقدمہ اور "تذکرۂ رجال" بہت مفید اور قابل تعریف ہیں، مگر ان خوبیوں کے پہلو بہ پہلو خامیاں بھی نظر آتی ہیں مثلاً جو خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں ان کے حوالے نہیں دے گئے ہیں کہ کہاں سے لیے گئے ہیں، بہت سے خطوط انگریزی سے ترجمہ ہیں، اس کی وضاحت کر دی جانی چاہیے تھی خاص طور پر اس لیے کہ ان خطوط میں زبان و بیان کی جو خامیاں ہیں بہت سے ناواقف انھیں مترجم کے بجائے مولانا محمد علی کی سمجھ لیں گے۔ تذکرۂ "رجال" میں ایک خاتون کے نام "سروپ" کو مسز وجے لکشمی پنڈت کے کنوارپنے کا نام لکھا گیا ہے، حالانکہ "سروپ رانی" پنڈت جواہر لال نہرو کی والدہ کا نام تھا۔ نوٹ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "علی برادران نے اغلباً ہر جگہ سروپ نہیں نامسروپ آیا لکھا ہے۔" ہم اسی سے فاضل مرتب کو سمجھنا چاہیے تھا کہ علی برادران وجے لکشمی کو آپا یا نہیں کیسے کہہ سکتے جب کہ علی برادران ان سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ مسز پنڈت کی تاریخ پیدائش ۱۸ر اگست ۱۹۰۰ء ہے، اس لحاظ سے مولانا محمد علی سے تقریباً ۲۲ سال اور مولانا شوکت علی سے کوئی ۲۸-۲۹ سال چھوٹی ہیں۔

ان معمولی فروگذاشتوں سے قطع نظر، اس کتاب کی اشاعت سے مولانا محمد علی سے متعلق جو نامے شائع ہوئے ہیں، ان میں اور اردو کے مکتوباتی ادب میں مفید اضافہ ہوا ہے۔

تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۷۹ صفحات، غیر مجلد، قیمت ۱۲ روپے۔ سنہ طباعت ۱۹۷۰ء۔
ناشر ترقی اردو بورڈ، وزارت تعلیم اور سماجی بہبود حکومت ہند۔ نئی دہلی۔

ہندوستان کی تاریخ آزادی میں تحریک خلافت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، مگر افسوس کہ اس پر کوئی مفصل اور مبسوط کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ ہمیں خوشی ہے کہ ترقی اردو بورڈ نے زیر تبصرہ کتاب شائع کر کے ملک و قوم کی بڑی مفید خدمت کی ہے اور اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ کیا ہے اس کتاب کے فاضل مصنف قاضی محمد عدیل عباسی صاحب ہیں، جو نہ صرف یہ کہ ایک اچھے صحافت نگار

دراندیب ہیں بلکہ تحریک خلافت میں شریک رہے ہیں، اس لیے اس کتاب کے لیے آج کل ان سے بہتر کوئی مصنف نہیں مل سکتا تھا۔

یہ کتاب پیش لفظ اور دیباچہ کے علاوہ تیرہ ابواب پر مشتمل ہے اور نہ صرف یہ کہ تحریک خلافت کے تمام پہلو زیر بحث آگئے ہیں بلکہ بڑی حد تک تحریک آزادی کے بہت اہم گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اس کتاب کی تالیف میں جو مشکلات پیش آئی ہیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مولف نے لکھا ہے کہ "تحریک خلافت پر قلم اٹھانے کے معنی یہ تھے کہ عصر قدیم کی رسائیوں اور عصر جدید کے طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی تابانیوں کا مطالعہ کیا جائے۔ ستی جیسے دور افتادہ مقام پر اس کے لیے نہ کتابیں میسر تھیں اور نہ اخبارات اور نہ میرے پاس اتنا وقت تھا کہ تلاش میں سفر کروں، اس لیے جو کچھ میسر ہو سکا اسی پر اکتفا کرنی پڑی" یہ عذر اپنی جگہ پر اہم اور قابل معافی ہے مگر اس کی وجہ سے کتاب میں جو اثرات ظاہر ہوئے ہیں یا جو خامیاں نظر آتی ہیں ان کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ مثلاً "خلافت کمیٹی" کے ذیلی عنوان سے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "خلافت کمیٹی کب اور کیسے قائم ہوئی اس کا سراغ لگانے اور محقق طور پر جاننے کے لیے میں نے بڑی کوشش کی لیکن مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ میں کامیاب نہیں ہوا۔" (صفحہ ۳۸) اس ناکامی کی واحد وجہ یہ ہے کہ بستی کے وسائل بیحد محدود تھے اور فاضل مولف کو دوسرے کتب خانوں سے استفادہ کرنے کے لیے وقت نہیں تھا، ورنہ خلافت کمیٹی کے قیام کی صحیح تاریخ اور دوسری تفصیلات معلوم کرنا مشکل نہیں ہے۔ تبصرے کے محدود صفحات کسی طویل بحث کے متحمل نہیں ہو سکتے، ورنہ اس وقت جس قدر کتابیں میری میز پر موجود ہیں، ان ہی سے اس سوال کو اطمینان بخش طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔

محترم عباسی صاحب نے دیباچے میں یہ شکایت کی ہے "جہاں تک تحریک خلافت کی تاریخ کا سوال ہے، دیکھا گیا ہے کہ اکثر مصنفین و مورخین اس پر سرسری گزر گئے، اور جس نے کچھ لکھا بھی تو تاریخ تو کجا سنہ تک موجود نہیں۔" یہ عیب خود اس کتاب میں بھی ہے یہی نہیں بلکہ بسا اوقات الفاظ کے استعمال اور واقعات کے بیان میں بھی پوری احتیاط برتی نہیں گئی ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"مولانا محمد علی کی گرفتاری نے ملک میں ایک ہیجان برپا کر رکھا تھا اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ تار وائسرائے اور وزیر ہند کو بھیجے گئے جن (؟) میں نظربندی منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

اس کا انجام اگر کچھ ہوا تو صرف یہ کہ ایک افسر ایک تحریر لے کر آیا اور مولانا محمد علی اور مولانا

شوکت علی (جو ایک ساتھ نظر بند تھے) یہ کہا کہ آپ اس پر دستخط کر دیں تو رہا کر دئے جائیں۔ یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ علی برادران کی والدہ جو بعد کو "بی اماں" کے نام سے مشہور ہوئیں، نکل کر آ گئیں کہ ہمارے لڑکے کبھی حکومت سے باغی نہ تھے لیکن اسلامی فریضہ اولیت رکھتا ہے اور اگر وہ اس لا شرط معاہدے پر دستخط کر دیں گے تو اللہ تعالیٰ میرے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں میں طاقت دے گا کہ میں ان دونوں کا گلا گھونٹ دوں۔" (صفحہ ۱۷)

اس اقتباس کے خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے۔ کہیں "گرفتاری" ہے، کہیں "نظر بندی"۔ مولانا محمد علی کو ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء کو نظر بندی کا حکم ملا اور دراواخر دسمبر ۱۹۱۹ء میں رہائی ملی۔ ۱۹۲۱ء میں ۱۴ ستمبر کو مولانا گرفتار ہوئے اور مقدمے کے بعد دو سال کی سزا ہوئی۔ عباسی صاحب کے اقتباس میں نہ کوئی تاریخ ہے اور نہ ہی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ نظر بندی کی بات کر رہے ہیں یا گرفتاری اور سزا کی؟ بظاہر ۱۹۲۱ء گرفتاری اور سزا کے بارے میں ہے۔ ایسی صورت میں یہ لکھنا صحیح نہیں ہے کہ "علی برادران کی والدہ بعد کو "بی اماں" کے نام سے مشہور ہوئیں" کیونکہ اس سے بہت پہلے وہ اس نام سے مشہور ہو چکی تھیں، اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ "نکل کر آ گئیں" کیونکہ رہائی کی شرائط جیل میں پیش کی گئی تھیں، وہاں "نکل کر" کہاں؟ ایسی ہی کچھ خامیاں اور بھی ہیں۔

ان معمولی خامیوں سے قطع نظر کتاب قابل مطالعہ ہے۔ امید ہے کہ ہر حلقے میں پسند کی جائے گی۔

علی برادران اور ان کا کارنامہ — سید محمد ہادی

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۲۸ صفحات، مجلد، قیمت: ساڑھے پندرہ روپے، تاریخ اشاعت دسمبر ۱۹۷۸ء۔ ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

مکتبہ جامعہ نے مولانا محمد علی مرحوم کی سیرت و شخصیت پر سب سے پہلے مفصل کتاب شائع کی تھی، اس کے بعد مولانا کے خطوط اور مضامین کے مجموعے شائع کئے، زیر تبصرہ کتاب اس سلسلے کی تازہ ترین کتاب ہے، امید ہے کہ مکتبہ مولانا پر اور کتابیں شائع کرے گا۔

پیش نظر کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے ایک ایسے صاحب نے لکھا ہے جو نہ صرف یہ کہ مولانا کے مخلص عقیدت مندوں میں سے ہیں بلکہ ان کی خدمت میں ایک عرصے تک رہے ہیں

اور ان کی جلوت و خلوت کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ اس لیے پوری کتاب چشم دید واقعات پر مبنی ہے۔ البتہ اسلوب اور انداز بیان پر ذاتی پسند و ناپسند اور عقیدت مندی کا غلبہ ہے، بلکہ کی شکایت شاید اس لیے کرنا مناسب نہ ہوگا کہ اردو کے مصنفین بالعموم اب تک اپنی تحریروں میں معروضیت پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ مجھے اس کتاب میں علی برادران کے بہت سے کارنامے نظر آئے۔ اس لیے کتاب کے نام میں "کارنامہ" کے بجائے "کارنامے" ہوتا تو میرے خیال میں بہتر تھا

ماہنامہ آجکل ـ مولانا محمد علی نمبر اڈیٹر، شہباز حسین

سب اڈیٹر، نند کشور وکرم

پتہ، پبلکیشنز ڈویژن ـ پٹیالہ ہاؤس ـ نئی دہلی ـ ۱۱۰۰۰۱

مولانا محمد علی کے صد سالہ جشن ولادت کی خوشی کے موقع پر یہ خصوصی نمبر شائع کیا گیا ہے، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حجم کے اختصار کے باوجود یہ نمبر بہت اچھا اور کامیاب ہے اور سبھی مضامین قابل مطالعہ ہیں، سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بہت سی تصاویر شامل ہیں اور بعض بہت ہی اہم ہیں۔ ہم ادارہ "آجکل" کو اس کی اس کامیاب پیش کش پر مبارکباد دیتے ہیں

قیمت صرف ایک روپیہ

ہفتہ وار ہماری زبان ـ مولانا محمد علی نمبر اڈیٹر ڈاکٹر خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند) کے ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" کا یہ خصوصی شمارہ ہے جو مولانا محمد علی کے جشن صد سالہ کی تقریب کے موقع پر شائع کیا گیا ہے، اس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں (مرحوم) محمد عتیق صدیقی، عبد اللطیف اعظمی، بشیر علی خاں شکیب، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ظہیر علی صدیقی کے مضامین ہیں۔ مولانا محمد علی پر کام کرنے والوں کے لیے یہ اچھا تحفہ ہے۔

پتہ: اردو گھر ـ راؤز ایونیو ـ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جامعہ

مولانا محمد علی نمبر حصہ دوم

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبد اللطیف اعظمی

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب
پروفیسر مسعود حسین
ڈاکٹر سلامت اللہ
ضیاء الحسن فاروقی

جلد ۷۷
جنوری و فروری ۱۹۸۰ء
شمارہ ۱، ۲

سالانہ چندہ
چھ روپے

اس شمارے کی قیمت
پانچ روپے

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

The Monthly Jamia
Jamia Nagar New Delhi 110025

طابع و ناشر۔ عبداللطیف اعظمی
مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶
ٹائیٹل: فائن پریس۔ دہلی

فہرست مضامین

شذرات

اپریل ۱۹۷۸ء میں ہم نے مولانا محمد علی نمبر شائع کیا تھا، تو اس کا گمان بھی نہ تھا کہ اس بطلِ حریت کی یاد میں ہم ایک اور نمبر ایک سال کے اندر اندر نکالیں گے۔ لیکن اکتوبر ۱۹۷۸ء کے اوائل میں جامعہ کے شعبۂ تاریخ کے اہتمام میں "مولانا محمد علی اور ہندوستانی سیاست" کے عنوان سے ایک سمینار منعقد ہوا جس میں مسلم اور غیر مسلم عالموں نے بڑے اچھے مقالے پڑھے اور مولانا محمد علی مرحوم کی شخصیت اور اس عہد کی ہندوستانی اور عالمی سیاست کے کئی نئے پہلو سامنے آئے۔ پھر برادر گرامی قدر جناب عبداللطیف اعظمی صاحب کی تلاش اور جستجو، کوششوں اور کاوشوں سے مولانا مرحوم کے سوانح حیات سے متعلق کئی مطبوعہ مضامین ایسے مل گئے جو عرصہ ہوا شائع ہوئے تھے لیکن آج کے پڑھنے والے ان سے تقریباً بالکل نا واقف ہیں اور ان میں بعض ایسی معلومات ہیں جو عام طور پر کتابوں میں نہیں ملتیں، اسی طرح بیگم محمد علی کے خطوط بھی اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان سے گول میز کانفرنس کے زمانے کی سرگرمیوں اور مولانا کی آخری علالت کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ خطوط "علی برادران" میں شائع ہوئے تھے جو آسانی سے ہندوستان میں دستیاب نہیں اور اب غالباً پاکستان میں بھی نایاب یا کمیاب ہے ـــــ اس لئے یہ طے کیا گیا کہ ایک اور مولانا محمد علی نمبر شائع کیا جائے جو ماہنامہ جامعہ، "محمد علی نمبر حصہ دوم" سے موسوم ہو اور اس طرح مولانا مرحوم پر لکھنے والوں کو رسالہ جامعہ کے ان دونوں حصوں سے کافی مواد مل جائے۔ امید ہے کہ ہماری یہ کوشش رائگاں نہ جائے گی اور عرصہ تک ہمارے دلوں کو اس مردِ مجاہد کی یاد سے گرماتی رہے گی۔

جس سمینار کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس میں خواجہ عبدالمجید مرحوم کے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے، علی گڑھ دور کے دوسرے شیخ الجامعہ تھے اور پھر عرصہ تک امیر جامعہ (چانسلر) رہے۔ بڑے صاحبزادے پروفیسر جمال خواجہ نے جو مقالہ پڑھا اُس میں مولانا محمد علی کے تصور کائنات سے بھی بحث تھی۔ مقالہ محنت سے لکھا گیا تھا اور عالمانہ تھا اور ہمیں ایک حد تک خواجہ صاحب سے اتفاق بھی ہے۔ خواجہ صاحب فلسفہ کے پروفیسر ہیں اور فکر کے اعتبار سے جدید طرز کے دانشور۔ انھوں نے سرسید، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی کی شخصیت اور کارناموں کا ایک دانشور کی حیثیت سے جائزہ پیش کیا اور ان کا تجزیہ اچھا تھا لیکن انھوں نے اس کا خیال نہیں رکھا کہ انیسویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں میں جو طرزِ فکر ابھرا تھا اُس کے دو پہلو تھے۔ ایک کے ترجمان سرسید تھے اور دوسرے کے علامہ شبلی اور مولانا حالی۔ اپنی تعلیم کے اعتبار سے مولانا محمد علی کو فکری طور پر سرسید کے حلقے میں ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ اثر میں آئے اُس رجحان کے جس کے ترجمان شبلی اور حالی تھے۔ سیاست اور مذہب دونوں میں انھوں نے سرسید کے تصورات سے بغاوت کی، ہم قطعیت کے ساتھ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سرسید کا تصور کائنات غیر اسلامی تھا، البتہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے انیسویں صدی کے مغرب کی عقلیت پسندی کی جس کے فکری پس منظر مشمولات اور مضمرات سے وہ براہِ راست اور پورے طور پر واقف بھی نہ تھے، بیجا طور پر مرعوبانہ پیروی کرکے اپنے مذہبی فکر کو ایک چیستاں بنادیا۔ مولانا محمد علی کو اپنے مذہبی افکار کو تفصیل اور تسلسل سے بیان کرنے کا موقع نہیں ملا، اس لیے محض اُن کی تقریروں اور کامریڈ اور ہمدرد میں اُن کی تحریروں کی بنیاد پر جن پر وقتی سیاست کی چھاپ ہے ان کے مذہبی فکر کو ترتیب نہیں دیا جاسکتا۔ علامہ اقبال اور مولانا آزاد سے متعلق یہ بات نہیں کہی جاسکتی اور ان دونوں کے تصور کائنات کو ہم سرسید سے مختلف پاتے ہیں، یعنی دونوں اپنی فکری خصوصیات کے باوجود، اُسی تصور کائنات کی ترجمانی کرتے ہوئے ملتے ہیں جو اوّل

سے آخر تک مجموعی طور پر راسخ العقیدگی کی روایت رہی ہے ہمارا خیال ہے کہ مولانا محمد علی بھی اسی تصورِ کائنات کے حامل تھے، ہاں، ان کے یہاں کبھی کبھی، بقول بعض حضرات کے جس میں ہمارے خواجہ صاحب بھی شامل ہیں، یہ جو "ملامتیت" یا کٹرپن ملتا ہے، اس میں ایک حد تک تو ان کی اپنی طبیعت اور مزاج کا دخل تھا اور ایک حد تک اس ماحول کا بھی جس میں وہ اپنی قوم پروری کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے کاز کے لیے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ مولانا محمد علی کی شخصیت کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک سچے قوم پرور بھی رہے اور راسخ العقیدہ مسلمان بھی:

بر کفے جامِ شریعت، بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

سمینار میں ایک ترقی پسند دانشور نے جو عقیدہ کے لحاظ سے اشتراکی ہیں، اپنے مقالے میں یہ شکایت کی کہ مولانا محمد علی نے اپنی تحریروں میں کہیں انقلاب روس (۱۹۱۷ء) کا ذکر نہیں کیا ہے، گویا انھوں نے تاریخ عالم کے اتنے بڑے واقعے کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ دوسری بات انھوں نے یہ کہی کہ مولانا کو کسانوں اور مزدوروں کی تحریکات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ بھلے ہی سے مولانا کی تحریروں میں انقلاب روس کا ذکر نہیں اور مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں سے متعلق بھی انھوں نے کچھ نہیں لکھا، لیکن یہ کہنا غالباً مناسب نہیں کہ انھیں ان واقعات سے دلچسپی نہ تھی یا انھوں نے انھیں کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں سمجھا۔ مولانا کانگرس کے صدر تھے اور جواہر لال نہرو سکریٹری، یہ ناممکن ہے کہ پنڈت جی کے خیالات سے مولانا کو واقفیت نہ ہو یا وہ سوشلزم اور انقلاب روس جیسے امور و واقعات کو غیر اہم سمجھتے ہوں۔ کانگرس کا جو سیاسی و اقتصادی پروگرام تھا، اس کے صدر کو اس سے کما حقہ، واقفیت رہی ہوگی اور وہ ان تحریکات سے بھی باخبر ہوگا جو ملک اور ملک سے باہر چل رہی ہوں گی۔ مولانا ایک

جید صحافی تھے اور ان کی نظر دنیا کے تمام واقعات اور مسائل پر رہتی تھی۔ اب اگر ان کی تحریروں میں کہیں انقلاب روس کا ذکر نہیں تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے اسے کبھی کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں سمجھا۔

مولانا محمد علی پر آئندہ بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ابھی ایسی بہت سی باتیں، خطوط، تحریریں اور دستاویزیں بھی سامنے آئیں گی جن سے مرحوم کی زندگی، شخصیت اور کارناموں پر مزید روشنی پڑے گی۔ کئی باتیں جو آج مولانا سے متعلق لوگ مانتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ کل کے شواہد کے پیشِ نظر ان میں کچھ کمی بیشی ہو جائے، لیکن ایک بات ایسی ہے جس پر ہمیشہ اتفاق رہے گا اور وہ یہ ہے کہ مولانا اربابِ عزیمت میں سے تھے، حق پرست تھے، جسے وہ حق سمجھتے تھے اُسے سردار بھی کہتے تھے، عقیدہ اور عمل کے خوشگوار امتزاج کے جس مقام پر وہ تھے وہاں ہمہ وقت دار و رسن ہی کی آزمائش رہتی تھی، اور یہ وہ مقام ہے جہاں پہونچ کر مردِ حق آگاہ اپنوں کو بھی خفا رکھتا ہے اور بیگانوں کو بھی ناخوش رکھتا ہے کہ وہ کسی کی خوشی کے لئے زہر کو قند یا قند کو زہر نہیں کہہ سکتا اُسے صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی مطلوب ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مولانا کے آخری دن ایسے گذرے کہ اُن سے نہ تو مسلمان خوش تھے اور نہ ہندو، حقیقت یہ ہے کہ وہ خود رضائے الٰہی کی طلب میں ساری دنیا سے خفا ہو گئے تھے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

مولانا شوکت علی مرحوم

مولانا محمد علی کی ابتدائی زندگی

(مولانا شوکت علی مرحوم (۱۸۷۳ - ۱۹۳۸) کا یہ مضمون روزنامہ خلافت (بمبئی) میں ۲۹ مارچ سے ۱۲ مئی ۱۹۳۲ء تک شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا "محمد علی کی زندگی کی کہانی، شوکت علی کی زبانی"۔ عنوان کے بعد ہر قسط میں حسب ذیل شعر شائع ہوتا تھا:

کہیں افسانۂ غم ڈرتے ڈرتے
سنایا کچھ کہیں سے، کچھ کہیں سے

اس مضمون کی دو خوبیاں ہیں، جن کی وجہ سے اسے یہاں شائع کیا جا رہا ہے، پہلی یہ کہ بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی کے بارے میں پوری بے تکلفی کے ساتھ لکھا ہے اور وہ باتیں بھی لکھ دی ہیں، جنھیں عموماً ایسی تحریروں میں نہیں لکھا جاتا جن کا مقصد اشاعت ہو۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض ایسی معلومات ہیں جن سے عام طور پر لوگ واقف نہیں ہیں۔ افسوس کہ یہ مفید سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور مزید افسوس اس کا ہے کہ دو قسطیں بارہ اور تیرہ ہمیں نہ مل سکیں۔ انھیں حاصل کرنے کی کوشش جاری ہے، اگر مل گئیں تو ان شاء اللہ انھیں بھی شائع کیا جائے گا۔ ہم جناب محمد طاہر فاروقی (کامپٹی) کے ممنون ہیں جن کی عنایت سے "خلافت" کے وہ شمارے ہمیں حاصل ہوئے جن میں یہ مفید مضمون شائع ہوا ہے۔)

میں مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھ کو ایک مفید مشورہ دیا اور اوس پر عمل کرنا شروع کرتا ہوں۔ جو کچھ تھوڑا بہت میں کر سکتا تھا وہ اسی قسم کے مشوروں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مجھ کو نہ علم کا دعویٰ ہے اور نہ انشاپردازی کا، جو کچھ کہتا ہوں یا لکھتا ہوں وہ دل کی چبھن کی وجہ سے اور غالباً اس وجہ سے دل سے نکلی ہوئی بات دل میں جگہ پیدا کرلیتی ہے۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں، حافظہ کے زور اور اول دن سے جو کچھ محمد علی کی نسبت مجھ کو یاد آتا ہے، اوسے سیدھے سادے الفاظ میں قلمبند کرتا ہوں۔ رونے یا یاد کرنے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ مرحوم جب کبھی مجھ سے ملتے تھے تو جو کچھ نئے واقعات ہم دونوں پر گذرتے تھے، ہم اون کو بیان کرتے تھے، چنانچہ ایک سفر کے بعد جب ملاقات ہوئی تو مجھ سے کہا: "شوکت! ایک لاجواب شعر سنا ہے، حضرت عاصی غازی پوری کا ہے، اور اوس سے زیادہ لطیف نعت میں کوئی شعر مشکل سے ہوگا، نہ کسی کا نام نہ کوئی ذکر، پھر بھی سب کچھ موجود ہے۔" مزہ لے لیکر اوس کو پڑھکر سنایا، خود بھی لطف اٹھایا اور مجھ کو بھی محظوظ کیا، شعر واقعی خوب تھا۔ ؎

صبا تو جا کے یہ کہیو مرے سلام کے بعد
تمھارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

اتفاقاً میں بھی اس کے بعد کسی دورے پر گیا اور کسی جگہ ایک ایسا شعر سنا کہ دل تڑپ گیا، اس کو محنت کرکے یاد کیا اور جب بھائی کی بھائی سے ملاقات ہوئی تو میں نے زور سے کہا کہ "تو نے کیا شعر سنایا تھا، لے میرا شعر بھی سُن لے" یہ تذکرہ یہاں اس وجہ سے کرتا ہوں کہ اوسی شعر پر میرا آج عمل درآمد ہے۔ مجھ کو کچھ نہیں کرنا آتا مگر ہاں محبت کرنا جانتا ہوں۔ مرحوم بھی بہت خوش ہوا تھا اور قبول کیا تھا کہ میرا شعر واقعی لاجواب ہے۔

نہ تیمم مجھے آتا نہ وضو آتا ہے
سجدہ کرلیتا ہوں جب سامنے تو آتا ہے

برادر عزیز مولانا عبدالماجد[1] کی ہدایت کے مطابق سب حالات لکھتا ہوں، اس وقت سے جبکہ میں پانچ برس کا تھا اور محمد علی نے دنیا میں قدم رکھا تھا۔

محمد علی ۹ دسمبر ۱۸۷۸ء کو پیدا ہوا

میری عمر پونے چھ برس کی تھی۔ موسم سردی کا تھا، مگر بہت زیادہ سردی نہ تھی، میں اپنے گھر میں کہیں سے کھیلتا ہوا آیا تھا۔ یہ مکان ہمارا قدیم تھا اور دادا اس میں رہتے تھے۔ چاروں طرف دالان تھا اور اوپر کوٹھے پر چار کمرے تھے اور ان کے ساتھ چھتوں پر دیگر تھے جس میں ہمارے دادا کی بہوئیں اور بیٹے رہتے تھے۔ نیچے دادی صاحبہ رہتی تھیں اور تمام گھر بھی نیچے تھا۔ یہ مکان میرے والد کے حصے میں آیا تھا اور اسی میں ہم سب بھائی بہن پیدا ہوئے تھے اور اسی میں بی اماں دلہن بن کر آئی تھیں۔ افسوس یہ مکان اب سب گر گیا ہے، زمین باقی ہے، جس پر خاندان کے بچے ہاکی کھیلتے ہیں۔ یہ زمین محمد علی کے حصے میں آئی تھی مگر اس پر مکان بنانا اس غریب کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ جب میں زنانے کے دروازے سے اندر داخل ہو کر صحن میں آیا اور باہر کے دالان میں گیا تو کسی نے مجھ کو خبر دی کہ میرے بھیا پیدا ہوا، اس خبر کو سن کر مجھ کو خوب یاد ہے کہ بچوں کی طرح ڈالوں کو ہاتھ سے گھوڑا بن کر دوڑتے ہیں، خوش خوش فوراً ننگے پیر صرف سفید کرتا پاجامہ پہنے باہر بھاگ گیا اور یہ خبر جا کر ساتھیوں کو سنائی کہ "میرے بھیا پیدا ہوا۔" یہ بات مجھ کو آج بھی ویسی یاد ہے جیسے کہ اس دن تھی۔ شام کا وقت تھا، جاڑوں کا موسم اور قریب عصر کے، بعد کو بی اماں سے اس قدر معلوم ہوا تھا کہ بقرعید کا مہینہ تھا۔ محمد علی نے بڑی تلاش سے پتہ لگایا تھا

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب ہی کے مشورے پر "سیرت محمد علی" کی تالیف کا کام مولوی رئیس احمد جعفری صاحب کے سپرد کیا گیا تھا جو اس وقت جامعہ میں زیر تعلیم تھے۔

کہ اس کی پیدائش کی تاریخ ۹ر دسمبر ۱۸۷۸ء تھی۔ جو لوگ جنتری سے پرانی تاریخیں نکال سکتے ہیں، اُن سے درخواست ہے کہ وہ مجھے مطلع کریں کہ آیا اس سال بقر عید یعنی عید الضحیٰ دسمبر میں ہوئی تھی؟ یہ ۱۸۷۸ء کی بات ہے[۲]۔ رام پور میں پیدا ہوا تھا اور افسوس مر اوطن سے دور لندن [میں] اور خدا لے مٹی دی حرم محترم بیت المقدس میں[۳]۔

ابتدائی تعلیم

ہم لوگ اپنے دادا کے خاندانی مکان میں رہتے تھے۔ جب محمد علی پیدا ہوا تھا۔ اس کی پیدائش کے دن اس وقت تک کہ اس پرانے مکان کو چھوڑ کر ہم اس نئے محل سرائے میں گئے جو بہت عالیشان ہمارے والد نے شوق سے بنوایا تھا اور نہایت سلیقہ اور خوبصورتی کے ساتھ آراستہ کیا تھا۔ ہمارے والد مرحوم عبد العلی خاں رام پور شہر میں اپنی خوش مذاقی، مہمان نوازی اور فیاضی کے لیے مشہور تھے۔ مجھے چہرہ اور باتیں تھوڑی تھوڑی یاد ہیں جو ان کے حالات کے سلسلے میں شائع ہوجائیں گے۔ بہترین کھانا پکانا مشہور رکابدار دا...

۲ھ۔ اس فرمائش کے جواب میں، خلافت پریس کے منصرم، منشی ممتاز علی آثر دہلوی کی طرف سے، روزنامہ خلافت مورخہ یکم اپریل ۱۹۳۲ء (جمعہ۔ ۲۴ر ذی قعدہ الحرام ۱۳۵۰ھ) میں شائع ہوا ہے کہ: "گزارش ہے کہ ۹ر دسمبر ۱۸۷۸ء تاریخ ولادت مولانا محمد علی مندرجہ ذیل تاریخوں سے منطبق ہوتی ہے۔

"۱۸۷۸ء مطابق ۱۴ر ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ روز دوشنبہ، ۱۵ر اگہن بکرمی"۔ اس تطابق سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی مرحوم و مغفور کی پیدائش عید الضحیٰ کے پانچ روز بعد، ولادت حضور سرور کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دن دوشنبہ کے روز ہوئی۔"

مولانا محمد علی نے ۱۷ر جون ۱۹۲۷ء کے "ہمدرد" کے اداریے میں "میری زندگی کے پچاس سال" ۱۵ر ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ — ۱۵ر ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ) کے عنوان کے تحت اپنی تاریخ پیدائش ۱۵ر ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ لکھی ہے، جس کی تاریخ عیسوی ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۸ء ہے اور اسی کے مطابق ہند و پاک میں مولانا کا صد سالہ یوم پیدائش منایا گیا ہے۔

۳ھ۔ قسط اول روزنامہ خلافت مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۹۳۲ء (جلد ۱۱ نمبر ۳۷) صفحہ ۲

سکھا تھا اور ایک رکابدار ہمیشہ نوکر رہتا تھا اور والد مرحوم کو کھانا پکانا سکھاتا تھا اور ان سے بی اماں بہترین کھانے، علاوہ معمولی کھانے کے پکا سکتی تھیں جو اپنی بیوگی کے زمانے میں ہم بچوں کو پکا پکا کر کھلاتی تھیں۔

اب جو سماں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ چبوترے کے قریب باہر کے دالان میں نصف اندر اور نصف باہر دو پلنگ پڑے تھے، ایک والد مرحوم کا جن کو ہم سب "میاں بھائی" کہتے تھے اور دوسرا بی اماں کا جن کو ہم سب بچے "بہو" کہتے تھے، اس وجہ سے کہ چونکہ ہمارے دادا کی سب چھوٹی بہو تھیں، سب بہو بہو کہہ کر پکارتے تھے اور ہم بھی بہو ہی کہتے تھے۔ "بی اماں" کا نام "بی امام" تو میرے بیٹوں اور خلافت کے کام کرنے والوں نے رکھا تھا۔ یہ نام حامیانِ خلافت اور عام مسلمانوں کی خواہش کے مطابق رکھا کہ انھوں نے ان کو اماں بنایا اور آج بھی عزت اور محبت کے ساتھ ان کا نام لیتے ہیں۔

غالباً موسم سخت جاڑوں کا نہ تھا مگر سخت گرمی کا بھی نہ تھا۔ ہم کب پرانے مکان سے نئے مکان میں آئے، مجھے ذرا بھی یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ ہم چبوترے کے نیچے صحن میں اپنی پالنے والی اماؤں کے پاس رہتے تھے، اوپر چبوترے پر ایک کونے میں بڑی اکلوتی بہن کا پلنگ تھا، جہاں وہ اپنی پالنے والی کے ہمراہ، جس کو ہم سب "میا" کہتے تھے اور اس کے نام کے ساتھ اس کو لگا کر پکارتے تھے۔

پیدائش کے بعد اب جو حافظہ یاد دلاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے والد محمد علی کو گود میں لیے پلنگ کی پائینتی کھڑے ہیں۔ اس وقت محمد علی کی عمر کیا تھی، میں نہیں کہہ سکتا، مگر انتقال کے وقت جو کہ ۲۴ اگست ۱۸۸۱ء کو ہوا تھا[1]، حساب لگا کر اب کہہ سکتا ہوں کہ دو سال سات مہینوں

---

[1] عام طور پر مولانا محمد علی کے سوانح نگاروں نے ان کے والد کا عیسوی سنہ وفات ۱۸۹۰ء لکھا ہے۔ ڈاکٹر افضل اقبال نے تاریخ وفات ۲۴ اگست ۱۸۸۰ء لکھی ہے۔ (لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی) اور مولانا محمد علی نے ہمدرد کے اداریہ "میری زندگی کے پچاس سال" میں اپنے والد کی وفات کی ہجری تاریخ ۱۷ رمضان المبارک ۱۲۹۷ھ لکھی ہے جس کی عیسوی تاریخ ۲۴ اگست ۱۸۸۰ء ہوتی ہے۔

کا تھا[۵]۔ والد کا انتقال، بی اماں کے حالات وغیرہ سب موقع پر آئیں گے۔ اب محمد علی حافظے کے پردے سے بھر دور ہو گیا۔ والد کے انتقال کا وقت بھی مجھے یاد نہیں آتا، ہاں اتنا معلوم ہے کہ ہم سب نے دوسری عورتوں کا دودھ پیا تھا، بی اماں یہ بھی کہتی تھیں کہ ہمارے والد سب سے محبت کرتے تھے مگر محمد علی سے سب سے زیادہ۔

اب پھر دماغ خالی ہے اور کچھ تھوڑی یاد جو آتی ہے، وہ یہ ہے کہ میرے منجھلے بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب جو اب احمدی ہو گئے ہیں اور جو اپنے چھوٹے بھائیوں کا بہت کچھ خیال کرتے ہیں، ان کو بھی سب سے زیادہ محمد علی سے محبت تھی، بلکہ ان کی [؟ کے] شاعرانہ اور شاعری کا محمد علی پر بہت کچھ اثر تھا۔ ہلکی سی تصویر مجھے نظر آتی ہے کہ محمد علی بھائی کے پاس بیٹھا ہے اور بی اماں نے کوئی عمدہ حلوا وغیرہ پکایا ہے اور سب بچوں کو برابر برابر تقسیم کرتا ہے۔ میں شاید اس کا تھوڑا اس کا چھین کر کھا گیا ہوں۔ میں اور میری بہن، ایک پارٹی میں تھے اور وہ محمد علی کو "منہ پھٹا" کہتی تھی، ہم محمد علی کو نوچ کر چھیڑ کر رلاتے تھے اور وہ بہت جلد ہمارے دق کرنے سے رو دیتا تھا۔ اس موقع پر بھی حلوے کے چھن جانے پر اس نے منہ کھول کر رونا شروع کر دیا اور بی اماں اور بھائی ناراض ہو گئے اور میں سب کا منہ چڑا کر بھاگ گیا۔

بی اماں کہا کرتی تھیں کہ بچپن میں ہی میں بڑا سرکش تھا اور جب شرارت کے بعد میں اپنے والد کے پاس بلایا جاتا تھا تو دور سے ہاتھ جوڑ کر، آنکھیں نیچی کر کے، ہونٹ نکال کر بسورتا ہوا آتا تھا اور جب انھوں نے ڈانٹ کر میرے کان پکڑوائے تو میں نے، حکم دی،

---

[۵] مولانا محمد علی نے اپنی آپ بیتی میں اپنے والد کی وفات کے وقت اپنی عمر کے بارے میں لکھا ہے کہ راقم الحروف ابھی دو برس کا نہ تھا۔" ("مولانا محمد علی بحیثیت مؤرخ اور تاریخ ساز" مرتبہ پروفیسر محمد سرور، مطبوعہ جنوری ۱۹۶۲ء، صفحہ ۱۹۲) اور مولانا کی ہجری تاریخ ولادت (۱۰ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ) کے لحاظ سے یہ بات بالکل صحیح ہے۔

غسل کر کے جب رخصت ہوا تو ستون اور پردے کی آڑ میں، بی اماں کے سامنے مگر والد آنکھ بچا کر، بسورتے ہونٹھوں سے، منہ چڑانا شروع کیا، ہاتھوں کے اشارے سے ان تحقیر کرکے، دل کی بھڑاس نکالی اور پھر بھاگ گیا۔ بچپن میں بی اماں اور گھر کے لوگ مجھ کو ہبوڑا سمجھتے تھے جو کہ ایک جرائم پیشہ قوم باہر سرکیوں میں رہتی ہے اور بسا اوقات چوری اور ڈاکے بھی ڈالتی رہتی ہے۔ مجھے یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ اکثر اپنا حصہ کھانے کے بعد محمد علی کے حصے پر چھاپا مارتا تھا اور وہ غریب اکثر منہ پھاڑ کر روتا تھا اور مجھ پر سب ناراض ہوتے تھے۔ مگر تیزی کے ساتھ اس کو مار کر گھر کے باہر بھاگ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی خاص بات یاد نہیں ہے۔ کل کو وہ حالات لکھنے شروع کروں گا، جبکہ میں بڑا ہو گیا تھا۔ حافظہ خوب کام کرتا تھا اور محمد علی کی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔[1]

محمد علی کی کب بسم اللہ ہوئی، کیا رسم ادا کی گئی، مجھے ذرا بھی یاد نہیں۔ کب قرآن شریف ختم کیا اور کب مکتب چھوڑا، مجھے ذرا بھی یاد نہیں، اسکول میں جانے کا سلسلہ جب شروع ہوا اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے محمد علی کو رام پور کے اسکول میں دیکھا رام پور میں انگریزی تعلیم کو اس زمانے میں کفر سمجھا جاتا تھا جب میرے بڑے بھائی اور ہمارے خاندان کے چند نوجوان بریلی کے اسکول میں پڑھنے گئے تو ہمارے بڑے بھائی ہمیں "کرسٹان" کہا کرتے تھے۔ جب نواب کلب علی خاں بہادر کا انتقال[2] ہوا تو رام پور میں انگریز پرگردی شروع ہوئی اور [اس کا] پہلا نتیجہ یہ تھا کہ شہر کے ایک رئیس عبداللہ خاں صاحب کا بڑا مکان کرائے پر لیا گیا اور اس کے

---

[1] دوسری قسط، خلافت مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۳۲ء (جلد ۱۱، نمبر ۹) صفحہ ۶

[2] ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء

دالانوں میں بنچ وغیرہ لگا کر ابتدائی درجے قائم کئے گئے۔ محمد علی نے قرآن شریف اور مکتب کی تعلیم ختم کرنے کے بعد رام پور کے اس انگریزی اسکول میں نام لکھوایا۔

ہمارے خاندان میں یہ رسم تھی کہ جب لڑکے یا لڑکی کی عمر چار سال چار ماہ اور دس دن کی ہوتی تو اس کی بسم اللہ کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ خوبصورت ریشمی کپڑوں کی ٹھاٹ، کامدار جوتا، کامدار ٹوپی، بہت سی مٹھائی، زرتار و مردارہ جلسہ، ریشم کا کام کیا ہوا قاعدے کا جزدان، چاندی کی تختی، قلم اور دوات غرضیکہ بچے کو ایسی رشوت دیکر تعلیم کی طرف رغبت دلائی جاتی تھی۔ غرض اس بسم اللہ کے اشتیاق میں بے قراری کے ساتھ دن گذارتا تھا اور بسم اللہ کے روز تو ہر طرف سے پیار کیا جاتا تھا اور جتنے خاندان کے بزرگ تھے، وہ عید کے دن کی عیدی کی طرح روپے بھی دیتے تھے، غرضیکہ بڑی خوشی ہوتی تھی، مگر جب دوسرے دن سے روز صبح کو ٹھنڈا گرم، ہر موسم میں سیپارہ بغل میں دبائے مدرسہ جاتا اور وہاں اگر سستی سے کام لیا گیا تو مولوی صاحب نے قمچی سے گروا دیا۔ یہ ایک ایسا تلخ تجربہ ہوتا تھا کہ غریب بچہ بھی سمجھ جاتا تھا کہ رشوت دیکر مجھ کو کس مصیبت میں ڈال دیا۔ بسم اللہ یاد ہے نہ اس کا مکتب میں پڑھانہ اس کا قرآن شریف ختم کرنا۔

ہمارے خاندان کے سب لڑکے اور اہل محلہ بھی ہمارے کنبے کے دو تین مکتبوں میں پڑھتے تھے۔ ہر ایک کے گھر میں ایک استانی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مقرر تھی۔ محمد علی کے مکتب کا زمانہ یاد نہیں، غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ میں ۱۸۸۲ء میں اپنے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں کے ساتھ بریلی اسکول میں دو اور چچا زاد بھائیوں کے ہمراہ داخل ہو گیا تھا اور صرف چھٹیوں میں یا ایک دو مرتبہ اور رام پور جانا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ریل نہ تھی۔ بریلی سے چھپالیس میل ہم لوگ اونٹ گاڑیوں میں جاتے تھے اور دو دن میں یہ سفر پورا کرتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ محمد علی کے مکتب کی زندگی کا حال

زیادہ معلوم نہیں ہے۔

رام پور اسکول کے ہیڈ ماسٹر علی گڑھ کے اولڈ بوائے اور غالباً علیگڑھ ہی کے رہنے والے عبدالحق نامی تھے اور رام پور کی انگریزی تعلیم کے کونسلیں با واسکوڈی گاما نذیر خاں صاحب تھے جن کا میں بھی شاگرد تھا اور تقریباً ہمارا تمام خاندان ان کو ہم سب "سحر صاحب" کہہ کر پکارتے تھے۔ محمد علی بھی ان ہی سے پرائیویٹ طور پر اور اسکول میں پڑھتا تھا۔ مجھے خوب یاد پڑتا ہے کہ میں نے محمد علی کو اس اسکول میں ایک دو مرتبہ جا کر دیکھا تھا جبکہ میں بریلی اسکول سے چھٹیوں میں واپس آیا۔

اب چوتھا دور شروع ہوتا ہے، جبکہ بی اماں اور ہماری اکلوتی بہن میرے چچازاد بھائی میجر یوسف علی خاں جو مہاراجہ ہلکر کی فوج میں افسر تھے اور جو ہمارے بہنوئی تھے، ان کے پاس ہم سب گئے تھے۔ رام پور کا قافلہ مع محمد علی کے اول چلا گیا تھا مگر میں اسکول کا امتحان دے کر اور اچھے نمبروں سے پاس ہو کر بعد کو جون کے مہینے میں اندور پہنچا۔ اس عرصے میں میں کشتی بھی لڑتا تھا، ورزشیں بھی کرتا تھا، کرکٹ بھی کھیلتا تھا اور اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ بریلی اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا۔ اندور کے قیام کا مجھ کو ایک واقعہ خوب یاد آتا ہے۔ بی اماں اگرچہ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ ہماری بہن سے محبت کرتی تھیں اور اس کے بعد اور اولاد سے مگر میں کسی گنتی میں نہ تھا۔ شرارت اور مذاق کی وجہ سے مجھے "بھانڈ" کہہ کر پکارتی تھیں اور چونکہ میری بہن مجھ سے از حد محبت کرتی تھیں اور آخر وقت میں ہم دونوں میں بے انتہا محبت، دوستی اور بے تکلفی تھی، اس لحاظ سے میں نے بی اماں کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا تھا اور بعض خانگی امور کی وجہ سے میں ان کا "بہلوان" بن گیا تھا۔

اندور کا موسم گرمیوں میں خوش گوار ہوتا تھا، گرمی بھی کم ہوتی تھی اور راتیں تو

لاجواب تھیں صحیح بنارس، تمام اودھ اور شہر مالوہ، ہندوستان میں اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے ضرب المثل ہیں۔ رمضان آیا اور محمد علی نے پہلا روزہ اندور میں رکھا۔ غالباً اس وقت بی اماں کے پاس روپے کی کمی تھی۔ روزہ تو رکھوایا مگر جوڑا نہیں ہوا۔ محمد علی بچپن ہی سے شاعرانہ مزاج رکھتے تھے اور خاص طور (ادا) کے آدمی تھے بہت ناراض ہوئے اور دھمکی دی کہ روزہ توڑ دوں گا۔ جب ان پر منکر نکیر کی طرح دو گھر کے آدمی تعینات کر دئے گئے تو غصے میں انہوں نے ایک اور احتجاج کی صورت نکالی۔

کہ طفلی میں بھی ہم کھیل جو کھیلے تو صنم کا

بی اماں کو دھمکی دینے کے لئے اور غالباً ایک طرف کپڑوں کی مایوسی، دوسری طرف بھوک اور پیاس کا زور، انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ مہاراجہ کے عطا کئے ہوئے مکان کے نیچے والی   حوضوں میں، جہاں سے عام مخلوق اور خاص کر ہندو پانی بھرتے تھے اور جس مکان میں ہم رہتے تھے، اس کی کھڑکی میں سے کودنے کا ارادہ کیا۔ بی اماں نے مجھے آواز دی تو میں نے دیکھا کہ وہ کھڑکی میں جھکے ہیں اور سب کو کودنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ میں اندور میں خوب کسرت کرتا تھا، قد لانبا ہونا شروع ہوا تھا اور غالباً اندور کے قیام میں چار ماہ کے اندر میرا قد چار انچ بڑھ گیا تھا۔ میں نے ان کی پیٹھ میں ایک دو گھونسے رسید کئے اور کان پکڑ کر ان کو کھینچ لایا حسب معمول منہ پھاڑ کر رونا شروع کیا تو بی اماں نے گلے لگایا۔ پیار کیا۔ دوپہر کے بارہ بجے سے مٹھائیوں، ستاری کناری، زیور، پھل پھلاری، شربت کا سامان شروع کیا اور اس طرح گویا ان کو رضامند کیا گیا اور وعدہ کیا گیا کہ جلد ان کو جوڑا بھی ملے گا اور غالباً کچھ بعد ہی بھی بہت کی گئی، اس کے بعد روزہ کشائی۔ اندور اور باتیں مجھے یاد نہیں۔ پڑھائی کا اندور میں کیا انتظام تھا مجھے یاد نہیں۔

کئی مہینے کے بعد میں بریلی اسکول میں واپس آیا چار یا چھ مہینے ضائع ہو چکے تھے

ں میں داخل ہوا، مگر داخلے سے قبل میرا امتحان لیا گیا تو میں بہت پیچھے تھا، مگر کرکٹ کھلاڑی ہونے کی وجہ سے انگریز ہیڈ ماسٹر مسٹر بوڈن نامی نے جو بعد کو نواب صاحب رام پور کا استاد مقرر ہوا تھا اور پنشن لینے کے بعد بھی رام پور ہی میں رہا تھا، اسے مجھے داخل کرلیا۔ مگر میرے چار یا پانچ درجے بڑھ جانے کی وجہ سے اس کو بہت سا ہوا تھا۔ میں نے بھی پوری محنت سے تین ماہ میں ساری کمی کو پورا کرلیا اور اپریل کے مہینے میں مڈل کا امتحان دوسرے درجے میں پاس کیا اور پھر رام پور گیا۔ اب بھی مجھ کو کوئی خاص بات محمد علی کی یاد نہیں، الا یہ کہ میرے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں سے اس کی خاص دوستی تھی، مگر جب جولائی میں میرا مدرسہ کھلا، جہاں میں نے آخری درجے سے لیکر انٹرنس پاس کیا تھا، محمد علی بھی میری نگرانی میں غالباً دس برس کی عمر میں بریلی کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوا

محمد علی کا مثانہ کمزور تھا اور رات میں دو تین مرتبہ اٹھانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ پہلے یہ کام بی اماں کرتی تھیں اور اب یہ کام میرے سپرد ہوا۔ گود میں اٹھا کر رات کو بورڈنگ کے باہر لے جایا کرتا تھا اور اپنے ہاتھ سے یہ خدمت سرانجام دیتا تھا۔ اگر کسی شب کہیں ناغہ ہوئی تو پھر بستر اور پلنگ کی خیر نہ تھی۔ طالب علموں کے پاس بہت سے لحاف اور چادریں کہاں ہوتی ہیں، کیونکہ بستر کا خراب ہونا میرے لئے بھی باعث مصیبت ہوتا تھا اور ہمارے خادم کے لئے بھی۔ جو کہ ہم سب کا کھانا پکاتا تھا اور اب اس کو بستر بھی دھونا پڑتا تھا، اس لئے ذرا کوشش سے اور مستعدی کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیا کرتا تھا دو برس محمد علی میری نگرانی میں بریلی رہا۔ پڑھائی میں اچھا تھا لیکن وہ ذہانت ابھی شروع نہیں ہوئی تھی جو بعد کو نمایاں طور پر نظر آئی۔ ہاں اب عمدہ کرکٹ کھیلنے والا، ٹینس کھیلنے والا، تیرنے والا اور کشتی لڑنے والا ہوگیا تھا۔ پڑھنے میں اپنے درجے میں اچھا تھا، یہاں تک انٹرنس بھی اول درجے میں پاس ہوا۔

میرے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں اور ان سے چھوٹے اور مجھ سے بڑے صادق علی کے والد حافظ نوازش علی خاں، یہ دونوں فتحپور اسکول میں پڑھتے تھے، جہاں علی گڑھ کے اولڈ بوائے اور ہمارے بریلی کے استاذ مولوی سجاد صاحب بی، اے، جو بعد کو سہارنپور کے ہیڈ ماسٹر اور اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس ہوگئے، ان کے ساتھ پڑھتے اور رہتے تھے ذوالفقار علی خاں ایک سال اول انٹرنس پاس کرکے علی گڑھ میں داخل ہوگئے تھے۔ وہاں کرکٹ اور فٹ بال میں بھی شریک تھے۔

۱۸۹۰ء میں ہم تین بھائی یعنی حافظ نوازش علی خاں، میں اور محمد علی بھی علی گڑھ میں داخل ہوگئے، یہاں ہماری زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے، جس کے واقعات مجھے بہت یاد ہیں، ان کو میں کل لکھوں گا۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ اب علی گڑھ کی قوت دینے والی ہوائیں نمودار ہونے شروع ہوئے اور غالباً بڑے بھائی کی محبت اور شاعرانہ تعلیم نے بھی کچھ رنگ دکھانا شروع کیا اور محمد علی کو ایک ہمدرد مربی مل گیا اور نظام سقہ کی طرح میری بادشاہی ختم ہوئی اور ہم سب بڑے بھائی کی نگرانی میں علی گڑھ میں تعلیم پانے لگے۔[ؔ]

علی گڑھ کے ابتدائی حالات

۱۸۹۰ء میں، غالباً جولائی کا مہینہ ہوگا، جبکہ مرحوم ہمارے ہمراہ علی گڑھ آیا اور غالباً پرانے فورتھ کلاس میں یعنی مڈل سے نیچے کے درجے میں داخل ہوا جس کو ساتواں درجہ کہتے ہیں یعنی میٹرک سے تین درجے نیچے۔ عمر قریب بارہ برس تھی۔ یہاں چونکہ بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں کی صحبت زیادہ ملی، شاعری کا ذوق بھی زیادہ ہوگیا۔ ہاں یہ لکھنا بھول گیا کہ بچپن میں جبکہ محمد علی بہت چھوٹا تھا تو بھائی کے ہمراہ داغ مرحوم کے یہاں جاتا تھا اور ان کے بعض اشعار جو یاد کئے تھے، ان کو سناتا تھا اور وہ بہت محبت سے اس کو اپنی

؎ تیسری قسط۔ خلافت مورخہ ۲۸ / اپریل ۱۹۳۲ء جلد ۱۱ نمبر ۹۸ صفحہ ۹

گود میں بٹھاتے تھے اور اس کے بھولے منہ سے اپنے شعر سن کر محظوظ ہوتے تھے۔ علی گڑھ
اسکول میں مسٹر ہورسٹ ہیڈ ماسٹر تھے اور میر ولایت حسین صاحب سکنڈ ماسٹر تھے۔
رہنے کے ساتھیوں میں صفدر علی خاں صاحب رام پوری اور غالباً مسٹر احسان الحق اور
دو اور بھی حضرات تھے، جن سے میں حالات معلوم کرنے کی کوشش کروں گا، یہاں آکر پڑھنے میں
اپنی قدرتی ذہانت کا مظاہرہ شروع کر دیا اور مجھے خوب یاد ہے کہ یونین کلب میں ایک نظم
بھی بڑے زور شور سے سنائی تھی، مگر اس کی تصنیف میں ایک بڑا حصہ بڑے بھائی صاحب
کا تھا۔ یہ اندرونی خبریں دیتا ہوں مگر بہت اچھی تھی کہ یونین کلب کے بڑے جلسے میں، جہاں
علی گڑھ کے سب طالب علم دہیں اور سر سید موجود تھے، ایک چھوٹے لڑکے کا ہمت کر کے نظم
پڑھنا واقعی ایک عجیب اور انوکھی بات تھی۔ مرزا قسیم بیگ چغتائی صاحب جو بعد کو
یوپی میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے تھے، اس زمانے میں کالج کے طلبا میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے انھوں
نے اس نظم کو سن کر محمد علی کا نام ”چھوٹا بھتنا“ رکھ دیا اور بہت عرصے تک بڑے
ہونے کے بعد بھی اسی نام سے یاد کرتے تھے۔ ہم لوگ بھی پارک میں رہتے تھے اور دو یا
تین کمرے ہم چاروں بھائیوں کے پاس تھے جن میں سے ایک کمرے میں میری کسرت کا سامان
تھا اور اسی میں ہمارا نوکر رہتا تھا، سامنے نیم کے پیڑ کی باڑ تھی اور اس کے پیچھے میرا کشتی
لڑنے کا اکھاڑا تھا۔ محمد علی نے میرے ساتھ تیرنا سیکھا تھا اور کشتی بھی لڑتا تھا ہمارا نوکر
بدھن خاں نامی جس سے سارا ہندوستان اور علی گڑھ واقف ہے اور جو میرے پاس
۲۰ برس رہا، اسی نے مجھے کشتی لڑنا سکھایا، وہی محمد علی کا بھی استاد تھا۔ غالباً چھوٹی جماعت
میں کرکٹ اور فٹ بال بھی کھیلتے تھے۔ ان ابتدائی دوستوں کے حالات اپنے اپنے موقع پر
آئیں گے محمد علی کی وضع عجیب و غریب تھی۔ متاسکی بیماری آخر وقت تک رہی اور بعد میں یہی
ذیابیطس کی صورت میں موت کا باعث بھی ہوئی۔ اس کے متعلق بہت سے پر مذاق قصے ہیں
جو میں ضرور شائع کر دوں گا۔ تاکہ سب دوستوں کے سامنے اس کی زندگی کی صحیح تصویر آجاتے

دوسرے سال مڈل بھی پاس کیا اور درجے میں صفدر علی صاحب جو رامپور اکلیسر
تھے' انہوں نے کلاس میں اول نہیں آنے دیا' اول وہ رہتے تھے اور دوم محمد علی کیونکہ وہ
اسقدر ذہین نہ تھے جسقدر کہ محمد علی آخر دم تک کھلنڈرے رہے اور امتحان میں اچھا
نتیجہ نکالنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے۔ میر ولایت حسین صاحب اور سید عبدالباقی
وہیرسن سے جن کے ساتھ ان کا دوستانہ تھا' یہ اخبار صحیح کر درخواست کروں گا کہ وہ اس
وقت کے حالات تحریر کریں اور پھر ناظرین "خلافت" کو ان حالات سے آگاہ کریں۔
جس سال میں ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے کی ڈگری علی گڑھ سے حاصل کی محمد علی نے
انٹرنس کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی کا علی گڑھ سے پاس کیا ہمارے بڑے بھائی مجھ
سے ایک درجہ اوپر تھے' جب میں فرسٹ ایر میں تھا تو وہ سیکنڈ ایر میں تھے۔
بی اماں چاروں بیٹوں کا خرچ علی گڑھ میں برداشت نہیں کر سکتی تھیں' اپنا زیور اور گھر کا
سامان بیچ بیچ کر پڑھائی تھیں' خود پردے کے اندر رہ کر غریبوں کی زندگی بسر کر لی تھی،
اور ہم کو باہر شہزادوں کی طرح رکھی تھیں۔ خدا مسلم عورتوں اور اس اسلامی پردے کو قائم رکھے
جس کی بدولت ہزاروں بگڑے گھر درست ہوگئے۔ اسلامی پردہ غربت پر پردہ ڈالتا ہے
ظاہری ٹھاٹ باٹ کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے شریف بیبیاں موٹا پہن کر اور موٹا کھا کر اپنے
بچوں کی تعلیم پر حسب ضرورت روپیہ خرچ کر سکتی ہیں ورنہ موجودہ فیشن کی دنیا اگر موجود ہوتی
تو خدا جانے غریبوں کا کیا حشر ہوتا' آج جو چند مسلمان تعلیم یافتہ اور سر برآوردہ ہندوستان
میں نظر آتے ہیں' کہیں نام کو بھی موجود نہ ہوتے کاش ہم سب مسلمان اس پر توجہ کریں اور اسلامی
پردے کا احترام کرتے ہوئے اس پر قائم رہیں اپنی اقتصادی اور ملکی ضروریات کے لحاظ
سے اس پر ایسا اضافہ کریں جو خدا کے حکم کے خلاف نہ ہو' مگر ہماری مصلحت کے مطابق
ہم کو عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کا موقع دے ؎

؎ چوتھی قسط خلافت مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۳۲ء جلد ۱۱ نمبر ۹۹، صفحہ ۶

۱۸۸۹ء میں میں اور محمد علی اور مجھ سے بڑے بھائی نوازش علی خاں مرحوم علی گڑھ میں داخل ہوئے اور ایک سال اپنے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں کی نگرانی میں ہم رہے محمد علی پر ان بھائی کا بہت کچھ اثر پڑا تھا اور شاعری کا ذوق اسی وقت سے پیدا ہوا تھا بعد کو محمد علی مرحوم میں اور مجھ میں بہت محبت ہو گئی مگر ان بڑے بھائی سے ان کو بہت الفت تھی اور بڑے بھائی بھی سب سے زیادہ محمد علی کو ہی چاہتے تھے۔ ۱۸۹۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے امتحان کے بعد ذوالفقار خاں نے کالج کو چھوڑا، تاکہ وہ گورنمنٹ کی ملازمت کریں اور بی اماں کو مصارف سے سبکدوش کریں، جس کے معنی یہ ہوئے کہ وسط ۱۸۹۱ء سے محمد علی کی نگرانی میرے ذمہ آگئی۔ میری طبیعت میں شاعری کا مادہ نہ تھا، کرکٹ کھیلنے اور فٹ بال کھیلنے میں اور ورزش کرنے میں زیادہ وقت گذرتا تھا۔ اور اتنا پڑھ لیتا تھا کہ امتحان آسانی سے پاس کرلوں۔ ہماری کچی بارک کے کمرے غالباً ۱، ۲، ۳، ۴، نمبر کے تھے اور مسجد اور گڑھ کپتان کے مکان والی لائن میں تھے۔ احمد سعید خاں جو سرسید کے پرانے زمانے کے مرادآباد کے دوست تھے وہ عمارت کی تعمیر کی نگرانی پر تھے اور ایک خاص ڈھنگ کے آدمی تھے ان کے مکان کے، جو غالباً اب بھی اسی صورت میں قائم ہے، دو دروازے تھے، ایک اندر کی طرف اور باہر کی سڑک پر۔ اندر والے دروازے سے چوتھا کمرہ ہمارا تھا۔ ۱۸۹۱ء کے آخر میں ہم لوگوں نے یہ پہلے کمرے چھوڑ دئے اور پکی بارک جو کچی کرکٹ کے میدان کے مقابل میں شروع ہوئی تھی اور جہاں اب اور کلاس کے کمرے ہیں اور جو توڑ کر پختہ بنا دی گئی ہے، وہاں ہم نے رہنا اختیار کیا۔ اب محمد علی کا اور میرا پلنگ ایک ہی کمرے میں رہتا تھا ایک سال کے بعد ۱۸۹۳ء میں جب میں ایف اے پاس کر کے کرکٹ کا کپتان مقرر ہوا تو ہم پکی بارک سرسید کورٹ کے گیارہ نمبر کے کمرے میں رہنے لگے اور بالآخر پکی بارک کے تیرہ نمبر کے کمرے میں میں اور محمد علی رہتے تھے۔ محمد علی کی وضع اس زمانے میں ایک خاص

ہنگ کی بھی اگر کرتا تھا تو یہ لویا تحام۔ میلا اور خاص وجوہ سے اکثر مجبوراً پاجامہ پہنتا ہو تا تھا اور کرتا میلا۔ ہماری برابر جاری رہی تھی اور ہم جولی مذاق بھی اڑاتے تھے، غرض کو خرچ بھی کم ملتا تھا، بی اماں بمشکل سے باقاعدہ روپیہ بھیج سکتی تھیں، مجھ کو بارہ روپے ماہوار کا وظیفہ ملتا تھا جو رام پور سے روپیہ آتا تھا اس کا زیادہ حصہ میری ریشم کی قمیص، عمدہ فلالین کی پتلون اور عمدہ ربڑ کے تلے کے کرکٹ کے بوٹوں میں صرف ہوتا تھا۔ علی گڑھ کا ماننا ہوا کلیہ تھا اور سب کو انگریزی لباس پہننا عام طور پر ضروری تھا۔ کرکٹ کے لباس کے ذریعہ سے میں نے ہی سکھایا تھا۔ محمد علی کو تھوڑا بہت خرچ مل جاتا تھا اور جب کبھی اس نے احتجاج کی ہمت کی اور کچھ کہا تو میرے طاقتور رسیدہ ہاتھ نے اس کے جسم سے ملاقات کی اور اس کے گوشت کو مضبوط بنایا اور رعب رد کرکے رہ گیا۔ یہ اسکول کے زمانے کا حال تھا، لیکن جب اس نے ۱۸۹۴ء میں انٹرنس پاس کر لیا اور فرسٹ ایئر میں داخل ہوا تو ساہب نے بخلی بدلی اور محمد علی میری آمدنی میں بڑے حصہ دار ہو گئے۔ فلنش اہل انگریزی لباس تھا اور ہر ہفتہ مجھ کو محبت کا خط لکھتے تھے اور آخر میں روپیوں کی فرمائش۔ کالج کے حالات ذرا دلچسپ ہیں ان کو تفصیل کے ساتھ کل سے شروع کروں گا۔[۱]

کالج کا حال لکھنے سے پیشتر میں کچھ ضروری واقعات کو دہرا دوں، تاکہ مرحوم کے حالات لکھنے والوں کو آسانی ہو۔

۱۔ تاریخ پیدائش ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء، عربی مہینہ بقرعید ذی الحجہ الحرام، مقام رام پور ہمارے پرانے خاندانی مکان میں [صحیح تاریخ پیدائش کے بارے میں صفحہ ۱۲ پر حاشیہ ملاحظہ ہو]

۲۔ انگریزی تعلیم رام پور کے مدرسہ میں شروع کی اور گھر پر بھی پرائیویٹ طور پر بھی پڑھا، غالباً ۸۶–۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۷ء میں انگریزی شروع کی۔

---

[۱] ساتویں قسط خلافت مورخہ یکم مئی ۱۹۲۴ء (جلد ۷ نمبر ۱۱) صفحہ ۹

۳۔ ۱۸۸۸ء میں جولائی کے قریب میرے ہمراہ اور میری نگرانی میں بریلی ہائی اسکول میں تعلیم شروع کی ہم لوگ بورڈنگ ہاؤس میں سب سے آخر کے پیچھے کے حصے والے کمرے میں رہا کرتے تھے۔

۴۔ جولائی یا اگست ۱۸۹ء میں علی گڑھ اسکول میں داخل ہوا اور پرانی کچی بارک کے کمرہ ۲، ۳ میں ہمارے ساتھ قیام کیا غالباً ۱۸۹۱ء میں ان کمروں سے اٹھ کر نئے کمروں میں چلے گئے۔

۵۔ ۱۸۹۲ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۹۴ء میں انٹرنس کا امتحان بھی الہ آباد یونیورسٹی کا علی گڑھ سے پاس کیا۔

۶۔ ۱۸۹۲ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا۔

۷۔ ۱۸۹۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی کا بی اے پاس کیا اور یونیورسٹی میں سب سے اول رہا اور اسی سال جون کے مہینے میں میں نے انگلستان آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم کے لئے بھیجا۔

محمد علی جب میری نگرانی میں آیا تو مجھ سے بے انتہا ڈرتا تھا اور میں اس کی شاعرانہ طبیعت اور تھوڑی عمر میں ذہانت کے ثبوت دینے سے ناراض ہوتا تھا اور بالکل اس سے کوئی ہمدردی نہیں کرتا تھا اور موقع بموقع خوب اس کو ٹھونکتا تھا۔ اس عرصے جیب خرچ بھی اپنی قصوں اور کرکٹ کے کپڑوں پر صرف کر دیتا تھا۔

یہ حالت ۱۸۹۲ء تک رہی اور اس کے بعد ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۴ء تک اس کی تھوڑی بہت حالت شغل اور کپڑوں کی طرف سے وہ ذرا خوش حال ہوا اور غالباً منا کے کی بیماری میں بھی قدرے کمی واقع ہوئی۔ کرکٹ بھی کھیلتا تھا، قواعد بھی کرتا تھا، شرارت میں بھی اچھا درجہ تھا، چنانچہ محمد علی کے خاص دوستوں میں مسٹر احسان الحق تھے جو کہ اب ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار پر ضلع اٹک میں سشن ججی کر رہے ہیں اور سنا ہے کہ پنشن لے کر علیگڑھ کے لڑکوں کو کرکٹ سکھانے کے لئے علی گڑھ ہی میں قیام کرنے

والے ہیں۔ محمد علی سے زور لڑائی بھی رہتی تھی اور دوستی بھی۔ ایک دوپہر کے وقت احسان صاحب روتے ہوئے آئے اور مجھے سونے سے جگا کر انہوں نے اپنا ہاتھ دکھایا جس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ دونوں دھوپ میں بھی پارک کے سامنے کرکٹ کھیل رہے تھے احسان بہت اچھا کھیلتا تھا، محمد علی نے کھیلنے میں بے ایمانی کی، احسان نے آؤٹ نہ ہونے کی قسم کھالی تھی، محمد علی نے وکٹ لیکر اس زور سے ہاتھ پر مارا کہ ڈیڑھ دو انچ لمبا زخم ہو گیا اور احسان مجبوراً آؤٹ ہو گئے اور پھر مجھے اٹھا کر بیان کیا۔ میں نے محمد علی کی تلاش شروع کی اور احسان کو پیار کر کے تسلی دی۔ محمد علی باوجود تمام تلاش کے دن بھر نہیں ملا، شام کو دوستوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ فرانسیسی جرنیل پیرو کے باغ کی کوٹھی میں جس کو صاحب باغ کہتے ہیں، پناہ لی تھی اور اب دوستوں کی سفارش سے معافی کے طلب گار ہیں۔ لطف تو یہ ہے کہ سفارش کرنے والوں میں جہاں سب سے مرے دوست تھے وہاں احسان بھی زخمی ہاتھ پر پٹی باندھے اور ہاتھ گلے میں لٹکائے ہوئے محمد علی کی سفارش کو موجود تھے۔ میں نے سب کی سفارش قبول کی، مگر میں چار چانٹے ان کے طور پر رسید کر دئے، جس سے اس کا چہرہ اور کان ضرور جھنجھناتے ہوں گے۔

احسان کرکٹ کے مداحوں میں تھے اور جب وہ انگلستان بیرسٹری کی تعلیم پانے گئے تو وکٹوریہ اسٹیشن پر محمد علی نے ان کا خیر مقدم کیا تھا اور ان کے سر پر ہندوستان کے بنے ہوئے انگریزی کپڑے اوڑھا کر احسان سا پایا تھا۔

کالج میں محمد علی کی پڑھائی بہت اچھی تھی۔ ایف اے آسانی کے ساتھ پاس کر لیا اور بی اے میں تو یونیورسٹی میں اول آئے اور اعمال گورنر میڈل حاصل کیا۔ مجھے اس کا الہ آباد سے امتحان دیکر واپس آنا خوب یاد ہے۔ میں ان دنوں اوپیم ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ کلکٹر تھا اور ضلع رائے بریلی کے ڈیمئو مقام پر افیون کی تول کا سامان

ندیا تھا۔ یہ جگہ گنگا کے کنارے پر واقع تھی اور اس کو عبور کرکے مجبوراً سوا صرف چند دو میل تھا اس لئے میں نے آدمی اور سواری فتحپور اسٹیشن پر بھیجدی تھی جو الہ آباد سے قریب تھا اور وہاں سے وہ سید محمد میرے پاس آیا۔ جو کچھ میں نے چار برس محمد علی کا جو کالج کے جیب خرچ میں سے کھایا تھا، ۱۸۹۳ء سے لیکر ۱۸۹۸ء تک ان حضرت نے سود در سود کے حساب سے سنئے اور یہودی کو مات کرکے مجھ سے ایسا وصول کر لیا کہ شاید کسی بیٹے اور یہودی نے بھی اتنا وصول نہیں کیا ہوگا۔

اب محمد علی بڑے ٹھاٹھ والے تھے لباس کیا اچکن کیا اور کیا انگریزی کپڑے، بہت شان کے تھے، یہاں تک کہ میں بھی ان کی قدر کرتا تھا اور اس عرصے میں بہت محبت بھی ہوگئی تھی ہر خط کی ابتدا پیار اور محبت سے ہوتی تھی۔ تعلیم میں ترقی کی وعدے کرتے تھے، بڑی اونچی اونچی لن ترانیاں کرتے تھے۔ شاعری کو بھی کام میں لاتے، انگریزی کے جوہر دکھانے اور اس کے ذریعے میرے سخت دل کو موم کرکے روپے اور اور روپے کی فرمائش ہوتی تھی ہل من مزید ہل من مزید کے نعرے میں کبھی کمی نہیں ہوتی تھی۔ میں دل میں پشیمان ہوتا تھا کہ میں نے کیوں اس کا جیب خرچ کھایا کہ آج اس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ کسی استاد کا پیارا شعر کیا خوب ہے ؎

کل چمن میں چار کلیاں جن کے محرم بن گئیں
آج صحرا میں مرا ہر تار دامن گستر ہے

تھوڑے بہت کرکٹ کے قصے اور پرانی داستانیں یاد آتی جاتی ہیں اسے حافظہ پر زور دے رہا ہوں اور ان شاء اللہ کل مزید حالات لکھوں گا [۵]

ہمیشہ کالج چھوڑنے کے بعد جب محمد علی فرسٹ ایر میں آگئے تو اس کی زندگی میں بڑا فرق ہوگیا، کرکٹ بھی کھیلنا شروع کیا، اور کھیلوں میں بھی حصہ لیا اور یونین کلب کے مباحثوں میں

---

۵ چھٹی قسط۔ خلافت مورخہ ۴ مئی ۱۹۳۲ء، جلد ۱۱ نمبر ۱۰۳، صفحہ ۳

بھی شریک ہونے لگا۔ اب تک اسکول میں رہنے کی وجہ سے دائرہ محدود تھا، اب عمر بھی بڑھ
گئی تھی اور میں ڈرانے دھمکانے والا بھی نہیں رہا تھا، جیب خرچ بھی پہلے سے بہت اچھا
ملتا تھا، کچھ تو اماں سے لیتا تھا، کچھ بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب سے اور معلم
فیس وغیرہ اور دیگر اخراجات میرے ذمے تھے، مجھے معلوم نہیں کس سنہ میں یونین
کیبنٹ میں شریک ہوا اور کب کالج کی کرکٹ کی سیکنڈ الیون میں، بعد کو وہ فرسٹ
الیون کے قریب آگیا تھا، مگر مجھے معلوم نہیں کہ باقاعدہ طور پر فرسٹ الیون کا ممبر
ہوا تھا یا نہیں۔ دوپہر کو جب میں سو جاتا تھا تو برابر سے ساتھیوں کے ساتھ علی گڑھ کی
گرمی میں دھوپ میں فٹ بال اور کرکٹ کھیلتے تھے جس سے ان کی نکسیر پھوٹ جایا کرتی
تھی اور رفتہ رفتہ اس وجہ سے نگاہ بھی کمزور ہوگئی اور اس کو عینک لگانے کی ضرورت
پڑی، اس وجہ سے قدرتاً کرکٹ اور ٹینس میں وہ زیادہ مہارت حاصل نہ کرسکا جو نگاہ
کے اچھا ہونے کی حالت میں کرتا۔ تیرنا رامپور اور علی گڑھ میں میرے ہی زمانے میں
شروع کردی تھی اور تیرنے میں تو کافی مہارت تھی۔ جب بی اے کے امتحان کا وقت
آیا تو میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس کرے گا تو ضرور اس
کو انگلستان سول سروس کے لئے بھیج دوں گا، روپیہ کہیں سے لاؤں گا۔ چنانچہ اس نے
محنت کی اور یونیورسٹی میں اول آیا اور میں اس کو لے کر رامپور گیا اور نواب صاحب رامپور
سے، جو مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، دس ہزار روپیہ اپنی ضمانت پر قرض لیا اور ہزار
روپیہ سالانہ کی قسط ادائی کا وعدہ کیا۔ دس ہزار روپیہ دے کر اسے آکسفورڈ ڈگری
اور سول سروس کے امتحان کے لئے بھیج دیا۔ غالباً وہ ۸ جون ۱۸۹۸ء کو پی اینڈ کمپنی اوپیشل
جہاز سے بمبئی سے لندن روانہ ہوا۔ میں اس زمانے میں رائے بریلی اودھ میں اسسٹنٹ
کلکٹر تھا اور میری تنخواہ ۔۱۲۔۳۴۴ ماہوار تھی اور سال میں نو مہینے نوے روپیہ مہینہ بھتہ
ملتا تھا۔ سارے خاندان کا بوجھ تھا مگر ہمت مرداں مدد خدا۔ مجھے خوب یاد ہے

گاڑی رات سے بریلی سے رات کو چھوٹتی تھی، بی اماں اور میری مرحومہ اہلیہ برقعہ پہنے ہوئے سٹیشن پر اسے بھجانے گئی تھیں، میں بھی ہمراہ تھا۔ بی اماں نے گلے لگایا تھا اور صرف یہ نصیحت کی تھی کہ "بیٹا اسلام اور خاندان کی عزت کو دھبہ نہ لگانا، جاؤ خدا حافظ۔" بیٹوں کا دل بھرا ہوا تھا، آنکھوں میں آنسو تھے، مگر خوشی بھی تھی کہ جس کام کا ارادہ کیا تھا، خدا نے اس کا سامان کر دیا۔ خدا کے سپرد کر کے اس کو چار پانچ برس کیلئے غیر ملک کو روانہ کر دیا۔

محمد علی، مجھے خوب یاد ہے، سیکنڈ کلاس کے کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا درد بھری ہوئی آواز سے ہم کو خدا حافظ کہا تھا۔ گاڑی چل دی اور ہم با دل ناخواستہ اپنے گھر کو واپس آئے۔

محمد علی کے پاس پرانے انگریزی کپڑے علی گڑھ کے موجود تھے اور ہم سب نے یہی مشورہ دیا تھا کہ ہم انگلستان جا کر نئے کپڑے بنوانا۔ بمبئی میں دو تین روز ٹھہرا تھا اور غالباً کوئی ہوٹل تھا وکٹوریہ اسٹیشن کے قریب، جس کا نام یاد نہیں۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں اس سلسلے کے ساتھ ایک انگریز دوست مسٹر برسی اوڈہم کا ذکر بھی کر دوں جو ان دنوں بریلی میں ڈپٹی کمشنر تھے اور جو خود بھی آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے تھے اور میرے بہت عزیز دوست تھے اور اب بھی کبھی کبھی مجھ کو برابر خط لکھا کرتے ہیں۔ یو پی میں کمشنر کے درجے سے ریٹائر ہوئے، بڑے مشہور شیر کے شکاری تھے، مرزا پور اور کمایوں میں دو سو سے زائد شیر شکار کیے ہوں گے۔ انہوں نے محمد علی کو آکسفورڈ کے متعلق بہت مفید مشورے دیے تھے اور یہاں تک محبت کا ثبوت دیا کہ جب وہ انگلستان رخصت پر گئے تو محمد علی سے ملنے کی خاطر آکسفورڈ گئے۔

محمد علی کے پرانے خطوط میرے پاس کہیں نہ کہیں پڑے ہیں، نظر بندی اور سیاسی کشمکش میں مرحوم بیگم صاحبہ کے انتقال سے میرا تمام گھر کا سامان درہم برہم ہو گیا، خدا معلوم کہاں

کہاں میرا اسباب اور دفتر وغیرہ منتشر پڑے ہیں، میں خطوط ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا، کیونکہ یہ خطوط بہت دلچسپ ہیں اور ان کے ذریعہ محمد علی کی روز افزوں ترقی کا حال معلوم ہوگا اور اس کی زندگی کے حالات لکھنے والوں کو بہت کچھ مواد مل جاتے گا۔[۱۲]

لندن پہنچکر مسٹر[۱۳] تھیوڈور بک کو (جو آ علی گڑھ کے پرنسپل تھے) اور ان کی چھوٹی بہن مس جے سی بک جو اب نمبر ۲۱ کرامویل روڈ کے ہندوستانی طلبہ کے مکان کی منتظمہ ہیں وہ اس کو اسٹیشن سے اپنے ہمراہ لے گئیں اور اس وقت تک اپنے مکان میں رکھا جب تک اس کی رہائش کا مناسب انتظام نہ ہو گیا۔ ان ہی کے خاندان کے مشورہ سے اس نے اپنے لیے کپڑے بنوائے اور اسی تصویر مجھ کو بھیجی جو آج تک میرے پاس موجود ہے اور جس کو بہت ہی عزیز رکھتا ہوں[۱۴]

تقریباً ۱۹۰۵ء میں علی گڑھ چھوڑنے کے بعد، محمد علی میرے عزیز دوست اور کرکٹ کی کپتانی میں میرے جانشین اے، ایم عبداللہ مرحوم کے ساتھ رہنے لگے، ان کے دونوں بھائی مسٹر اکرام بھوپال میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہیں اور دوسرے چھوٹے بھائی مسٹر اسلم مدراس میں سپرنٹنڈنٹ ڈاکخانہ جات ہیں۔ یہ سب علی گڑھ میں اکٹھے رہتے تھے اور محمد علی کی زندگی پر عبداللہ مرحوم کی صحبت کا اثر بھی بڑا تھا۔ اس زمانے میں مرحوم چچا (صفار اللہ خاں) رام پور جے پور کے بڑے مشہور کرکٹر (کرکٹ کے کھلاڑی) بھی کالج میں تھے اور محمد علی سے اپنے چھوٹے عزیزوں کا سا برتاؤ کرتے تھے سید سجاد حیدر[۱۵] سے مرحوم کی بہت دوستی تھی اور آخر وقت تک یہ دوستی قائم رہی،

---

۱۲ - عالمانہ دلچسپ اور مفید خطوط نہیں ملے کیونکہ اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں ۱۳ ستمبر ۱۸۹۸ء

۱۴ - ساتویں قسط علامت مورخہ ۵ مئی ۱۹۳۲ء (جلد ۱۱ نمبر ۱) صفحہ ۶

۱۵ - سید سجاد یلدرم - پیدائش:- ۱۸۸۰ء بمقام نہٹور (ضلع بجنور) وفات ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء بمقام لکھنؤ وقت ۲ بجے شب:

دونوں میں ادبیت مشترک تھی۔ لندن پہونچ کر تھوڑے دنوں مسٹر بک کے یہاں قیام کیا اور بعد کو لندن میں ایک یہودی مسٹر اور مسز ہائمس[۱۶] کے ساتھ دو گنی فی ہفتہ ادا کرکے رہنے لگے۔ ۸۲ برانڈسبری ولا کلبرن[۱۷] میں رہتے تھے، اور جب آکسفورڈ میں داخل ہوئے تو بھی تعطیل کے ایام کے زمانے میں وہیں رہتے تھے۔ فضل حسین[۱۸] جو اب سر میاں فضل حسین ہیں اور وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہیں، وہ بھی اس مکان میں ان کے ہمراہ رہتے تھے[۱۹]۔

میں نے جب آکسفورڈ بھیجنے کا ارادہ کیا اور اس لحاظ سے کہ وہ سول سروس کے امتحان کے لئے پوری کوشش کریں تو بعد میں شامل ہونے سے منع کیا۔ میرا خیال تھا کہ آکسفورڈ کی ڈگری اور سول سروس کے داخلے کے امتحان میں اسے ضرور کامیاب ہونا چاہئے۔ بہت اچھا قانونی دماغ تھا اور غالباً بہت ہی کامیاب بیرسٹر ہوتا۔ مگر اس پیشے سے نفرت تھی۔ بعد کو ہم دونوں کو اسی غلطی پر پشیمانی ہوئی۔ محمد علی کی قسمت میں نہ سول سرونٹ ہونا لکھا تھا اور نہ بیرسٹر ہونا۔ اسلام کا سچا اور بہادر خادم ہونے کی عزت اس کے لئے مخصوص تھی، اور افلاس بھی جو کام کرنے والوں کا حصہ ہے، اس کے لئے مخصوص تھا۔

جب محمد علی نے سول سروس کے مشہور کوچ یعنی استاد ون رن اینڈ گرنی سے ملاقات کی

---

[۱۶] Hyams [۱۷] 82, Brondsbury Villas Kilburn

[۱۸] پیدائش ۱۴ جون ۱۸۷۷ء بمقام پشاور، وفات ۹ جولائی ۱۹۳۶ء بمقام لاہور

[۱۹] فضل حسین پابندی کے ساتھ ڈائری لکھا کرتے تھے، اسی ڈائری میں محمد علی کا مختلف تاریخوں میں ذکر ہے۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۹۸ء کو جب پہلی مرتبہ وہاں ملاقات ہوئی تو لکھا "مرد سابق علی گڑھ کالج کے گریجوئیٹ اور رام پور کے رہنے والے"۔ ۲۴ ستمبر کو لکھا "شام کو محمد علی اپنے دو دوستوں اور میرے ساتھ مسٹر بک کے یہاں کھانے کے لئے گئے، ہم سب ڈ...سوٹ میں تھے، محمد علی پہلے سے اس خاندان کے ساتھ بے تکلف تھے مگر ہم لوگ نئے تھے"۔ مولانا شوکت علی نے ساتویں قسط کے آخر میں مولانا محمد علی کی ایک تصویر کا ذکر کیا ہے اس سلسلے میں فضل حسین نے ۸ اکتوبر کو لکھا ہے: "محمد علی نے تصویر کھنچوانے کے لئے مجھ سے بار بار ساتھ چلنے کے لئے اصرار کیا، مگر میں نے طے کر لیا تھا کہ کوئی تصویر نہیں کھنچواؤں گا اس لئے معذرت کر لی، لیکن ان کا اصرار جاری رہا، نامناسب جملے بازی بھی کی، مختصر یہ کہ لڑائی بھی کی گئی"۔ ۱۰ اکتوبر کو لکھا ہے: "آکسفورڈ کی روانگی کے موقع پر محمد علی کو ایک الوداعی پارٹی دی گئی، سعید الظفر اور عبد الواحد نے تقریریں کیں، گانے بھی گائے گئے، وقت بہت اچھا گزرا"۔ ۱۱ اکتوبر کو محمد علی کو رخصت کرنے کے لئے فضل حسین پیڈنگٹن ریلوے اسٹیشن گئے۔ اس تاریخ کی ڈائری میں محمد علی کے بارے میں لکھا ہے "بہت دلچسپ آدمی ہیں، دوستی پیدا کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں مگر ان میں گہرائی نہیں ہے"۔

اور ان سے اپنے آکسفورڈ جانے کا ارادہ ظاہر کیا، جہاں نہ انتظام کیا گیا تھا کہ لوگوں کو خاص گُر یعنی جو امتحان کے لئے مضمون رٹائے تھے، ان سے طالب علموں کو سبکدوش کیا جائے تو رس نے مجھ کو ایک بہت تلخ خط لکھا تھا کہ آکسفورڈ سمجھا ہے تو سمجھ دو، کھیل تماشے کی اچھی جگہ ہے، پڑھنے سے کچھ کام نہیں ہے، مگر بعد کو محمد علی دونوں جگہ سے مستفید ہوتے تھے، یعنی آکسفورڈ میں ڈگری کے لئے پڑھتے تھے اور چھٹیوں میں رن اینڈ گرنی کے ساتھ امتحان پاس کرنے کے لئے ان کے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ رن مشہور سول سروس سکھانے والوں کا چھوٹا مدرسہ تھا جس میں امتحان پاس کرنے کے لئے لوگوں کو تعلیم دی جاتی تھی جن کو کریمر کے نام سے یعنی امتحان پاس کرنے کے لئے علم کو امیدواروں کے گلے میں "ٹھونستے تھے"۔ اس زمانہ میں ہر ہفتہ محمد علی کے پاس سے بہت دلچسپ خطوط آتے تھے، میں ان کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سناتا اگاؤں گا اور سب کو ڈاکٹر ذاکر حسین[۵۲] کی خدمت میں دہلی بھیج دوں گا، تاکہ وہ ان سے کام لے سکیں۔ کیونکہ کلرن جہاں مرحوم رہتا تھا، ہمسٹڈ کے قریب تھا جہاں ہمسٹڈ کی مشہور کرکٹ کی کلب تھی۔ محمد علی وہاں کرکٹ کھیلتے تھے اور انگلستان کا مشہور کھیلنے والا، اے ای اسٹاڈرٹ ان سے خاص محبت کرتا تھا اور مرحوم وہاں بلیزر (رنگین کاکوٹ) حاضر وقت پہنتے تھے اور غالباً آخر وقت تک ان کے پاس رہا۔

سول سروس کے لئے مولوی محمد برکت اللہ بھوپالی سے عربی سیکھتے تھے اور لیسٹ یعنی لاطینی زبان ایک جرمن نوجوان، پرلسٹن نامی سے سیکھتے تھے۔ اس کے پڑھنے میں اکلوتی رحمت ہوئی وقت بھی ضائع ہوا اور روپیہ بھی۔ سول سروس کے امتحان میں ان کو عربی میں بہت کم نمبر دیے گئے تھے، فضل حسین، جن کی عربی محمد علی سے اچھی تھی، ان کو بھی زیادہ نمبر نہیں ملے۔ مقابلے کے امتحان میں ریاضی اور سائنس بہت کام آتے ثابت ہوتی ہیں، دونوں سول سروس کے امتحان میں کافی نمبر حاصل نہ کرسکے اور آخر سال تو محمد علی کو اگر سو نمبر اور مل جاتے تو وہ سول سروس میں

[۵۲] پیدائش ۸ر فروری ۱۸۹۷ء بمقام حیدرآباد وفات ۳ر مئی ۱۹۶۹ء بمقام نئی دہلی اس وقت شیخ الجامعہ

ہندوستان آجاتے۔ اس وقت تو انہیں صدمہ تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ سول سروس کی لعنت سے بچ گئے اور اسلام کی خدمت کرتے ہوئے دنیا سے اٹھ گئے [۱۵]

محمد علی جون ۱۸۹۸ء میں انگلستان گئے اور تھوڑے دنوں کے بعد ہی لنکن کالج آکسفورڈ میں داخل ہو گئے۔ آکسفورڈ کی ڈگری حاصل کرنے اور سول سروس کے امتحان میں پاس ہو کر اس میں داخل ہونے کا ارادہ تھا۔ تاریخ، انگریزی، اکانومی اور عربی بہ خاص مضامین تھے اور آکسفورڈ میں ہسٹاریکل ٹرائی پاس لینے کا ارادہ تھا چھٹیوں میں لندن آکر ریس اسڈگرلی کے یہاں پڑھتے تھے اور مسٹر اور مسز ہاٹمس کے یہاں قیام اس وجہ سے کرتے تھے کہ وہاں گوشت ہو دلوں کا ذبح کیا ہوا ملتا تھا محمد علی نے آکسفورڈ، لندن میں بھی ترکی ٹوپی اوڑھی اور رمضان شریف کے پورے روزے رکھے تھے، نماز بھی پڑھتے تھے مگر کنڈ سے دار۔

آکسفورڈ میں کرکٹ کھیلنا جاری رکھا تھا اور دربار کسیاں کھیلنا بھی سیکھا تھا ہاکی اور فٹ بال بھی کھیلتے تھے ہندوستانی خاص دوستوں کے ساتھ ایک سوسائٹی بھی قائم کی تھی جس کا نام اکبر کے نورس درباروں کی مناسبت سے "نورس" رکھا تھا اور اس کا ایک خاص کلب بھی رکھا تھا، کھانے کے کپڑے بھی خاص وضع کے تھے، جلسے بھی کرتے تھے، عام لوگوں کو اس میں شرکت کی اجازت نہ تھی، صرف خاص خاص احباب شریک کئے گئے تھے۔ لنکن کالج میں ہمارے رامپور کے صاحبزادے عبدالواحد خان، صاحبزادہ عبدالصمد خاں کے بڑے بھائی محمد علی کے ساتھ تھے۔ عبدالواحد خاں، اجمیر مواڑ میں سشن جج ہیں طالب علمی کے زمانے میں بہت آزاد خیال تھے اور اب بہت پکے اور راسخ العقیدہ مسلمان سختی کے ساتھ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ نہایت قابل اور شریف اور بہت با مذاق تھے۔ محمد علی اور ان میں بے تکلفی ہوتی رہتی تھی اور بعد میں بھی جب کبھی مل جاتے تھے تو پھر وہی چھیڑ خانی اور مذاق ہوا کرتا تھا۔

---

[۱۵] آٹھویں قسط خلافت مورخہ ۲ مئی ۱۹۲۲ء (جلد ۴ نمبر ۱۵) صفحہ ۶

جب سول سروس کے آخری امتحان میں سو نمبروں کی کمی رہ گئی تو مجھے بہت رنج ہوا تھا، مگر بی اماں نے ہمت افزائی کا تار دیا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں ہم سب کے مشورہ سے ان کو ہندوستان بلایا گیا، ورنہ دسمبر ۱۹۰۱ء کو وہ ہندوستان پہنچ گئے، خوب تندرست اور طاقت ور تھے، اور جو موٹاپا بعد کو آیا وہ اس وقت موجود نہ تھا۔ جب لکھنؤ اسٹیشن پر اول مرتبہ میں نے ان کو دیکھا تو انگریزی کپڑوں کے ساتھ ترکی ٹوپی اوڑھے تھے، قریب شام کے چھ بجے ہم رام پور پہنچے۔

منگنی اور شادی

اسی اثنا میں محمد علی کی منگنی اسی جگہ ہوئی جہاں بعد کو شادی ہوئی، یعنی ہمارے چچا زاد بھائی، چچا زاد بہن کی لڑکی امجدی بانو سے۔ محمد عظمت خاں صاحب ہمارے بڑے چچا اصغر علی خاں صاحب کے منجھلے بیٹے تھے، نہایت خوب صورت اور قابل جوان تھے۔ اندور کی ریاست میں سرصوبہ اور دیگر بڑے عہدوں پر اپنے انتقال کے وقت تک نوکر تھے اور اندور ہی میں دفن ہوئے ہیں، ان کی تین اولادیں تھیں، جن میں سب سے بڑے معظم علی خاں بی اے آکسن بیرسٹر ایٹ لا ہیں جو کہ رام پور ہائی کورٹ میں آجکل چیف جج ہیں اور جمعیۃ خلافت میں بھی ترک موالات کے زمانے میں چار برس کام کر چکے تھے، اور بعد کو اندور میں سلک پر انسپکٹر تھے اور اب رام پور وطن میں ہیں۔ ان سے چھوٹی امجدی بانو تھیں جس سے محمد علی کی منگنی ہوئی تھی اور بعد کو بعض خانگی وجوہات سے وہ چھوٹ گئی تھی اور ان کے چچا زاد بھائی سے منگنی ہو گئی، مگر ان کے انتقال کے بعد امجدی بانو ہی کی قسمت میں آئیں جس کے ساتھ انکو عمر کا بہت بڑا حصہ گذارنا تھا اور جنہوں نے جو رفاقت لندن کی بیماری تک میں انجام دیا اور بعد کو اپنے عزیز شوہر کی میت کے ہمراہ آکر قدس شریف میں اپنے سامنے دفن کرایا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے بے حد محبت تھی اور امجدی بانو اپنے شوہر کے اسلامی اور سیاسی کاموں میں نمایاں حصہ لیتی تھیں اور خود بہترین تنظیمی و تعمیری کام کرنے والی ہیں۔ تقریر بھی بہت اچھی کرتی ہیں، حساب کتاب اور کاروبار کرنے کا خاص مادہ ہے جس سادگی سے انہوں نے مرحوم کے عادات کو

ترتیب دیکر اور سنبھال کر رکھا ہے، وہ ان ہی کا حصہ تھا محمد علی کی زندگی کے حالات لکھنے والوں کو ان کا عدات سے بہت کچھ مدد ملے گی۔

سب سے چھوٹا بھائی منشاں علی تھا جس نے علی جوانی میں انتقال کیا اور جو بہار بندگی کا قائم کرنا دوسری وال دہ سے عظمت علی خاں صاحب کے دو لڑکے اور ہیں، مسعود علی جو ریاست اندور میں ریونیو انسپکٹر اور دوسرے چھوٹے نظفر علی خاں جو وی آنا میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

امجد بانو کی تعلیم کے لئے میں نے علیحدہ مدرسہ بھی قائم کر دیا تھا جس میں انہوں نے ابتدائی تعلیم جو پہلے ہو چکی تھی اس کو اور مکمل کیا یہاں تک کہ فروری کے مہینے میں (غالباً ۵ر فروری ۱۹۰۲ء کو) نکاح کی رسم رام پور میں ادا ہوئی تھی کیسی قسم کا ناچ رنگ نہ تھا اور نہ کوئی رسم ادا کی گئی، دعوت ولیمہ میں نے کی دی تھی اور ایک گارڈن پارٹی بھی جس میں ہز ہائنس نواب صاحب تشریف لائے تھے اور شہر کے تمام روسا تھے۔

محمد علی کے رام پور آتے ہی ہز ہائنس نواب صاحب مرحوم نواب سر حامد علی خاں صاحب بہادر نے ان کو افسر تعلیم مقرر کیا اور رام پور ہائی اسکول کا پرنسپل بھی، تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ ان میں دی تھی۔ دیرینہ مراسم اور تعلقات کی وجہ سے تنخواہ کے مسئلے میں میں نے کوئی تعلق (و اختلاف) کرنا مناسب نہ سمجھا ہے شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد بی اے آکسفورڈ کی ڈگری کا امتحان دینے کے لئے محمد علی واپس لندن گئے اور وہاں ۲۸ جولائی ۱۹۰۲ء کو امتحان پاس کرنے کے بعد رام پور واپس آئے اور ایک افسر تعلیم کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دینے لگے۔[۲۳]

محمد علی کو رام پور کی ملازمت راس نہ آئی۔ دنیا کا تجربہ ابھی نہ تھا، مگر پھر بھی قابلیت، اور دیانت موجود تھی۔ خاندانی اثر بھی تھا اور اول دن سے محمد علی میں اخلاقی جرأت کافی تھی اس لئے ان کو دق کرنے کیلئے بہت سی سازشیں کھڑی کر دی گئیں۔

آکسفورڈ میں اس زمانے میں ہز ہائنس نواب صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی ناصر علی بھی

۲۲۔ اس سلسلہ میں نواب صاحب کا فرمان جامعہ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں شائع کیا جا چکا ہے

۲۳۔ مولانا محمد علی، علاقہ مجدد، (مئی ۱۹۳۲ء (جلد نمبر ۱)) صفحہ ۹

پڑھتے تھے محمد علی سے بھی ان کی ملاقات تھی، اس لحاظ سے رام پور کے والی ملک کے بیٹے تھے، محمد علی نے قدرتی طور پر زیادہ خیال بھی کیا تھا، مگر وہ صرف ہز ہائینس نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم کی وجہ سے، جن سے ہم دونوں کو محبت تھی اور جو مجھ پر خاص طور سے عنایت فرماتے تھے اور مجھ سے محبت کرتے تھے میں ان سے عمر میں دو برس بڑا تھا، مگر بچپن سے ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے اور ساتھ ہی کھیلے تھے۔

وطن سے دور جا کر وطن والوں کی قدر ہو جاتی ہے اور اس سلسلے میں تو خاص تعلقات بھی تھے محمد علی جب انگلستان سے واپس آیا تھا تو وہ چھوٹے بھائی کا بڑے بھائی والی ملک کے لئے محبت اور عقیدت مندی کا پیغام بھی لایا تھا اور اس نے کوشش کی تھی کہ دونوں بھائیوں میں محبت قائم ہو جائے مگر درباری لڑانے والے بہت موجود تھے اور شک وشبہ کے زہر کو پھیلا کر اپنا کام نکالنا چاہتے تھے چنانچہ محمد علی کے خلاف بھی ایک ایسی سازش تیار کی گئی کہ وہ اور ہمارے خاندان کے دیگر افراد دوسرے اور لوگ بھی ہز ہائینس کو گدی سے اتروا کر چھوٹے بھائی کو بٹھانا چاہتے ہیں اور غالباً انگریز بھی اس کو پسند کریں گے کہ ان کے قصبے میں رہنے والا انگریزی خیال کا ایک نوجوان رام پور کی گدی پر متمکن ہو اور انگریزوں کے ہاتھ [میں] کٹھ پتلی بنا رہے۔

محمد علی نے شادی کے بعد چار[۲۴] ماہ کی رخصت طلب کی تاکہ آکسفورڈ کی بی اے کی ڈگری کا امتحان پاس کرے، مگر اس رخصت کے حصول میں دشواریاں پیدا کی گئیں اور ہز ہائینس جو اس سازش میں شامل بھی تھے، ان کو یقین دلایا گیا کہ یہ رخصت وغیرہ سب گہری سازش کا ضروری جز وہے۔ محمد علی عرب ریاستان ہوا اور چونکہ ہز ہائینس مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، اس لئے اس نے مجھ کو تار دیکر بلایا اور میں نے آکر ہز ہائینس کے شبہے کو دور کیا اور اس کو جانے کی رخصت بھی لے دی۔ واپس آنے پر اس سازش کو اور بھی بڑھایا گیا اور محمد علی کو تنگ کرنے کی کوشش کی گئی۔ مثلاً جب کوئی دعوت یا جلسہ ہو تو اس میں خاص طور سے محمد علی کو نہ بلایا جائے، چھوٹی چھوٹی باتیں سرکار تک پہنچائی جاتی تھیں ترقی تنخواہ کا معاملہ بھی تاحال معلق تھا۔ محمد علی کو ہائی اسکول کے پرنسپل کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اور

۲۴۔ نواب صاحب کا جو فرمان ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء کے رام پور گزٹ میں شائع ہوا ہے اس میں تین ماہ کی رخصت منظور کی گئی۔ یہ فرمان جامعہ کے پچھلے شمارے (اکتوبر ۱۹۷۹ء) میں صفحہ ۲۴۵ پر شائع ہوا ہے۔ اعلان سے تاریخ اور سنہ غلط چھپ گئے ہیں

ساتھ ہی سررشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر بھی تھے، دورہ بھی کرنا پڑتا تھا، اسکول کا انتظام بھی۔ جبر کام کرنے میں خوش تر تھا، مگر سازشوں کے معاملہ وغیرہ کے لئے وہ نہیں بنایا گیا تھا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ رام پور کی نوکری سے سبکدوش ہو جائے اور باہر جا کر قسمت آزمائی کرے چنانچہ فروری ۱۹۰۲ء میں اس نے میرے کہنے پر رام پور سے استعفیٰ دے دیا اور میں اور وہ دونوں اس کی نوکری کی تلاش میں لگ گئے۔ ہز ہائینس نواب صاحب مرحوم اس سے اکثر اوقات ناراض ہی رہتے اور ان کو شکایت تھی کہ محمد علی نے ان کا ساتھ نہیں دیا، مگر اس کا الزام میں نے خود [illegible]۔ اپنے کندھوں پر لے لیا اور واقعہ بھی یہی تھا کہ وہ میرے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا کرتا تھا اور میری مشورت سے ہی اس نے رام کی خدمات سے کنارہ کشی اختیار کی تھی۔

فروری ۱۹۰۳ء میں وہ اور احمدی بانو میرے اور میری مرحومہ بیگم صاحبہ کے ہمراہ گئیں اور بریلی کے ضلع میں ہم سب نے ڈیروں میں دورہ کرنا شروع کیا اور بالآخر محمد علی اس وقت [تک] میرے مہمان رہے جب تک کہ ان کو بڑودہ میں جگہ مل گئی۔ تلاش روزگار کے قصے دلچسپ ہیں، میں تفصیل کے ساتھ کل لکھوں گا اور بتاؤں گا کہ قابل ہندوستان کے رہنے والے کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے[۲۵]

میں گذشتہ اشاعت میں لکھ چکا ہوں کہ کرزن کے دہلی دربار سے واپس آنے کے بعد فروری ۱۹۰۳ء میں محمد علی نے رام پور کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کی اور میرے پاس آ گئے اور اب ملازمت کی تلاش میں شملہ بھی گئے اور خطوط کے ذریعہ بھی کوششیں کیں، مگر معلوم ہوا کہ جس قدر اونچا مرتبہ تعلیم کے لحاظ سے کسی ہندوستانی کا ہوتا ہے، اسی قدر اس کی حیثیت کے مطابق روزگار ملنے میں دشواریاں ہوتی ہیں، کیونکہ مقابلہ ہندوستانی اور انگریز کا ہوتا تھا، ہندوستانی ہندوستانی میں تو شاید انصاف ہو جاتا تھا، مگر جب انگریز اور ہندوستانی کا مقابلہ آتا تھا تو غریب ہندوستانی کا کوئی چانس نہیں تھا۔

محمد علی کی سر ٹامس ریلے سے ملاقات تھی جو وائسرائے کی کونسل میں اس وقت قانونی ممبر تھے علی گڑھ کے مسلمانوں کے خاص دوست تھے۔ تھیوڈور بک، پرنسپل علی گڑھ کی بیوی کے [illegible] کی محمد علی سے ملاقات تھی، انہوں نے بالآخر جواب دے دیا کہ وائسرائے لارڈ کرزن سے گفتگو کرنے کے بعد وائسرا

---

۲۵ دسویں قسط، خلافت مورخہ ۸ مئی ۱۹۳۲ء (جلد ۱۱ نمبر [illegible]) صفحہ ۴

کی یہ خواہش معلوم ہوئی کہ لائق ہندوستانی ہندوستانی ریاستوں میں کام کریں۔

آج یہ دیکھا جاتا ہے کہ جن جن گرینٹس مافیہ انگریز جا رہے وہ لائق ہوں یا نہ ہوں ان کو ریاستوں میں بھر دیا جاتا ہے اور یوں ہندوستانیوں کی حق تلفی کی جاتی ہے۔ اس وقت یہی مصلحت تھی کہ لائق ہندوستانیوں کو ریاستوں سے باہر رکھا جائے۔ محمد علی نے اسسٹنٹ ڈائرکٹر سی آئی ڈی کے عہدے کے لئے بھی شملہ میں کوشش کی جس کی تنخواہ آٹھ سو روپے سے شروع ہوتی ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ایسے کام کے لئے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جو ایمان اور اخلاق سے آزاد ہو کر اپنے فرائض کو سرانجام دے اور جو حکم ملے اس کی تعمیل کر تا رہے۔

میو کالج اجمیر کے چیف کالج کے واسطے بھی کوشش کی لیکن وہاں کے اعلیٰ عہدے انگریزوں کے لئے تھے اور نیچے کے عہدے اس قابل نہ تھے کہ ان کو کوئی قبول کر سکے۔ فروری، مارچ، اپریل، مئی اسی تلاش میں گذرے، کبھی شملہ گئے، کبھی کلکتہ، کبھی اجمیر، سینکڑوں خطوط بھی لکھے مگر کامیابی نہ ہوئی۔

مارچ میں میرا تبادلہ بریلی سے کچھ دنوں کے لئے فیض آباد ہوا اور میں اکبرپور میں افیون کی تول کرا رہا تھا۔ وہاں کے چھوٹے ڈاک بنگلہ میں مقیم تھا، کلکتہ سے واپسی پر محمد علی مجھ سے وہاں ملے اور میرے پاس چند دن قیام کیا، اس کے بعد براہ رام پور شملہ گئے۔ میں محمد علی سے مذاق کرتا تھا کہ تلاش ملازمت میں کسی سمت ہو، مگر محمد علی جو پروگرام اپنے سفر کا مرتب کرتے تھے وہ براہ رام پور ہوتا تھا، کیونکہ میرے اور ان دونوں کے بال بچے رام پور ہی میں تھے۔ ع

بوں چلا جاتا ہوں دہلی کو بخارا ہو کر

ایک ہفتہ وہاں رہنے کے بعد، وہ کام ختم کر کے مجھ کو عارضی طور پر میں پوری جانا پڑا، جہاں افیون کی تول میں رکی سعید محمد خاں جو اب میجر سعید محمد خاں اور بھوپال میں کسٹم کمشنر ہیں، محمد علی کے خاص دوست اور عزیز تھے اور آج تک محمد علی کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ محمد علی کی ابتدائے طالب علمی کے زمانے سے بہت محبت تھی، اور آخر تک دونوں میں برابر قائم رہی، وہ افیون کی تول میں میرے اسسٹنٹ تھے اور ہم دفتر کے دو کمروں میں رہتے تھے، ایک میں ہم تینوں سوتے تھے اور ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے، رات کو کوٹھے کی چھت پر سوتے تھے اور چار بجے صبح اٹھ کر کام میں لگ جاتے تھے۔ بہت دلچسپی سے وقت گذرتا تھا، کام سے فارغ ہو کر شام کو ٹینس کے کپڑے پہن کر ہم تینوں انگریزی کلب میں جاتے تھے، جہاں میں

ممبر تھا اور وہاں سے ٹینس بلیرڈ کھیل کر رات کو ساڑھے آٹھ بجے گھر آتے تھے اور کھانا کھا کر سو جاتے تھے

جب محمد علی پہلی مرتبہ ولایت سے آ رہا تھا تو میرے فقط ایک اولاد زندہ تھی یعنی زاہد علی جو اس وقت سات ماہ کا تھا۔ محمد علی نے اس کی صورت دیکھ کر اور یہ بھی کہ ہم اس کو بہت پیار کرتے تھے اس کا نام بلیو بوائے (نیلا لڑکا) رکھ دیا جو ایک مشہور تصویر ہے شہرۂ آفاق مصور گینسبرا امی کی بنائی ہوئی اور مذاق سے یہ بھی کہتا تھا کہ یہ "کیمبرج بلیو" نہیں بلکہ "آکسفورڈ بلیو" ہے کیونکہ کیمبرج کا ہلکا نیلا آسمانی رنگ کا اور آکسفورڈ کا گہرا نیلا تھا گویا زاہد علی کی رنگت کا مذاق اڑانا منظور تھا۔ ہم سب کی محبت چونکہ اس کے ساتھ تھی محمد علی بھی اس سے پیار کرتے تھے اور زہرہ جو غالباً فروری ۱۹۰۳ کو پیدا ہوئی تھی نہایت خوبصورت تھی ہم دونوں کے دل میں یہ خواہش اسی وقت پیدا ہوئی تھی کہ زاہد اور زہرہ دونوں بڑے ہو کر ایک دوسرے سے عقد کریں اور باوجود بہت سی دشواریوں کے خدا نے ایسا ہی کیا۔ رتلام میں نوکری ختم کرنے کے بعد میرا بنارس کے ضلع اٹاوہ کا ہوگیا جہاں میں نے تمام سامان بلوا (منگوا) لیا اور میری اہلیہ مرحومہ اور محمد علی کی اہلیہ بھی معہ تمام کنبے کے وہاں آگئے اور ہم اول انہوں کے دفتر کے بنگلے میں مقیم ہوگئے اور گرمی کا موسم وہیں گذرا۔

دو مہینے بعد ہم کو بڑا بنگلہ مل گیا جس میں ایک طرف محمد علی رہنے لگے اور دوسری طرف میں اور بچے کھانا اور ملاقات کے کمرے دفتر کے کمرے سے الگ تھے۔ محمد علی نے اب وہاں الٰہ آباد یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان پاس کرنے کا ارادہ کیا۔ پانچ ماہ خوب محنت کی۔ سچدانند سنہا[۲۶] جو بعد کو بہار کونسل کے ایگزیکٹو ممبر تھے اور اسی زمانے میں الٰہ آباد میں بیرسٹری کرتے تھے اور "ہندوستان ریویو" نکالتے تھے، محمد علی سے بہت محبت رکھتے تھے، کیونکہ "ہندوستان ریویو" میں اس کے بیس انگریزی کے مضامین بہت دلچسپ نکلے تھے جس سے سارے ہندوستان میں انگریزی قابلیت کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ سنہا نے بہت سی قانونی کتابیں اس کو دی تھیں جس سے امتحان کے نئے قانون پڑھنے اور پاس کرنے میں آسانی پیدا ہوئی۔ اڑھائی ماہ کے عرصے میں امتحان دیا اور سوائے اسٹیمپ ایکٹ کے سب میں پاس ہوئے۔ تیج بہادر سپرو سے اسی زمانے کی ملاقات تھی۔ اس موقع پر بھی ایک واقعہ پیش آیا اور اٹاوہ کے بھی بہت سے واقعات قابل ذکر ہیں جو کل پیش کروں گا۔[۲۷]

---

[۲۶] پیدائش ۱۰ نومبر ۱۸۷۱ء بمقام آرہ (بہار) وفات ۶ مارچ ۱۹۵۰ء
[۲۷] گیارہویں قسط، خلافت مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۳۲ء (جلد ۱۱ نمبر ۱۰۸) صفحہ ۶

(افسوس کہ دو قسطیں، بارھویں اور تیرھویں نہ مل سکیں، اس لئے اب چودھویں قسط پیش خدمت ہے)
اسلامی تحریکوں میں محمد علی کا حصہ اس قدر کا بارہا تھا کہ ان تحریکوں اور اس کی زندگی کو ایک دوسرے سے الگ کر کے پڑھنا ناممکن ہے۔

جب ولایت سے پڑھ کر واپس آیا تو میرے پاس اٹاوہ میں مقیم تھا اسی وقت سے (علی گڑھ کے) ٹرسٹیوں کے طریقہ انتخاب میں تبدیلی کے لئے اس نے جدوجہد شروع کر دی تھی اور بالاحتیاجات ٹرسٹیوں کے وقت معینہ کے لئے ٹرسٹی ہونے کے اصول کو قوم سے منوا کر رہا۔ علی گڑھ سے بحد محبت تھی، اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے خاص تعلق تھا۔ ہر ایک دستور اساسی سالانہ میں محمد علی کا سب سے بڑا حصہ ہوتا تھا جس قدر ضروری تحریکیں پیش کی جاتی تھیں، وہ سب اس کے قلم سے نکلی ہوئی ہوتی تھیں ہر شخص اس کی خداداد قابلیت سے فائدہ اٹھاتا تھا سیکڑوں بلکہ ہزاروں میموریل گورنمنٹ اور ریاستوں کے لئے لوگوں کو مفت تیار کر کے دیئے، یہاں تک کہا سے کام کو پس پشت ڈال کر "کامریڈ" اور "ہمدرد" کے ضروری کام کو چھوڑ کر دوسروں کے کام کو جیٹ جاتا تھا۔ کوئی سال ناممکن تھا کہ کوئی اولڈ بوائز کا جلسہ ہو اور اس میں محمد علی بہت کچھ صرف کر کے شریک نہ ہوتا ہو۔ روانہ ہونے سے علی گڑھ پہنچنے تک راستے میں اولڈ بوائز دوستوں سے ملتا ہوا، ان سے باتیں کرتا ہوا، اپنی آواز کو ریل کے انجن اور گاڑی کی کھڑ کھڑاہٹ میں بلند کر کے بحث مباحثے سے لوگوں کو قائل کرتا ہوا، علی گڑھ پہونچ جاتا تھا ادھر سے میں اپنی جگہ سے آتا تھا اور ہم دونوں علی گڑھ کی پرلطف فضا میں، جس میں ہر وقت بجلی بھری رہتی تھی، ملتے تھے اور تمام پرانے اور نئے قصے دہرانے تھے۔ جلسے سے پیشتر ہی محمد علی کی آواز ریل کے مباحثوں کی نذر ہو جاتی تھی۔ ہم دونوں جب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے معاملات میں تقریریں کرنے تھے تو ہماری آواز غائب ہوتی تھی۔ طرح طرح کی دوائیاں اور گولیاں آواز کھولنے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں، کبھی لعاب پہوچا کر گلے کی آواز کو سنبھالتے تھے، ہم دونوں کے پاس اور خاص محمد علی کے پاس تو ایسی دوائیوں کا ایک خاصا ہسپتال رہا کرتا تھا، پھر بھی معمولی مباحثوں میں ہم لوگ ایسے جوش سے بولتے تھے کہ خاص موقعوں پر ہماری آواز غائب ہوتی تھی اور ہم دونوں علی الخصوص محمد علی طبیعت اور آواز پر زور ڈال کر بحث کر کے معرکہ الآرا تقریروں کو ختم کرتے تھے۔

محمد علی کو جو کوئی علی گڑھ کے علمی جلوس میں دیکھتا تھا، اس کی تقریروں کو پڑھتا یا سنتا تھا، اس کو ہرگز

یقین نہ آتا اگر وہ دیکھتا کہ ولڈ بواسٹر کے باقاعدہ جلسوں کے بعد یا بیرہ نمبر کے کمرے میں یا سرسٹ کورٹ کے کمرے میں جمع ہوتے تھے تو محمد علی انگریزی طریقے سے ناچتا تھا اور بچیوں کی طرح رقص کرتا تھا۔ بع بخال ہندو اش بخشم سمرقند وبخارا" کا نقرہ (جو مصرع زبان پر ہوتا تھا "سمرقند" کا خاص طور پر تھا) دنیا کو کسی کی طرح دکھا دکھا یا ایسی جیرگی کہ جو علی گڑھ کا پڑھا ہوا اور ہر مسلمان دیکھتا تھا (تو) وہ محمد علی کو اپنے دل میں جگہ دیتا تھا اور اگر کسی جلسے سے وہ غیر حاضر ہو تو سب کی یہی آواز تھی کہ بع" وہ محفل ویراں ہے جہاں تو نہ باشد" اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے کام کو صحیح اصولوں پر قائم کرنا اولڈ بوائز لاج کی تعمیر کی طرف سب کو متوجہ کرنا اس کی ترقی اور اس کی عزت بڑھانے میں محمد علی کی خدمات بہت وسیع تھیں۔ یہ درست ہے کہ میں عملی کام کرتا تھا، زبان اور قلم کے ذریعے دفتر میں بیٹھ کر اندرونی انتظامات کرتا تھا، مگر حرکت دینے والی قوت محمد علی ہی تھا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا وہ بانی تھا اور اس کے ہر سالانہ جلسے میں شامل ہونے کی کوشش کرتا تھا مسلم لیگ ڈھاکہ کے بانیوں میں سے تھا، نواب صاحب ڈھاکہ مرحوم محمد علی سے بہت محبت کرتے تھے اور طرح طرح کے کپڑے وغیرہ سوا کر بھیجا کرتے تھے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ وہ کپڑوں کا بہت شوقین تھا۔ عالم اسلام سے تعلقات پیدا کرنے میں تو کوئی اس کا شریک بھی نہیں ہو سکتا۔ جنگ طرابلس کے موقع پر اس نے تمام مسلمانوں کو پہلی مرتبہ ہوشیار کیا اور بلقان کی جنگ میں تو دلواسہ دار آگ میں کود پڑا اور ڈاکٹر انصاری کے مشن کو قسطنطنیہ اور جنگ بلقان میں شرکت کے لئے بھیجکر اس نے سارے عالم اسلام کو ہندوستان کا گرویدہ بنا دیا ہے سینکڑوں عمدہ کام کرنے والے مثلاً ڈاکٹر انصاری عبدالرحمان صدیقی شعیب قریشی عبدالعزیز انصاری خلیق الزماں وغیرہ پیدا کر دئے۔

مسلم یونیورسٹی کی تاریخ جب لکھی جائے گی تو اس میں بھی جہاں ہر با تمکین سرآغا خاں نواب وقارالملک مرحوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی خدمت کا ذکر آئے گا، وہاں محمد علی مرحوم کی خدمات جلیلہ کا اعتراف بھی ساتھ ہی کرنا پڑے گا۔ علی گڑھ اور علی گڑھ کے طالب علموں سے محمد علی کو ایک عشق تھا، کرکٹ کھیلنے والوں، فٹ بال اور ٹینس کے کھلاڑیوں، اچھا گانے والوں اور اچھا ایکٹ کرنے والوں سے محبت بھی جو کہ عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔ چپہ چپہ پر علی گڑھ کی زمین سے اس کو محبت تھی اور وہ زمین اس کو عزیز

یاد رکھو گے اب بھی جب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے جلسے ہوتے ہیں تو سب دوست اور عزیز پرانے اور نئے یاد کرتے ہیں، سب کی آنکھیں اس کو ڈھونڈتی ہیں، مگر وہ جیسا جیا تھا ویسا ہی مرا اور انبیا علیہم السلام کی زمین میں بیت المقدس میں حرم شریف کے اندر جو مقام بڑے بڑے بادشاہوں اور سلطانوں کو نہیں ملا۔ وہ ایک ہندوستان کے غریب اور مفلس مسلمان کو خدا نے بغیر مانگے دیدیا۔

میں اس کا ایک شعر بھی بار بار لکھ چکا ہوں اور اس وقت پھر دہرا رہا ہوں، اگرچہ اس کا موقع ہو یا نہ ہو، اس کو مقامات مقدسہ سے محبت اور ایک گونہ عشق تھا۔ جب ہم اکٹھا رہ کر حج بیت اللہ شریف کو جا رہے تھے اور عرب کا ساحل نظر آیا اور میں نے اس کو نیچے سونے سے جگا یا تو بنیان پہنے، آنکھیں ملتا ہوا نگے سر دوڑتا ہوا ڈیک پر آیا اور فی البدیہہ یہ شعر پڑھ دیا: آنسو جاری تھے، آواز بھرائی ہوئی تھی، بار بار اس شعر کو پڑھ کر خود روتا تھا اور دوسروں کو رلاتا تھا۔ ؎

ساحل وہ آ رہا ہے دیار حبیب کا   کیا پوچھنا ہے آج ہمارے نصیب کا

میں کرکٹ کے قصے، علی گڑھ کے دوست احباب کے قصے خود بھی بہت سے لکھوں گا اور چاہتا ہوں کہ پرانے دوست احباب بھی اس بارے (میں) میری مدد کریں۔ سعید محمد خاں جو بھوپال میں انسپکٹر جنرل کسٹم ہیں، ظفر عمر جو آگرہ میں سپرنٹنڈنٹ ہیں، مکرم اسلم، جو ہمارے عزیزوں سے زیادہ عزیز ہیں، تصدق شیروانی[۲۹]، خلیق الزماں[۳۰]، عبدالرحمان صدیقی[۳۱]، شعیب قریشی[۳۲]، سجاد حیدر[۳۳]، سید وزیر حسن[۳۴] وغیرہ سینکڑوں دوست اس کے افسانے، قصے اور لطیفے سنائیں گے اور محمد علی (کی) سوانح عمری لکھنے والوں کو حیرانی ہوگی کہ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔

---

۲۸ مولانا شوکت علی مرحوم کو اتنی شاندار موقعات ملیں مگر علی گڑھ نے مولانا محمد علی کے صد سالہ یوم پیدائش کے سلسلے میں کوئی قابل ذکر جلسہ تک نہیں کیا۔

۲۹ پیدائش: ۱۸۸۵ء بمقام ملوا (ضلع علی گڑھ) وفات: ۲۲ مارچ ۱۹۳۵ء

۳۰ پیدائش: ۲۵ دسمبر ۱۸۸۹ء بمقام چنار (ضلع مرزاپور) وفات ۱۸ مئی ۱۹۷۳ء بہ عمر ۸۴ سال بمقام کراچی (پاکستان)

۳۱ وفات: ۲۴ مئی ۱۹۵۳ء، کراچی

۳۲ پیدائش: ۴ ستمبر ۱۸۹۱ء جونپور۔ وفات: ۲۵ فروری ۱۹۶۲ء، کراچی

۳۳ پیدائش: ۱۸۸۰ء نہٹور (ضلع بجنور) وفات: ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء، لکھنؤ بوقت ۲ بجے شب

۳۴ پیدائش: یکم مئی ۱۸۷۲ء بمقام کالوپور (جونپور) وفات: اگست ۱۹۴۷ء

کلکتہ کے قیام میں محمد علی نے زیادہ وقت "کامریڈ" کے ذریعہ مسلمانوں کی خدمت کرنے میں صرف کیا، علی الخصوص مسلم یونیورسٹی اور طرابلس کے معاملات پر قابلیت کے ساتھ مضامین لکھے اور مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ میرا دعویٰ ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں پر جو احسان محمد علی کا ہے، وہ کبھی ادا نہیں ہو سکتا۔ اس نے قرآن پاک اور اسلامی تعلیم و تربیت کی طرف سب کو متوجہ کیا اور سب کے دلوں میں اسلام کی آگ پیدا کر دی[۵۳۶]

[افسوس کہ اس کے بعد مولانا شوکت علی مرحوم کسی وجہ سے آگے نہ لکھ سکے اور یہ دلچسپ کہانی ہمیشہ کے لئے ادھوری رہ گئی۔]

مولانا محمد علی کی تیسری برسی کے موقع پر ۴ جنوری ۱۹۳۴ء کو روزنامہ "خلافت" کا محمد علی نمبر شائع ہوا تھا، جس میں خط کی صورت میں مولانا شوکت علی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے: "بھائی کا خط بھائی کے نام"۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

"عزیزی محمد علی، السلام علیکم۔ آج بہت دنوں کے بعد، تمہاری برسی کے موقع پر تم کو خط لکھنے کے لئے فرصت نکالی ہے۔ تعمیری کام ہی نہیں کہ ٹھنڈا اور دشوار ہوتا ہے بلکہ اس کی تکمیل کے لئے سخت صبر اور بہت ہمت اور رواداری کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں آج بھی اسی کام میں لگا ہوں اور برا کہنے والوں اور اعتراض کرنے والوں کی پرواہ نہ کر کے کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ زیادہ تکلیف کی بات یہ ہے کہ بعض پرانے ساتھی اور کام کرنے والے جلد دل برداشتہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی مالی حالتیں خراب ہیں۔ ذاتی پریشانیوں کی وجہ سے مزاج اور بھی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ میں، جہاں تک میری طاقت میں ہوتا ہے، امداد دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ . . . مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری طرح ایک دن میں بھی کام کرتے کرتے، تھکے ہوتے جانور کی طرح گر کر دم دے دوں گا۔"

حاشیہ ۵۳۶ - چھبیسویں قسط، خلافت مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۳۲ء (جلد ۱۱ نمبر ۱۱۷) صفحہ ۶

محمد اعزاز الدین
تحقیق و تحشیہ: حکیم محمد حسین خاں شفا رام پوری

مولانا محمد علی پر پہلا مضمون

(جون ۱۸۹۸ء)

[مولانا محمد علی جوہر کے سفر یورپ کے انتظامات جب مکمل ہو گئے تو ان کے رام پوری دوستوں نے ایک الوداعی جلسے کا انتظام کیا جس میں کچھ مضامین پڑھے گئے اور آخر میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا، جس میں حضرت جوہر نے بھی اپنی غزل پڑھی۔ ذیل میں ایک مضمون پیش کیا جاتا ہے جو اس موقع پر پڑھا گیا تھا۔ حسب ضرورت ایک دو جگہ حاشیوں کا میں نے اضافہ کر دیا ہے شفا رام پوری]

خاندانی حالات اور ریاست کی امداد

اہل رام پور جس قدر فخر و ناز کریں وہ بجا ہے۔ اس لئے کہ رام پور کے نہایت معزز اور مشہور و معروف خاندان کا ایک ممبر اس سال علیگڑھ کالج سے بی اے پاس ہو کر ولایت کو امتحان سول سروس کے واسطے جاتا ہے۔ اس خوش قسمتی اور عزت کا رام پور کے واسطے یہ پہلا موقع ہے۔ محمد علی خاں صاحب اس عالی ہمت نیک نیت منتظم اور مدبر شخص کا پوتا ہے جس کا نام محمد علی بخش خاں صاحب بہادر مرحوم ہے جن لوگوں کی نظر سے روہیلکھنڈ کے ۱۸۵۷ء کے غدر کی تاریخ گزری ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ علی بخش خاں صاحب مرحوم کس دل و دماغ کا آدمی تھا مرحوم مغفور بعہد نواب محمد سعید خاں صاحب بہادر جنت آرام گاہ رام پور میں ملازم ہوئے اور اسی روز سے اس خاندان کا وطن رام پور ہو گیا اس بہادر اور نامور شخص نے محض اپنی حسن خدمت، وفاداری اور سیاست کی خدمت گاری سے والیان ریاست

رام پور کے حضور میں وہ عزت حاصل کی جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ نواب یوسف علی خاں صاحب بہادر فردوس مکاں کے عہد میں ۱۸۵۷ء کے پر آشوب غدر نے جنم لیا تمام روہیلکھنڈ نے برٹش گورنمنٹ کے مقابل میں ہتھیار اٹھائے۔ رام پور کے مغرب میں مراد آباد میں ایک نوابی قائم ہوئی دوسری مشرق میں بریلی میں دوسری نوابی کی بنا ڈالی گئی۔ ان دونوں نوابوں کے سیلاب نے جنوبی حصہ تک بھی تلاطم مچا دیا رام پور کے شمال میں علاقہ ترائی ہے وہاں کچھ تو بدمعاشوں نے جا بجا طوائف الملوکی قائم کی اور کچھ بریلی کے خان بہادر خان نواب کی فوج کی جماعت نے لوٹ مار شروع کر دی غرض رام پور چاروں طرف سے باغیوں سے اس طرح سے گھرا ہوا تھا کہ انگریزوں کی امداد کا ذکر کیا خود ریاست کو محفوظ رکھنا مشکل تھا رام پور میں جا بجا محمدی جھنڈے کھڑے ہوئے کچھ لوگوں نے دہلی کی کالی پہاڑی پر یہاں سے جا کر مجاہدین کے ساتھ جانیں گنوائیں۔ بہت سے آدمی بریلی اور مراد آباد چلے گئے مگر نواب فردوس مکاں کے حسن انتظام اور ان کے جاں نثار ملازم محمد علی بخش خاں کی کوشش نے خاص رام پور میں کوئی ہنگامہ نہ ہونے دیا اور نینی تال کو رسد رسانی اور نینی تال سے میرٹھ تک انگریزوں کی ڈاک رسانی کا علی بخش خاں مرحوم نے ایسا انتظام رکھا کہ بعد ہنگامہ غدر کے گورنمنٹ انگریزی نے فتح گڑھ کے دربار میں خلعت اور پانچ ہزار روپے سالانہ آمدنی کی جاگیر عطا کی اور نواب فردوس مکاں نے بھی وہ قدر شناسی کی کہ کچھ علاقہ بطور جاگیر عطا کیا اور ان کی اولاد کے واسطے رام پور کو ہمیشہ کے واسطے وطن بنا دیا۔ علی بخش صاحب کے چار فرزند رشید ہوئے۔ خلف اکبر جناب محمد اصغر علی خاں صاحب، فرزند دوم جناب محمد محمود علی خاں صاحب، فرزند سوم جناب حافظ محمد مبارک علی خاں صاحب شہید، فرزند چہارم محمد عبد العلی خاں صاحب مرحوم۔

اللہ کے فضل و کرم سے اول کے دونوں صاحبزادے زندہ سلامت موجود ہیں اور اس خاندان کے یہی دونوں صاحب مکھیا ہیں فرزند سوم جنرل عظیم الدین خاں کے ساتھ شہید ہوئے اور فرزند چہارم سولہ برس ہوئے انتقال فرما گئے۔

محمد علی خاں صاحب مسافر ولایت انہیں محمد عبد العلی خاں صاحب مرحوم کے چشم و چراغ ہیں۔ دو سال ذیشان کے برادر اکبر جناب محمد شوکت علی خاں صاحب نے علی گڑھ کالج میں بی۔ اے پاس کیا اور اب وہ اپنی ذاتی لیاقت سے بریلی میں اسسٹنٹ اوپیم ایجنٹ ہیں اور دو سو روپے ماہوار تنخواہ پاتے ہیں شوکت علی خاں صاحب کی ہمت اور کوشش پر ہزار آفرین ہے کہ ایسے بھائی کی بی۔ اے کی کامیابی پر اپنے محسن آقا عالمحسا

نواب محمد حامد علی خاں صاحب بہادر خلد اللہ ملکہ کے* ۔ نیز درخواست ہے کہ محمد علی خاں کو ولایت کو بغرض امتحان سول سروس بھیجنا چاہتا ہوں اس میں حضور بھی اپنے فدوی نمک خواروں کی امداد فرمائیں اللہ تعالیٰ ہمارے حضور پرنور کی عمر و دولت میں برکت فرمائے ۔ باوجودیکہ تین سال سے قحط سالی کی وجہ سے ریاست کو بڑا نقصان ہو رہا ہے ، حضور نے بلا کسی سفارش اور سعی کے سینکڑوں محتاجوں کو رقوم مال گذاری اس تین سال میں معاف فرمائیں ، محتاج خانے جاری کئے ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کوئی امداد کرنا کس قدر مشکل کام تھا مگر ہمارے آقا کو تعلیم سے خاص دلچسپی ہے اور گھرانے فدوی جاں نثاروں کے ساتھ الفت بھی بے حد ہے اس لئے فوراً سرکار نے اس ارادہ کو نہایت پسند فرما کر مبلغ آٹھ ہزار روپیہ ایک ہزار سالانہ کی ادائے گی کی قسط پر عطا فرمائے ۔ اس شاہی فیاضی پر محمد علی حسن خاں صاحب مرحوم کے خاندان کو خصوصاً اور تمام اہل رام پور کو عموماً جو کچھ مسرت ہوئی وہ قابل بیان نہیں ہے آج تک اس خاندان نے صرف رام پور میں ایک بہت بیش قیمت ترقی حاصل کی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ اب گورنمنٹ میں بھی پورے عروج کے حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آیا ۔ رام پور میں معزز اہلکاروں اور رعایا میں ضرور کچھ نہ کچھ مناقشہ رہا ۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اس وقت تک عموماً تمام اہل رام پور کو اس خاندان کے ساتھ خاص الفت ہے ۔ یہ ایک مشہور بات ہے کہ اس گھرانے سے کسی شخص کو کبھی سوائے فائدہ کے ایذا نہیں ہوئی ۔ انگریزی کی تحریروں میں جب کسی انگریز نے محمد علی حسن خاں صاحب مرحوم کی نسبت کچھ لکھا تو اس کے ساتھ یہ لفظ بھی ضرور استعمال کیا ہے "دی رائٹ ہینڈ آف ہز ہائینس" (The right hand of His Highness)

جناب محمد اصغر علی خاں صاحب اس پایہ کے آدمی ہیں کہ جس وقت نواب کلب علی خاں صاحب بہادر خلد آشیاں حرمین شریفین کو جانے لگے تو ریاست کی نگرانی میں بذریعہ تحریری روبکار کے ان کو بھی مقرر کیا

جناب محمد محمود علی خاں صاحب کی قدر کوئی اہل عرب سے دریافت کرے جن کے لئے آجتک حرمین شریفین میں دعائیں مانگی جاتی ہیں ۔ عربوں کی تعلیم عمارت کی افسری ، مصاحب ، خاص رسالداری ، اور سفارت ریاست ہائے بیرونی ان سے متعلق تھی ، اب مہتمم پرچہ اخبار ریاست رام پور ہیں ۔

اس خاندان کے بچے بچے کا یہ ماٹو ہے : فاقہ سے مرنا بہتر ہے بہ نسبت رشوت لینے کے ، کوئی کلمہ آقا کی خیر خواہی سے خالی نہ ہو ، کسی متنفس کو ایذا نہ پہنچے ۔ ان لوگوں کی خوبیاں رام پور میں آن کر معلوم

* مولانا شوکت علی مرحوم کے مضمون میں ، صفحہ ۲۸ پر قرض کی یہ رقم ، ہزار درج ہے (اعظمی)

ہوتی ہیں۔ محمد علی خاں کا یہ سو اٹھارواں سال ہے وہ ۱۸ رجون ۱۸۹۸ء کو پی۔ اینڈ کمپنی کے اورینٹل نامی پانی کے جہاز پر سوار ہو کر ولایت کو روانہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو کامیاب بخیریت ہندوستان میں لائے تاکہ وہ اپنی کوششوں سے ملک اور اہل قوم کو اور اپنے خاندان کے ممبروں کو فائدہ پہنچائیں آمین ثم آمین

حواشی

لہ شیخ علی بخش خاں بہادر۔ نجیب الطرفین شیخ کلالی تھے ۱۲۵۹ھ ۱۸۴۳ء میں ولی عہد رام پور یوسف علی خاں کے خانساماں کی حیثیت سے رام پور میں آئے چند سال میں دو سال پر رام پور کے سب سے بڑا معتمد خاص اور راز داں ہوگئے اور اپنے پورے خاندان کو رام پور میں بلا لیا یہ خاندان یہاں خوب پھلا پھولا۔ اس خاندان نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ان کا محلہ الگ تھا مسجد الگ تھی۔ قبرستان الگ تھا شادی بیاہ بھی اپنے ہی خاندان میں کیا کرتے تھے زیادہ تر لوگ ریاست میں اعلیٰ عہدوں پر ملازم اور پڑھے لکھے تھے افغانان رام پور میں "سید" اور "خان" کے علاوہ دوسری برادریوں کو سماجی حیثیت سے کمتر خیال کیا جاتا تھا۔ اس بنا پر رؤسا نے جب مساوات کا اعلان کیا تو یہ لوگ "خان" کہلانے لگے (کاملان رام پور۔ بزم غالب مکاتیب غالب راقم کا مضمون حکیم شفیق الرحمن رام پوری ماہنامہ آج کل دہلی اگست ۱۹۷۵ء)

ٹلہ یہاں سادی مصاحب سے علی بخش خاں کے چار فرزند ظاہر کیے گئے ہیں دراصل ان کے پانچ لڑکے تھے سب سے بڑے لڑکے محمد اکبر علی خاں اکبر پیدائش ۱۸۴۳ء وفات ۱۸۵۰ء تھے ان کی موت ایک معمہ ہے جس کے بارے میں حافظ احمد علی خاں شوق لکھتے ہیں ان کی موت کے متعلق ایک بڑا راز ہے جن کو معلوم ہے وہ اشارہ کر سکتے ہیں کہ ایسے وفادار نوکر بھی دنیا میں ہوتے ہیں" (کاملان رام پور صفحہ ۱۵)

سٹہ امیر مینائی لکھتے ہیں ۱۹ (انیس) برس کے سن میں ہیضہ کر کے قضا کی۔

(انتخاب یادگار صفحہ ۲۹)

ضیاء الرحمٰن بچھرایونی

مولانا محمد علی مرحوم

۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء کو محمد علی پیدا ہوئے۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ غلام ملک کا یہ سپوت مستقبل میں لوگوں کو آزادی کا نغمہ سنائے گا اور اپنی شعلہ بیانی اور دھواں دار تقریروں سے ہندوستانیوں کے سینوں میں آزادی کی آگ لگا دے گا کسے خبر تھی کہ قدرت نے اسے آزادی کا پیغام بر اور حریت کا فرشتہ بنا کر بھیجا ہے تاکہ وہ غلاموں کو آزادی کا مژدہ سنائے اور اپنی جرأت، ہمت اور شجاعت کی اطراف عالم میں دھوم مچا دے۔ مولانا محمد علی نے ابھی عمر کے دو سال بھی پورے نہ کئے تھے کہ شفیق باپ نے ۱۸۸۰ء میں تقریباً ۳۲ سال کی عمر میں ہیضے کی وبا میں اچانک انتقال کیا۔ اس وقت محمد علی کی والدہ کی عمر ستائیس (۲۷) برس کی تھی۔ مولانا محمد علی اپنی خود نوشت سوانح حیات میں فرماتے ہیں، "میری والدہ کی ستائیس (۲۷) برس کی عمر تھی کہ چند گھنٹے کی بیماری کے بعد ہمارے والد آناً فاناً ہیضہ کی نذر ہوگئے اور وہ بیوہ ہوگئیں ایک بیوہ کیلئے اس سے زیادہ حوصلہ شکن اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ جوانی کے عالم میں اس کا شوہر دائمی مفارقت اختیار کرے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا بار بھی اس کے سر چھوڑ جائے۔ مگر بی اماں معمولی عورت نہ تھیں جو شوہر کی مفارقت میں بچوں کی تربیت کو بھول جائیں قدرت کی طرف سے انہیں وہ دل ملا تھا جس میں قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا تھا انھوں نے اپنے بچوں کی دینی تربیت اور اعلیٰ صفات پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان ہی کی تربیت کا یہ اثر تھا جس نے ان کے سب سے چھوٹے لڑکے محمد علی کو "مولانا محمد علی" بنا دیا۔ مولانا محمد علی کو بی اماں سے بے حد محبت تھی، دل و جان سے فدا تھے ایک جگہ لکھتے ہیں، "میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے اس مرحومہ کے ذریعہ پہنچایا ہے والد مرحوم کی وفات کے دن سے جو گھر کی بوڑھی ماماؤں کا سا سادہ اور سفید لباس پہنا اور ان ہی کی طرح روکھی سوکھی کھا کر گذر کی۔ مگر ہمارا کوئی سوال رد نہیں کیا اور ہمیں اس عیش و آرام سے رکھا، پالا اور بڑا کیا جو ہمارے ان چچاؤں کی اولاد کے عیش و آرام سے کسی طرح کم نہ تھا بلکہ کچھ زائد ہی

تھا جو بفضلہ تعالیٰ والد مرحوم کی وفات کے وقت زندہ و سلامت تھے اور جن کی جائداد پر قرضہ کا وہ بوجھ نہ تھا جو ہمارے ترکے پر تھا جو ریاست میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے"۔ ابتدائی تعلیم کیلئے پرائمری اسکول رامپور میں داخل ہوئے اس کے کچھ عرصے کے بعد ۱۸۸۸ء میں اپنے بھائی شوکت علی کے ساتھ بریلی چلے گئے۔ وہاں سے ہائی اسکول کرنے کے بعد ۱۸۹۰ء میں علی گڑھ پہنچے۔

علی گڑھ کالج میں داخلہ بھی ان کی وسیع اور بالغ نظری کی دلیل تھی ورنہ کالج اس وقت تنگ نظر اور قدامت پسند مسلمانوں کے نزدیک کفر و الحاد کا مرکز تھا۔ محمد علی نے اس درس گاہ میں اپنی ذہانت اور خداداد استعداد سے بہت کچھ ترقی کی اور اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے ہر دل عزیز ہوگئے۔ کالج میں ان کی ذہانت اور ذکاوت کی دھوم تھی اپنی ملنساری اور خوش خلقی کی وجہ سے وہ بڑے ہر دل عزیز تھے اسی زمانہ میں تحریر و تقریر میں بھی امتیازی شان حاصل کر لی تھی اور سب لوگ ان کی قابلیت اور تحریر و تقریر کی مہارت کے معترف تھے اپنے زمانے کے سبھی ممتاز طالب علموں سے ان کے خصوصی تعلقات تھے سید سجاد حیدر یلدرم، میر محفوظ علی، ظفر علی خاں، حسرت موہانی وغیرہ وہ حضرات تھے جو بعد کو سیاست اور ادب و شاعری کے آسمان کے درخشندہ ستارے ہوئے ان ہی لوگوں نے ماہوار مشاعرے جو دیں رات میں منعقد کئے گریکو تھیٹس لان پر چودھویں رات کی چاندنی میں مشاعرے ہوتے تھے، اور صرف ایک شمع پڑھنے والے شاعر کے سامنے روشن ہوتی تھی۔ ان مشاعروں میں مولانا محمد علی نے جو غزلیں پڑھیں وہ ان کے دیوان میں ابتدائی کلام کی حیثیت سے درج ہیں

کھیل کے میدان میں مولانا شوکت علی کے بعد مولانا محمد علی بھی کچھ کم مشہور نہیں تھے۔ علی گڑھ میگزین میں برابر مضامین لکھتے رہے۔ Siddon's Union Club (طلبائے کالج کی یونین) میں ان کی تقریریں بڑی دلچسپ اور جوشیلی ہوتی تھیں۔ بی اے کرنے کے بعد رامپور پہنچے۔ وہاں نواب محمد اسحاق خاں صاحب مدارالمہام کی کوششوں اور اعانت سے مولانا محمد علی نے سول سروس کا امتحان دینے کے لئے آکسفورڈ کا سفر ۱۸۹۸ء میں کیا، مگر بدقسمتی سے امتحان پاس نہ کر سکے۔ دوسرا سفر انگلستان ۱۹۰۲ء میں ہوا اور تاریخ میں بی اے آنرز بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ان کے ساتھیوں میں مسٹر مونٹیگو (Montego) بھی تھے جو بعد کو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا ہوئے۔

اس سارے عرصے میں ان کا مطالعہ بھی وسیع رہا۔ ان کو یورپ امریکہ وغیرہ کی تاریخ پر بڑا عبور

حاصل تھا۔ مختلف ممالک کے آئین پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ انگریزی ادب سے خاص مناسبت تھی اور انگلستان کے ہر حصے اور صوبے کی زبان اور لہجے میں جو فرق ہے اس پر وہ پوری قدرت رکھتے تھے۔ انگریزی شاعری کے بڑے ماہر تھے۔ حافظے کی غیر معمولی قوت کی بدولت انھیں مختلف اصناف سخن کے نمونے بر زبان یاد تھے۔ تحریر میں میکالے کی تقلید انھوں نے شروع ہی سے اختیار کرلی تھی اور آخر میں اسی طرز تحریر کے بڑے ماہر ہوگئے تھے۔ اپنے دور کے انگریزی کے بڑے اعلیٰ مقرر اور نثر نگار تھے۔ اس نوعمری میں بھی انگلستان کے قیام کے دوران ان کا دامن کبھی آلودۂ عصیان نہیں ہوا نماز اور روزے کے سخت پابند رہے۔

مجھے مولانا محمد علی سے ملاقات کا شرف سب سے پہلے رام پور میں ۱۹۰۶ء میں حاصل ہوا جبکہ میری عمر دس برس کی تھی۔ اس وقت وہ مسٹر محمد علی بی۔ اے (آکسن) تھے۔ ان کی کاسمیٹکس (Casmetics) سے بنی ہوئی بھاری مونچھیں، منڈی ہوئی ڈاڑھی، بہت بڑھیا سوٹ یا اعلیٰ قسم کی شیروانی چوڑی دار پاجامہ اور ترکی ٹوپی اس صورت اور لباس میں وہ بڑے بڑے مجمعوں میں نمایاں اور ممتاز نظر آتے تھے پھر نومسلمانوں میں اس کا عام فیشن ہوگیا اور یہ لباس آزادیِ خیال کا ایک نشان بن گیا۔

ولایت سے واپسی کے بعد نواب صاحب رام پور نے ۱۹۰۲ء میں انھیں اسٹیٹ ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا تھا۔ مولانا محمد علی نے اس زمانہ میں اس اسکول کے پہلے درجہ کا نام Infant Class رکھا تھا کچھ عرصہ کے بعد نواب رام پور کے چیف ایجوکیشن آفیسر مقرر ہوئے اور بہت سی تعلیمی اصلاحات کیں ۱۹۰۶ء میں مولانا کا تعلق بڑودہ اسٹیٹ سے ہوگیا تھا۔ اسی سال مولانا بڑودہ سے چھٹی لیکر رام پور تشریف لائے یہاں نواب صاحب کا جشن سالگرہ منایا جانے والا تھا، ہر جگہ اس کی تیاریاں ہورہی تھیں ان دنوں رام پور اسٹیٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر احمد حسن صاحب بی۔ اے تھے محلہ کسرول مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ احمد حسن صاحب مولانا محمد علی کے ساتھی اور علی گڑھ کے کلاس فیلو تھے یہ دونوں بھی طالب علمی کے زمانہ میں ایک انگریزی ڈرامے میں شریک تھے جو بہت مقبول ہوا تھا مولانا محمد علی نے تجویز پیش کی کہ اسی ڈرامے کو جشن سالگرہ کے موقع پر دوبارہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ اسکول کے چند بچوں کا انتخاب ہوا۔ منتخب طلباء میں میرے بڑے بھائی مولوی نورالرحمن صاحب مرحوم اور میں بھی شامل تھا۔ اس وقت مولانا محمد علی سے اپنے عزیز رشتی احمد علی صاحب شوق کے دولت کدہ پر مقیم تھے۔ یہ مکان لنگر خانہ کی گلی میں تھا۔ طلباء سے کہا گیا ۔

وہ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے صبح منشی احمد علی صاحب شوق کے گھر پہنچ جائیں اگر مولانا محمد علی بنفس نفیس ڈرامے کی ریہرسل کرا سکیں۔ چنانچہ ہم سب ساتھی بڑے شوق سے وہاں پہنچ گئے آٹھ بج چکے تھے ملازم نے بتایا کہ "صاحب ابھی بیدار نہیں ہوئے ہیں۔" ہمیں وہاں بیٹھ کر تھوڑا انتظار کرنا پڑا تھوڑی ہی دیر میں مولانا نائٹ سوٹ میں برآمد ہوئے، آنکھوں میں خمار، مونچھیں جو بڑی گھنی تھیں ایسے لگی ہوئی تھیں الجھی، انہوں نے آتے ہی معذرت کی کہ "آپ لوگوں کو بڑا انتظار کرنا پڑا" اس کے فوراً بعد ریہرسل شروع ہو گئی۔

دی کنگ اینڈ دی میلر (The King and the Miller) ایک چھوٹا سا انگریزی ڈرامہ تھا، جس میں بادشاہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر جنگل میں اکیلا رہ جاتا ہے اور وہاں کسی جانور پر فائر کرتا ہے فائر کی آواز سن کر جنگل کا محافظ آ پہنچتا ہے اور فوراً سوال کرتا ہے کہ فائر کس نے کیا ہے۔ اس نے بادشاہ کو کبھی دیکھا نہ تھا اس لئے وہ پہچان نہ سکا۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ بادشاہ کے آدمی وہاں پہنچ گئے اور آداب بجا لائے تب جنگل کے محافظ کو پتہ چلا کہ وہ اعلیٰ حضرت ہیں۔ ریہرسل ہو رہا تھا اور بادشاہ کو فائر کرنا تھا کہ پیچھے پٹاخہ چھوڑا گیا۔ وہ صاحبزادے جو بادشاہ بنے تھے پٹاخہ کی آواز سن کر ڈر گئے مولانا نے ڈانٹ کر کہا کہ "بادشاہ کبھی ڈرتے نہیں ہیں" اس کے بعد کئی مرتبہ پٹاخے چھوڑے گئے تاکہ ان صاحبزادے کا ڈر نکل جائے اس ڈرامہ کا ریہرسل جاری ہی تھا کہ ایک منشی جی حاضر ہوئے اور جھک کر فرشی سلام کیا۔ ان کے پیچھے ایک کہار صاحب کے سر پر بڑا سا تھال تھا اور اس میں بہت سی بالوشاہیاں جو ٹی ڈار لگی ہوئی تھیں، تھال خوان پوش سے ڈھکا ہوا تھا وہ تھال مولانا کو پیش کیا گیا ہوا۔ بڑی بے نیازی سے ایک جانی بہر کی طرف انگلی سے کا اشارہ کیا اور معلوم کیا کہ "کہاں سے لائے ہو؟" معلوم ہوا کہ یہ مٹھائی شوق صاحب کے لئے فلاں ساہو صاحب نے اپنے یہاں کی کسی تقریب کے سلسلے میں بھیجی ہے مولانا محمد علی نے فرمایا کہ یہ مٹھائی شوق صاحب کو بھیج جائے گی اور ساہو صاحب سے صاحب کی طرف سے مبارک باد کہہ دیجئے گا۔ منشی جی اور کہار چلے گئے۔ مولانا نے انتظار کے بعد کہ منشی جی پھاٹک سے باہر چلے جائیں، خوان پوش تھال پر سے اٹھایا اور لڑکوں کو صلائے عام دیدی لڑکے جھپٹے مولانا نے ڈانٹ کر حکم دیا کہ یہیں اسی وقت ختم کرنا ہے۔ اور پھر خود بڑے بڑے ہاتھ مارنا شروع کئے۔ جس کسی کو ستر یا باد نکھے اسی پر رقاصہ کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ذرا سی دیر میں ساہو صاحب کا تھال صاف ہو چکا تھا، تھوڑی دیر کے بعد منشی احمد علی صاحب شوق ادھر آ نکلے مولانا محمد علی نے ان سے

کہا کہ یہ تھال ملاں ساہو صاحب نے آپ کو بھیجا تھا اور اس میں دو بڑی بالوشاہیاں تھیں جو انھوں نے صاف کر دیں۔ شوکت صاحب ہنستے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔

یہ منظر ابھی تک میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس پہلی ملاقات میں مسٹر محمد علی بی اے آکسن سے جو تعلق ایمان خلوص اس وقت پیدا ہوا تھا وہ برابر بڑھتا ہی رہا۔ ترک موالات اور خلافت کے زمانے میں سینکڑوں لیڈروں کی تقریریں سنیں، بڑے بڑے مجمعوں کو دیکھا، بہت سے علما، مسند ارشاد پر جلوہ افروز ہوئے لیکن جو ہارٹ اور قلبی تعلق مسٹر محمد علی اور بعد میں الحاج مولانا محمد علی خادم کعبہ سے پیدا ہوا اس کا عشر عشیر بھی کہیں دوسری جگہ پیدا نہیں ہوا یہ وہ خلوص اور بے ریا شفقت کا اثر تھا جو ہر کہ ومہ پر یکساں تھا اور ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ ان کا کرم خاص صرف میری ہی جانب ہے اسی لئے ان کی تقریر سن کر کہہ اٹھتا تھا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس ملاقات کے بعد مولانا محمد علی نے ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے "کامریڈ" نکالا اور پھر بہت جلد وہ ہندوستانی سیاست پر چھا گئے۔ ان کے مضامین بہت مقبول ہوئے اور کامریڈ نے ہندوستانی اخباروں میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ پھر "ہمدرد" جاری ہوا جس میں قاضی عبدالغفار، مولوی محفوظ علی بدایونی، ہاشمی فرید آبادی، عبدالماجد دریابادی[1] وغیرہ مولانا کے رفیق رہے۔

۲۲ر اپریل ۱۹۱۵ء کو رام پور میں مولانا محمد علی کو نظر بند کر دیا گیا اس کے بعد مئی ۱۵ء میں مہرولی (دہلی) بھیجے گئے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد لینسڈاؤن (یوپی) میں منتقل کر دئے گئے وہاں سے چھندواڑہ (سی پی) اور آخر میں بیتول جیل (سی پی) میں رہے وہاں سے ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہائی ملی۔

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی "ہمدرد" کے مستقل اسٹاف میں باقاعدہ کبھی شامل نہیں رہے مضامین اور مشوروں سے مدد ضرور کرتے رہے بقول مولانا دریابادی: "ایسا وقت جتنا سچ کے لئے صرف کرتا اس سے کچھ زیادہ ہی "ہمدرد" کے لئے بھی نکالتا اور دریاباد کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھے بیٹھے جتنی بھی خدمت ممکن ہوتی اپنی بساط کے لائق دونوں کی کرتا رہتا ہمدرد کے لئے مستقل مضامین الگ لکھ کر بھیجتا رہتا، ہر پرچے کے لئے قرآن مجید کی ایک آیت مع تشریحی ترجمہ کے دیتا اور "سچ" کے متعدد مضامین "ہمدرد" خود بھی اپنے ہاں نقل کرتا رہتا" (محمد علی - ذاتی ڈائری کے چند ورق حصہ اول صفحہ ۲۸۴) مگر جب مولانا محمد علی ۱۹۲۸ء میں بغرض علاج یورپ کے لئے روانہ ہوئے تو ۲ر مئی سے "ہمدرد" کی ادارت میں تبدیلی آ گئی، مولانا دریابادی اس کے نگراں مقرر ہوئے۔ مولانا محمد علی کے بھانجے سید محمد جعفری اس کے ایڈیٹر۔ (لطیف اعظمی)

۱۹۱۹ء کو بیتول جیل سے فوری رہائی کے بعد وہ امرتسر کے آل انڈیا کانگریس کے اجلاس میں پہنچے اور وہیں ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ وہ عجیب و غریب دور تھا کہ آزادی کا مطالبہ کانگریس بھی کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ لیکن مولانا حسرت موہانی اور علی برادران آزادی کامل سے کم کسی طرح منظور کرنے پر تیار نہ تھے چنانچہ مکمل آزادیٔ وطن کا ریزولیوشن مولانا حسرت موہانی نے پیش کیا اور وہ منظور ہوا علی برادران کا مکمل تعاون گاندھی جی کو حاصل ہو گیا۔ مولانا شوکت علی کانگریس کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے اور ان کی غیر معمولی تصرف عملی اور انتظامی اہلیت سے سارے ہندوستان کے چپہ چپہ میں کانگریس کمیٹیاں قائم ہوئیں لاکھوں آدمی چار آنے کا چندہ دے کر کانگریس کے ممبر بن گئے ہر ہر ضلع میں مقامی الیکشن ہوئے تھے اور کانگریس کے عہدیدار مقرر کئے جانے تھے۔

۹، ۱۰، ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مرادآباد میں یو پی پولیٹیکل کانفرنس مہاراجہ تھیٹر اسٹیشن روڈ پر (جو آج سروج سنیما کے نام سے مشہور ہے) اجلاس ہوتے۔ اس میں گیارہ سو ڈیلیگیٹ شریک جلسہ تھے۔ تعداد آخر تک بڑھتی ہی رہی جو ہزار سے متجاوز تھی ۸ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو بہت شاندار جلوس نکالا گیا اور ۹ اکتوبر کو صبح دوبارہ جلوس نکالا جس میں مہاتما گاندھی شریک تھے بارہ بجے دوپہر سے چار بجے شام تک جلسہ جاری رہا۔ اس جلسہ میں مہاتما گاندھی، مسٹر محمد علی، شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سندر لال جی، موتی لال نہرو، مدن موہن مالوی، جواہر لال نہرو، سی آر داس، لالہ لاجپت رائے اور بہت سے دوسرے لیڈروں نے شرکت کی۔ جلسے بہت اہم تھے شری بھگوان داس صدر تھے گاندھی جی کے ترک موالات کا ریزولیوشن پاس ہوا دونوں پارٹیوں کی طرف سے جوشیلی تقریریں ہوئیں دو دن تک بڑی رسہ کشی ہوئی اس کانفرنس کی دور دور شہرت ہوگئی تھی۔

سیٹھ موتی لال نہرو، پنڈت مالویہ، سی آر داس، لالہ لاجپت رائے وغیرہ حکومت کے خلاف نرم رویہ کے حامی تھے گاندھی جی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، جواہر لال نہرو وغیرہ حکومت کے خلاف سخت سے سخت ریزولیشن پیش کرنے اور جنگ آزادی میں انگریز برٹش کو ڈپٹنے پر آمادہ تھے۔ لطف اس وقت آتا تھا جب موتی لال نہرو ترک موالات کے ریزولیشن کے خلاف مدلل تقریر کرتے تھے اور فوراً ہی جواہر لال نہرو جو اس وقت الہ آباد کے نوجوان بیرسٹر تھے۔ موتی لال نہرو کے خلاف بولنا شروع کرتے تھے اس طرح نرم گرم لیڈروں میں بڑے جوش و خروش کا مباحثہ جاری رہتا۔ مجمع اس بلا کا تھا کہ ہال میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی اسی طرح ہال کے باہر بھی بے انتہا مجمع ہو گیا تھا۔ گاندھی جی اور محمد علی باری باری باہر جاتے تھے اور مجمع کو پرسکون رہنے کی تاکید کرتے تھے اسی ریزولیشن میں انگریزی مصنوعات اور کپڑوں وغیرہ کے

بائیکاٹ کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ مولانا محمد علی ڈائس پر بیٹھے تھے کہ ان کی نظر ایک رام پور کے عزیز
دوست پر پڑی، جو مجمع میں بیٹھے تقریریں سن رہے تھے چونکہ مولانا محمد علی کو رام پور میں داخل ہونے کی
اجازت نہیں تھی اس لئے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مولانا سے ملنا بھی چاہتے تھے۔ یہ عزیز چوڑی دار
پاجامہ، شبنم کا کرتا اور کبھی حامدانی کا سفید انگرکھا پہنے تھے۔ مولانا محمد علی انہیں دیکھتے ہی اسٹیج سے اٹھ کر
ان کے پاس آئے اور ان سے بغل گیر ہو گئے بہت جوش و خروش سے بوس و کنار شروع ہو گیا اور اسی حالت
میں مولانا محمد علی کا ہاتھ ان کے گریبان پر پڑا اور ان کا کرتہ پھاڑنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ان کا کرتہ اور
انگرکھا دونوں پھٹ کر نیچے گر گئے اور ان کا سینہ عریاں ہو گیا غصہ صرف اس پر تھا کہ یہ نہیں ولایتی کپڑے کیوں
پہن رہے ہیں اور ہاتھ کا کتا سا موٹا کھدر کیوں استعمال نہیں کرتے۔ یہ منظر آنے والے انقلاب کا پیش خیمہ
تھے جس نے ترک موالات، مکمل آزادی اور ہندوستان چھوڑو کے نعرے اختیار کئے۔ اسی کانفرنس کی
شرکت کے لئے علی گڑھ کالج سے چند طلباء آئے جن میں شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب اور ڈاکٹر ستار الحق صاحب
خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ انہوں نے مولانا محمد علی سے ملاقات کی اور یہ درخواست کی کہ ترک موالات کی تحریک
علی گڑھ سے شروع کی جائے یونیورسٹی کے طلباء اس میں شریک ہوں گے اور تمام ہندوستان میں
برطانوی حکومت کے خلاف مظاہرے کریں گے۔ مولانا محمد علی خود دل سے چاہتے تھے کہ یہ تحریک علی گڑھ
سے شروع ہو لیکن انہیں ڈر تھا کہ اگر ان کی آواز پر علی گڑھ کے طلباء نے لبیک نہ کہا تو بڑی بھد ہو گی۔
ان طلباء کے اصرار اور یقین دلانے پر وہ گاندھی جی کو علی گڑھ لانے کے لئے آمادہ ہو گئے طلباء کا وفد علی گڑھ
واپس گیا اور وہاں اعلان کیا کہ گاندھی جی کے ساتھ مولانا آنے والے ہیں جلسہ کی تیاریاں کی گئیں اور یونین
میں گاندھی جی، مولانا محمد علی، شوکت علی اور سیہ دلو کی تقریریں ہوئیں جو بے حد کامیاب اور مقبول ہوئیں یہ
حضرات واپس چلے گئے اس کے بعد یونین کا دوبارہ جلسہ ہوا اور تھوڑے سے اختلاف کے بعد مہاتما گاندھی
اور مولانا محمد علی کی مجوزہ تحریک کی موافقت میں قرارداد منظور ہو گئی اس سب تحریک سے ڈاکٹر ضیاء الدین
صاحب کو شدید اختلاف تھا لیکن طلباء کے جوش اور مولانا محمد علی کی شخصیت کی تابانی کے آگے
ان کی تمام رکاوٹیں ماند تھیں۔ چنانچہ ایک نیشنل یونیورسٹی کا خاکہ تیار کیا گیا تاکہ وہ طلباء جو علی گڑھ
کالج سے کنارہ کش ہونا چاہتے ہیں یا جو اس تحریک سے متاثر ہو جانے کی وجہ سے نکال دیئے جائیں
گے، ان کی تعلیم اور تربیت کا انتظام کر سکے۔ مقصد یہ تھا کہ طلباء اچھے ہندوستانی اور سچے مسلمان بنیں اور

تعلیم کی زبان مادری ہو۔

مولانا محمد علی یہ چاہتے تھے کہ نیشنل یونیورسٹی کا افتتاح شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں آئے۔ مولانا محمود حسن اس وقت بیمار تھے اور ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کے زیر علاج تھے اسی عالم میں مولانا محمد علی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نیشنل یونیورسٹی کا خاکہ پیش کیا اور اس کے افتتاح کے لئے درخواست کی ہر چند کہ مولانا شدید بیمار تھے اور معالج ہرگز نہ چاہتے تھے کہ یہ ذرا بھی حرکت کریں لیکن مولانا نے اسی کیفیت میں علی گڑھ جانا طے کر دیا اور فرمایا کہ اگر میرے کسی عمل سے انگریزی حکومت کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے اس پر ضرور عمل کروں گا اور اگر میں راستے میں مر جاؤں تو میرا جنازہ وہاں لے جاکر رکھ دینا چنانچہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مولانا شیخ الہند اسٹریچر پر علی گڑھ تشریف لائے اور یونیورسٹی کی مسجد میں تخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ مسجد طلباء سے بھری ہوئی تھی مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے شیخ الہند کا خطبہ پڑھ کر سنایا اور مولانا محمد علی نے انتہائی عالمانہ۔ اور جامع تقریر کی اور نئی یونیورسٹی کا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قیام عمل میں آیا۔

حکیم اجمل خاں صاحب امیر جامعہ، مولانا محمد علی پرنسپل اور مولانا ابوالکلام آزاد صاحب ڈین (ناظم دینیات) مقرر ہوئے۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر ضیاء الدین نے تمام طلباء کے سرپرستوں کو بلانے کیلئے تار بھیجے تاکہ وہ آکر طلباء کو سمجھائیں یا اپنے ساتھ واپس لے جائیں۔ بیشتر سرپرست طلباء کے احتجاج سے سخت نالاں تھے لیکن طلباء کسی قیمت پر ان کی سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بالآخر ایک مسلح پولس کے ذریعہ طلباء کو ہوسٹل سے نکال دیا گیا۔ مولانا محمد علی نے چند کوٹھیوں اور خیموں کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا چنانچہ علی گڑھ سے نکالے ہوئے طلباء کا جلوس مولانا محمد علی کی قیادت میں لال ڈگی پہنچ گیا اور وہاں فروکش ہو گیا۔ ان ہی خیموں اور شامیانوں میں بورڈنگ ہاؤس اور ڈائننگ ہال وغیرہ بنائے گئے اور کلاس باضابطہ شروع ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا محمد علی اور بعد میں مولانا سورتی، مولانا اسلم جیراج پوری، خواجہ عبدالحی اور مولانا شرف الدین ٹونکی نے مختلف مضامین کے کلاس لینے شروع کئے۔ مولانا محمد علی کا مستقل قیام جامعہ میں رہا اس زمانے کے علماء اور بڑے بڑے لیڈر اور ممتاز ہستیاں مختلف وقتوں میں جامعہ پہنچتے رہے ان کی تقریروں اور وعظوں کا یہ اثر تھا کہ جامعہ کے طلباء بڑے بڑے عابد و زاہد سے زیادہ عبادت کرتے تھے اور باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔

یہاں تک کہ شدید سردی میں ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے تہجد کی نماز ادا کرتے تھے۔ اس دور کے طلبا میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر محمد اشرف، سید محمود ٹونکی، عبدالعلیم انصاری، یوسف حسین خاں اور نورالرحمن وغیرہ تھے جنہوں نے آزاد ہندوستان کے سیاسی، ادبی اور ثقافتی میدانوں میں ممتاز حیثیتیں حاصل کیں۔

مولانا محمد علی کی ہمہ گیر شخصیت، ان کی غیر معمولی ذہنی اور دماغی رفعت، انسانی ہمدردی، وسعت قلب و نظر، دوسروں کا اکرام، ضرورت مندوں کی حاجت روائی، دوستوں اور رفیقوں کے ساتھ وفا شعاری اور سخاوت، فراخ دلی اور سیر چشمی کے علاوہ ان کا سب سے بڑا وصف ان کا خلوص تھا جس میں وہ اپنے سب ہم عصروں میں نمایاں اور ممتاز تھے۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا اور ان کی ساری زندگی ایک کھلی کتاب تھی جس میں کوئی راز نہ تھا۔ مصلحت بینی سے وہ کوسوں دور تھے۔ حق گوئی اور بیباکی میں وہ کبھی چوکتے نہ تھے۔ ان کے قریبی دوست ان کی ان اداؤں پر اکثر اعتراض کرتے مگر وہ باز نہ آتے تھے۔ صحافت نگاری میں جہاں بہرآں مصلحت وقت اور دور اندیشی کی ضرورت ہوتی ہے وہ حق گوئی اور جرأت سے باز نہ آتے تھے۔ اسی وجہ سے دوسرے ان سے ہراساں اور شاکی رہتے تھے۔ جب سیاست میں قدم رکھا اور برادران وطن اور عوام کو اپنے گرد پروانہ وار جمع دیکھا تب بھی صاف گوئی بیباکی اور سرفروشی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ مولانا محمد علی مکمل آزادی اور غیر مشروط خود مختاری کے قائل اور حامی تھے اور اس سے کم کے لئے وہ کسی صورت میں بھی تیار نہیں تھے چنانچہ ۱۹۳۰ء میں جب انہوں نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی تو اسی مطالبے پر زور دیا۔ یہی ان کی آخری تقریر تھی جس میں اس مرد مجاہد نے غلام ہندوستان کو واپس جانے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے محکم عزم سے اس کو سچ کر دکھایا ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کی صبح کو لندن میں ان کا انتقال ہوا اور بیت المقدس میں مدفون ہوئے۔

ہم نے بلبل سے جو پوچھا دردِ فرقت کا علاج
شاخِ گل سے گر پڑی، ٹوٹی، تڑپ کر مر گئی

امجدی بیگم مرحومہ

خطوط بیگم محمد علی

مولانا محمد علی کے آخری ایام

(ذیل میں بیگم محمد علی کے وہ خطوط شائع کیے جا رہے ہیں جو انہوں نے گول میز کانفرنس کے زمانے میں لندن سے اپنی بڑی صاحبزادی، زہرہ بی کو لکھے تھے۔ بیگم محمد علی، بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم "محض بیوی نہ تھیں، محبوب" اور بڑی اچھی بیوی تھیں اور آخر وقت میں اپنے شوہر نامدار کا ساتھ دینے کے لیے ہمراہ ہی تھیں اور ان کی آخری عمر کی منزل میں بھی زندگی بھر کی رفاقت کا حق ادا کر رہی تھیں۔ مولانا کی چھوٹی صاحبزادی گلنار بی اپنے شوہر شعیب قریشی (وزیر ریاست بھوپال) کے ساتھ خود بھی اس وقت انگلستان میں تھیں، مولانا شوکت علی بھی لندن ہی میں تھے۔ ان خطوط کو یہاں شائع کرنے کی بڑی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان سے مولانا کی اُس زمانے کی سرگرمیوں اور ان کی صحت کے بارے میں تفصیل سے صحیح حالات پر روشنی پڑتی ہے۔)

(۱)

۴۹۲- مرٹن روڈ، لندن (S.W 18) ۱۱ر نومبر ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ، دعا

تمہارا خط اس ہفتے نہیں آیا، نہیں معلوم کیا بات ہے، ہر ہفتے خط لکھتی رہو، ناغہ نہ کرنا۔ تمہارے ابا کی طبیعت پھر دو تین روز خراب رہی، کیونکہ یہاں آنے کے بعد لوگوں سے ملنا ملانا رہتا ہے، کمزور بہت ہو گئے ہیں، اس وجہ سے تھک جاتے ہیں۔ ۱۷ر سے کانفرنس شروع ہے، وہاں جانا ہوتا ہے۔ صبح دس بجے وہ وہاں جاتے ہیں اور مجھے یہاں چھوڑ جاتے ہیں ایک بجے واپس آ جاتے ہیں، میں یہاں

گلنار کے پاس رہتی ہوں اور اگر وہ کہیں باہر پھرنے جاتی ہے تو میں بھی چلی جاتی ہوں۔ چونکہ تمہارے ابا اچھے ہوئے تو کہیں لے جائے اور کچھ دکھائے، لیکن وہ بیمار ہیں، شعیب کو کام سے فرصت نہیں ملتی، بیگم صاحبہ سے ملاقات ہو جاتی ہے، اکثر دوپہر کا کھانا اور شام کی چائے ان کے ساتھ پیتی ہوں، صبح کی چائے اور رات کا کھانا گھر پر کھاتے ہیں۔ دال بھات، پوری ترکاری، رائتہ اور شوکت صاحب بھی مل جاتے ہیں، تمہارے ابا کو اور طارق کو سلام کہتے ہیں، انہوں نے اپنے ہاتھ سے تم کو خط لکھا تھا[1]، امید ہے کہ ملا ہوگا اور اس میں سب پورا حال لکھا تھا۔ آج دہلی کی لڑکی رشیدہ آ رہی ہے اور اس کی بہن زہرہ کلکتہ والی، چلی ہے گلنار کے پاس۔ میرے نام رشیدہ کا خط آیا تھا تو میں نے رات کو ٹیلیفون کیا تھا کہ تم ضرور آ کر ملو اور میں بھی گلنار کے پاس ہوتی ہوں، وہیں آ کر چائے پیو تو وہ آ رہی ہیں اور آج رات کو مہاراجہ بڑودہ نے کھانے پر صاحب کو بلایا ہے اور مہارانی بڑودہ نے مجھے بلایا ہے، وہاں جانا ہے۔ اگر تمہیں کوئی خاص چیز منگانا ہو تو مجھے لکھو کہ میں تمہارے لئے کیا لیکر آؤں، میرا اوور کوٹ لینے کا ارادہ ہے، اگر صاحب کی دوا سے روپیہ بچا تو، لیکن تم بھی لکھنا کہ تم کو کیا چاہئے اور طارق کے لئے کیا لاؤں، طارق کو خوب پیار۔ تمہارے ابا کی بیماری نے مجھے بھی تھکا دیا، چونکہ کوئی آدمی نہیں، کام کرتے کرتے تھک جاتی ہوں، خط لکھنے کو بھی فرصت نہیں ملتی لیکن تھوڑا سا اس لئے لکھ لیتی ہوں کہ اگر نہیں جائے گا تو تم پریشان ہو جاؤ گی۔ اب رخصت ہوتی ہوں۔ سب کو سلام دعا کہہ دینا۔ تمہارے ابا طارق کو پیار کہتے ہیں۔

خدا حافظ۔

تمہاری والدہ، امجدی

---

[1] مولانا محمد علی کے جو خطوط میری نظر سے گذرے ہیں، ان میں زہرہ بی کے نام صرف دو ہیں، ایک ۶ر نومبر ۱۹۳۰ء کا جو گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے جاتے وقت پیرس سے لکھا گیا ہے، جہاں مولانا بیماری کی وجہ سے کچھ روز کے لئے رک گئے تھے، دوسرا ۲۶ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو لندن سے لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں خطوط "محمد علی — ذاتی ڈائری کے چند ورق" (حصہ دوم) مولفہ مولانا عبدالماجد دریابادی (مطبوعہ ۱۹۵۶ء) میں شائع ہوئے ہیں (صفحات ۱۶۵ - ۱۷۶) ان میں مولانا نے اپنی بیماری کی کیفیت بہت تفصیل سے لکھی ہے۔

(۲)

ہائڈ پارک ہوٹل، نائٹس برج لندن (S.W.1) ۲۷ نومبر ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ، دعا

تمہارے صرف دو خط آئے ہیں، تم نے اپنے میرٹھ جانے کا لکھا تھا، اس کے بعد سے کوئی خط نہیں آیا ہے۔ میں تم کو برابر ہر ہفتے خط لکھ رہی ہوں۔ تمہارے ابا کی طبیعت اچھی ہے، لیکن پیر کی پرانی دائوں پر ورم بہت زیادہ ہوگیا ہے، اس وجہ سے دور دور سے پلنگ پر ہیں، آرام کر رہے ہیں، برابر سب جگہ سے بلاوے آ رہے ہیں، لیکن کوئی ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے نہیں جا سکتی ہوں، تمہارے ابا کی طبیعت درست ہوتی ہے تو کہیں چلی جاتی ہوں، اگر انگریزی جانتی ہوتی تو خود بھی جا سکتی تھی۔ حیات کی امی نادرہ ایک روز میرے پاس آئی تھی اور پھر ہم سب کو بلایا تھا۔ میں، صاحب، شوکت جھتا اور ترا بد گئے تھے کھانے پر لیکن گلنار نہیں گئی تھی۔ پھر رسیدہ دہلی والی اور زہرہ دونوں کو گلنار نے چائے پر بلایا تھا۔ غلطی سے وہ یہ سمجھیں کہ ہمیں نے بلایا ہے۔ میں نے ٹیلیفون میں کہہ دیا تھا کہ میں رو رہی ہوتی ہوں، ہم دونوں وہاں مل جائیں گی، وہیں آکر ہمارے ساتھ چلئے، ہو لیکن وہ میرے یہاں چلی آئیں، ان سے پوری طرح بات بھی نہ کر سکی، کیونکہ صاحب کی طبیعت اس روز اچھی نہیں تھی۔ پھر وہ دونوں مجھے اور گلنار کو لیے آئیں تھیں، میں دوسری جگہ چلے گئی تھی، وہ صاحب اندر رہ چکے ہیں، وہاں بیگم سویاں بھی گئی تھیں، پھر وہاں سے واپسی میں رسیدہ کے پاس گئی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے کھانے اور چائے دونوں پر بلایا تھا کھانا کھانا ہندوستانی، پھر رات کو واپسی ہوئی، گلنار کو وہاں چھوڑ کر صاحب کو لنکر گھر واپس ہوئی۔ اب کل سے ہم اس ہوٹل میں آگئے ہیں، کیونکہ وہ جگہ بہت دور تھی، ایک تو موٹر کا خرچ زیادہ پڑتا تھا، دوسرے آنے جانے میں ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا اور پھر صاحب کے دل کے لئے بھی اچھا نہیں تھا کہ اسی دیر موٹر میں لگے۔ مجھے آرام تھا، جو کہ کھانے کا پوری، ترکاری، دال بھات مل جاتا تھا، اب تو بیرس کی طرح جائے اور ٹوس پر گزر ہوگی، لیکن یہاں صاحب کو آرام ملے گا، یہاں خرچ بھی زیادہ ہوگا لیکن مجبوری ہے، کیا کیا جائے۔ نواب صاحب کی جگہ سے بھی بہت دور ہے اور جہاں ان کو کام میں جانا ہوتا ہے، وہ بھی دور۔ یہاں اب دونوں جگہ قریب ہیں اور سب طرح آرام ہے، میں لندن سے تو بیزار ہو گئی ہوں۔ خدا کرے یہ کام جلدی ہو جائے اور کامیابی ہو تو واپس اپنے گھر جاؤں۔

تم اور طارق بہت یاد آتے ہو۔ بیگم صاحبہ سے بھی قریب قریب دو دن ملاقات ہو جاتی ہے۔ چونکہ گلنارا دوپہر کے کمرے میں رہتی ہے، صاحب جب کانفرنس میں جاتے ہیں تو مجھے وہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ گلنار کھانا اچھا پکاتی ہے بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی کھاتی ہے تو میں بھی اکثر کھانے پر چلی جاتی ہوں، وہیں ہوتی ہوں۔ قریب قریب روزانہ ایک روز دو روز بعد ملاقات ہو جاتی ہے۔ گلنارا اچھی ہے اور شعیب بھی اچھے ہیں، دونوں آداب عرض کرتے ہیں۔ شعیب کو کام بہت ہے، دل بھر دیکھنے کو بھی نہیں ملتا۔ گلنارا اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی ہے، یا میں جاتی ہوں تو ہم دونوں ہوتے ہیں کبھی بیگم صاحبہ کے پاس چلی جاتی ہے۔ بہن پیاری بیگم کا بھی خط آیا ہے۔ وہ خیریت سے ہیں۔ اب رخصت ہوتی ہوں۔ زاہد، شوکت صاحب سب خیریت سے ہیں۔ میری طرف سے نانی دادی کو آداب، قمر کو پیار، عذرا، صغریٰ، صفیہ کو دعا، عثمان فاروق کو دعا۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ فاروق عثمان نوکر ہو گئے۔ طارق کو خوب پیار۔ خدا حافظ

تمہاری دعاگو، والدہ

(۳)

ہائیڈ پارک ۔ نائٹس برج ۔ لندن ایس۔ ڈبلیو۔ ۱ ۱۴ر دسمبر ۱۹۷۳ء

پیاری زہرہ، خدا تم کو زندہ و سلامت رکھے۔

تمہارا خط آیا۔ خیریت معلوم ہو کر خوشی ہوئی۔ تم نے جو خط غلطی سے زاہد کا میرے خط میں رکھ دیا تھا وہ خط جب آیا ہے تو زاہد موجود تھے۔ صاحب نے کھولا تو زاہد کا نام دیکھ کر فوراً زاہد کو دے دیا اور زاہد سے کہہ دیا کہ تمہارے نام کے لفافے میں تمہارا خط آئے گا تو مجھے بھیج دینا۔ جب زاہد چلے گئے تو تھوڑی دیر بعد کوئی ایک گھنٹے کے، میرے نام کا خط مل گیا۔ تمہارے ابا کو فکر ہو رہی تھی کہ نا معلوم ہمارے نام کیا لکھا ہوگا اور وہ اس کے ہاتھ میں جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا، اب برابر خیال رکھو کہ پہلے خط لکھ کر پتہ لکھ دیا کرو۔ اس ہفتے تمہارے ابا پلنگ پر رہے، آرام لینے کی غرض سے۔ دوسرے ورم بھی ہے تو چلنے کو ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں، لیکن یہاں جب سے آئے ہیں، لوگ بہت آتے رہتے ہیں اور ٹیلیفون پر بھی باتیں کرتے رہتے ہیں، زیادہ آرام نہیں لیتے، جیسے کہ ان کی عادت ہے۔ اب چار پانچ روز سے اس ڈاکٹر کا علاج شروع کیا ہے جس کے علاج کو مہاراجہ الور نے بھیجا تھا۔ ان سے وہی پھل کھانے کو بتاتے ہیں اور سات روز تک پلنگ پر رہنے کو کہا ہے اور اسی ڈاکٹر کا علاج آج

سے میرا بھی شروع ہوا ہے۔ سب کھانا سادہ نمک بالکل بند، صبح چائے کے وقت پھل اور شام کو پھل اور ایک وقت کھانا، مچھلی یا مرغی کا گوشت، روٹی توس نہیں۔ یہی سنائی ہے جو صاحب کو بھی سنائی تھی۔ زاہد ساتھ گئے تھے اور وہی جایا کریں گے۔ اس ہفتے ملاوے تو بہت ہے لیکن صرف تین جگہ گئے تھے، ایک کسی عورت کے یہاں چائے تھی "۱۲ر دسمبر کو کل سب کو ایک بہت شاندار فرہے یا مکان ہے گرل گائیڈ کا، وہ دیکھنے گئی تھی، گلنار بھی ساتھ تھی، پھر ایک بجے لیچ پر وزیر اعظم کے یہاں گئے تھے شوکت ماموں، زاہد تھے، سب عورت مرد پندرہ یا سولہ تھے۔ آج ڈاکٹر کو دکھانے گئی تھی اور اب چار بجے ایک جگہ جلسے پر جانا ہے، اس لئے بہت مختصر خط ہی لکھ سکی ہوں۔ اچھا کیا، مہلا دستریٹ پڑھوا دیا۔ ہر جگہ تم اور طارق بہت یاد آتے ہیں، کل وزیر اعظم کی لڑکی نے بہت خاطر کی اور چلتے وقت سب سے اپنی کتاب پر نام لکھوائے۔ میں نے بھی لکھا لیکن میرا نام دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ کوئی نہ کوئی عورت یا مرد ایسا مل جاتا ہے کہ میری ترجمانی کر دیتا ہے۔ تم اپنے ابا کی وجہ سے پریشان ہو، انشاء اللہ وہ ضرور اچھے ہو جاویں گے۔ اس ڈاکٹر کے علاج سے۔ تم بھی ورزش کرو اور روٹی اور چاول کھانا چھوڑ دو تو ضرور دبلی ہو گی۔ گلنار اچھی ہے، برابر آتی رہتی ہے۔ تم کو آداب عرض کرتی ہے۔ شعیب بھی اچھے ہیں۔ دعا کہتے ہیں۔ طارق کو ہم سب کی طرف سے خوب پیار۔ بہن کا بھی خط آیا تھا، وہ خیریت سے ہیں، ان کے بھائی سے بھی ملاقات ہوئی جو یہاں پڑھتے ہیں۔ مظفر کے خط بھی آ رہے ہیں، اس کی رخصت دسمبر کی ۱۲ سے جنوری کی ۲ یا ۳ تک ہے۔ اس کو صاحب خرچ بھیج کر بلا رہے ہیں۔ باقی سب خیریت ہے۔ اب رخصت ہوتی ہوں۔ سب کو دعا، سلام، پیار کہہ دینا۔ جمیل ماموں کو بھی خیریت لکھ دینا۔ میں نے ان کو خط نہیں لکھا ہے۔ ابراہیم چچا سے میں کہہ آئی تھی کہ جب تک ہم یہاں سے واپس ہوں، ابا کی تنخواہ چندرا کی اور دہلی میں جمیل ماموں اور خانساماں کی تنخواہ اور کھانے کا خرچ، مکان کا کرایہ، یہ سب تم کو معلوم ہے، جو جاتا ہے اس کا حساب کر کے ذاکر[۵۲] صاحب کے پاس بھیج دیا کرنا۔ جب سے لکھ کر منگا لے، کوئی ڈھائی سو روپیہ کے چیک صاحب نے ان کو میرے پاس بھجوا دیے تھے، وہ روپیہ اب تک ختم ہو چکا ہو گا۔ اس مہینے میں ان کو روپیہ کی ضرورت

۵۲۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب۔

ہوگی تو میرے حساب میں یہ ان کو جب تک ہم واپس ہوں، جاتا رہے، ضرور ضرور۔

خدا حافظ! تمہاری دعا گو، والدہ احمدی

میں خط پورا کر چکی تھی کہ تمہارا ۲۴؍۳ کا خط ملا، اس لئے اس کا بھی جواب لکھے دیتی ہوں۔ کل ایک جگہ جانے پر گئی تھی تو ڈاک کا وقت نکل گیا تھا، آج اس کو پورا کر رہی ہوں، ہوائی جہاز سے بھیجا جائے گا۔ ایک جگہ سے ابھی آئی ہوں اور دو جگہ رات کو جانا ہے، ایک نواب کروائی کی بہن کے یہاں اور ایک جگہ اور۔ میں نے جو علاج شروع کیا ہے تو آج بہت تھک گئی ہوں۔ تم طارق کو بہت محنت نہ کرنے دو۔ زندہ رہے گا تو پڑھے گا، ابھی اس کو آرام کرنے دو، بہت روز بیمار رہا ہے اور تمہارے پڑھانے سے میں بہت گھبرائی ہوں، کیونکہ تم اس کو مارتی ہو، میری طرف سے پیار۔ تمہاری خالہ کا بھی خط آیا، تمہارے ابا کی تقریر کی تعریف لکھی ہے اور یہ بھی لکھا تھا کہ زہرہ کا خط آیا ہے، رام پور کے حالات بھی سب معلوم ہوئے۔ اگر میں اس کے علاج سے دلی ہو گئی تو تم کو بھی سب بتا دوں گی اور ورزش کراؤں گی۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ تم کو درد کی کوئی بیماری نہیں ہے، صرف سوچ بڑھتا ہے اس وجہ سے درد رہتا ہے۔ فقط، تمہاری بی

منوا دروہ کی نسبت معلوم ہو کر بہت صدمہ ہوا، اگر اس کو نوکری کرنا تھی تو آنے کی کیا ضرورت تھی اور اس کو ہمارے پاس سے کیا غم ر [بیس روپے] کم ہوتے، اتنے انعام ملے اور کپڑے نئے روپے کے بناتے، پھر بھی اگر وہ اتنی تنخواہ پر رضامند نہ تھا تو ہم سے کہہ دیتا کہ میری گذر نہیں ہوگی تو اور زیادہ دیتے۔ ہم نے اس کو اپنے گھر کا آدمی سمجھ کر رکھا تھا۔ صفیہ نے کہا کہ وہ بے کار رہے اور نوکری کرنا چاہتا ہے، اس لئے رکھ لیا تھا۔ تم پورا حال معلوم کر کے لکھنا اور اگر وہ نوکر ہو گیا ہے تو کسی اچھے آدمی کی فکر رکھنا۔ علی حسن کو اس کا باپ لے گیا۔ کسی لاوارث لڑکے یا لڑکی کی میرے لئے تلاش رکھنا، کیونکہ یہاں سے جانے کے بعد فوراً ہی ضرورت ہو گی۔ علی حسن سے مجھے بہت محبت ہو گئی تھی لیکن اس کا باپ نہ معلوم اس سے کیا کرے گا، یہاں رہتا تو آدمی ہو جاتا۔ خود بھی خراب ہو رہا ہے، اس لڑکے کو بھی خراب کرے گا۔ جس کو اعتبار ہے، تم ضرور لڑکے یا لڑکی کا خیال رکھنا، نہ بہت بڑا ہو نہ چھوٹا۔ تمہارے ابا دوسرے ہفتے خط لکھیں گے، اس ہفتے نہیں لکھ سکے۔ میرا ماماں کو، چنڈا کو سلام، اخلاص کو دعا۔ بھائی تماں کو صاحب خط لکھوا دیتے ہیں، اس وجہ سے میں نے نہیں لکھا ہے۔

میرا آداب عرض کر دینا، ماجد کو دعا، بچوں کو پیار، نو کو بھی دعا، اور تمہارے ابا کہتے ہیں کہ خط صاف، ہاتھ روک
کے لکھا کرو۔ ہوائی جہاز سے کیا بھیجتی ہو کہ خط بھی ہوائی جہاز کر دیتی ہو۔ کل تمہارے ابا کا فاقہ تھا،
آج پھل کا رس پیا ہے، سوجن ہے اس وجہ سے پلنگ سے ڈاکٹر اٹھنے نہیں دیتے ہیں ویسے
طبیعت اچھی ہے۔ تم دعا کئے جاؤ اور پریشان نہ ہوا کرو کہ جس کام کے لئے آئے ہیں، بیماری کی
حالت میں اس میں کامیابی ہو اور ہم سب زندہ و سلامت خوشی خوشی اپنے گھر واپس جائیں آمین

(۴)

لندن ۱۹ر دسمبر ۳۰ ۱۹ء

پیاری زہرہ، دعا پیار

تم زندہ سلامت رہو اس ہفتے تمہارا خط نہیں آیا، نہ معلوم کیا بات ہے۔ اس ہفتے تو گلنار کے خط میں رکھ کر آیا تھا، اس سے خیریت معلوم ہو گئی۔ قاسم صاحب کی بابت جو تم نے لکھا تھا کہ وہ بیمار ہیں اور علاج کے لئے رخصت پر آ رہے ہیں۔ اچھا کیا تم نے ان کو مکان میں رہنے کے لئے لکھ دیا۔ اگر ہم آ بھی جائیں گے تو اتنی جگہ ہے کہ سب رہ سکتے ہیں۔

تمہارے ابا کا وہی حال چلا جاتا ہے، چونکہ کمزور ہو گئے ہیں اس لئے اگر تھوڑا بھی کام کرتے ہیں یا کانفرنس میں کسی روز چلے جاتے ہیں تو ورم بڑھتا ہے۔ ورم ابھی تک چلا جا رہا ہے پیشاب بڑھانے کی دوا بھی دی۔ ڈاکٹر یہی کہتے ہیں کہ آرام کرنا چاہئے جب سے اس ہوٹل میں آئے ہیں، برابر آرام کر رہے ہیں کہیں آتے جاتے نہیں ہیں، صرف کبھی بہت ضرورت ہوتی ہے تو کام سے چلے جاتے ہیں۔ وہ یہاں سے لفٹ میں گئے ٹیکسی میں بیٹھے، وہاں جا کر لفٹ میں اوپر چلے گئے۔ مظفر آ گئے ہیں۔ اچھی طرح ہیں۔ کمزور بہت ہو رہا ہے، دبلا ہو گیا ہے، صحت اچھی نہیں رہی ہے۔ امتحان سب پاس ہو گیا، بیگم صاحبہ بھوپال اور لڑکیاں ۲۴ر کو جا رہی ہیں گلنار بھی ساتھ جاتی لیکن ابھی کام شعیب کا ہے، اس وجہ سے وہ بھی نہیں جا سکتی ہیں، اگر شعیب جاتے تو وہ بھی چلی جاتی۔

نواب صاحب بھوپال ابھی نہیں جا رہے ہیں، وہ جب کانفرنس ختم ہو جائے گی تو جائیں گے، سن رہے ہیں کہ جنوری کی شروع تاریخ میں ختم ہو جائے گی، خدا کرے جلد ہو جائے۔

میں تو بہت گھبرا گئی ہوں۔ صاحب کی علالت کی وجہ سے اور اگر وہ اچھے ہوتے تو کچھ نہیں تھا، کہیں جا بھی سکتی ہوں تو دل نہیں لگتا، مجبوراً چلی جاتی ہوں۔ اس ہفتے میرا وزن بہت کم ہو گیا ورزش برابر کر رہی ہوں، زیادہ ورزش کرنے کو تو نہیں ملتا، پھر بھی دو وقت کرتی ہوں۔ تھوڑا کچھ گوشت مچھلی کھا لیتی ہوں اور تھوڑے پھل۔ سب اچھی طبیعت معلوم ہوتی ہے تم بھی ہلکا کھانے کی کوشش کرو میں اس ہفتے کئی جگہ گئی۔ ۱۵ر کو رات کو ڈنر تھا۔ پرنس آف کہاٹ برٹش انڈیا یونین جو اسی ہوٹل میں تھا، وہیں صاحب کو بھی لے گئی تھی۔ ہر وقت بڑے بڑے ایک ہی خیال دل میں رہتا ہے، آج تک کہیں نہ جا سکے۔

۱۶ر کو مالوں کا کلب ۲ بجے جانے پر گئے تھے۔ رات کو ایک یہودی کے یہاں ڈنر تھا، وہاں لے گئے۔ وہاں پھر بارہ بجے وہاں سے لارڈ ریڈنگ کے یہاں ریسپشن تھا گئے۔ وہاں پرنس آف ویلز بھی آئے تھے۔ وہاں سے ۱۱ بجے واپس آئے۔ اس رات کو ۳ بجے دل کا دورہ صاحب کو ہوا۔ مہاراجہ الور کے دو ڈاکٹر یہاں رہتے ہیں، ان کو بلا کر دکھایا، انہوں نے خود دوائی دی پی رہے ہیں۔ اس سے آرام ہوا، صبح کو اسی ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا، اس نے کہا کہ کسی کو آنے جانے نہ دو، اب کل سے آج طبیعت بہتر ہے۔ تم گھبرانا نہیں، میں کل حال تم کو لکھ دیتی ہوں۔

۱۷ر کی رات کو مہاراجہ صاحب الور کے ہاں دعوت تھی کوئی پانچ سو آدمی کی۔ نہ میں جا سکی اور نہ صاحب جا سکے، مجبور تھی۔ ۱۸ر کو یہاں کی مسجد کی طرف سے لوگوں کی چائے تھی۔ آج ۱۹ر کو ۴ بجے برٹش انڈیا یونین کی چائے ہے۔ وہاں جاؤں گی کل ۲۰ر کو نواب صاحب بھوپال کے یہاں لنچ ہے، وہاں بھی جاؤں گی۔ صاحب بچارے نہیں جا سکتے ہیں، باقی سب خیریت ہے، اب رخصت ہوتی ہوں۔ باجی بجی کو میری طرف سے اور صاحب کی طرف سے آداب عرض کر دینا اور کہہ دینا کہ مہاراجہ صاحب اندور سرس کے بھی باہر رہتے ہیں اور ان سے کسی کو ملنے کی اجازت بھی نہیں ہے اور نہ ان کے اختیار میں کچھ ہے کہ وہ کسی کے لئے کچھ کر سکیں۔ سب کو دعا سلام، بھائی جان کو میرا اور مظفر کا آداب، تم کو اور طارق کو مظفر پیار کہتا ہے۔ ننو کو دعا، اچھو کو آداب۔ خدا حافظ!

تمہاری والدہ امجدی

(۵)

ہائیڈ پارک۔ فائنش رج، لندن (S.W.1) ۲۶ر دسمبر ۱۹۳ء

پیاری زہرہ، دعا

تم زندہ، سلامت، تندرست رہو۔ تم پر جو اپنے باپ کی وجہ سے پریشانی گزری ہوگی، اس کا بھی مجھے اندازہ ہے لیکن کیا کیا جائے، اخبار والے نہیں مانتے، لکھ دیتے ہیں، میری رائے نہیں تھی۔ اب سنو کہ کیا ہوا۔ میں بیٹھے تم کو خط لکھ رہی ہوں اور کل حال جو ان کا ہوتا ہے، لکھ رہی ہوں۔

۱۶ر کو یہاں سے کانفرنس میں گئے، وہاں سے واپس آئے تو کوئی ملنے آیا تھا، اس سے باتیں کرتے رہے، پھر سوگئے۔ رات کو تین بجے دل کا دورہ ہوا، ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا۔ مہاراجہ الور کے یہاں دو ڈاکٹر رہتے ہیں، معمول اپنے ساتھ لے کر آئے، وہ معمول جن کے یہاں شملہ جاتے ہوئے سوس پر کھانا کھایا تھا، دوا دی۔ میں پہلے وہ دوا رومال میں دے چکی (سونگھا چکی) جو ڈاکٹر رحمن نے چلتے وقت دی تھی کہ کہیں ایسا ہو تو سونگھانا۔ اس سے کچھ آرام آیا، سوگئے، دن کے دس بجے تک سوتے رہے، پھر ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرکے بلایا، ڈاکٹر مانک ہمیسہ بائی کے شوہر، انہوں نے کہا کہ بیگم صاحبہ میں نے ایسی حالت کسی روز صاحب کی نہیں دیکھی، میں اپنے رو سے علاج کر رہا ہوں، کسی کو کمرے میں نہ آنے دو اور نہ کسی سے بات کریں، دوا اور نہ لکھنے پڑھنے کا کام۔

۱۷ر کو مہاراجہ الور کے یہاں ڈنر تھا، وہاں نہیں جاسکے، شوکت صاحب چلے گئے۔

۱۹ر کو ہندوستان کی ڈاک لکھواتے رہے، خود بولتے جاتے تھے اور سکریٹری لکھ رہے تھے، لیکن پھر بھی حالت یہ تھی کہ آواز پر کمزوری معلوم ہوتی تھی۔ بھائی کو خط لکھوا رہے تھے۔ بی اماں کو آداب، بہن کو دعا۔ جبر وہ خط پورا ہوا۔ مجھے ایک جگہ جانے پر جانا تھا لیکن نہیں گئی اور اسی روز مہاراجہ الور نے چائے پر بلایا تھا تو صاحب نے کہا کہ اسی ہوٹل میں کہ اسی منزل پر دوسری طرف ہے، چلی جاؤ۔ میں وہاں گئی، وہاں سے واپس آئی تو خط پورا کرا چکے تھے لیکن اسی کا پورا کرنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ ٹیلیفون کرکے ڈاکٹر کو بلایا تو وہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے دوسرے ڈاکٹر کو جو دل کا علاج کرتا ہے، اس کی برابر رائے لی جا رہی تھی، ایک مرتبہ پہلے اس کو دکھا دیا گیا تھا، اس کو بلایا، دونوں نے دیکھا اور مجھے کہا کہ ہم نرس کو بھیجتے ہیں، ایک نرس دن میں اور ایک رات میں رہے گی

اداں کو پلنگ سے ہلنے نہ دو۔ غرض یہ کہ نرس آگئی، رات بڑی تکلیف رہی اور بڑی مشکل سے رات کٹی صبح کو غفلت ہوگئی تو گلزار آگئی۔ میں اور وہ بیٹھے دیکھتے رہے۔ اس وقت تک شوکت ماموں آئے، پھر ابو زاہد۔ زاہد کے پیر میں کچھ تکلیف ہوگئی تھی۔ سعید کو تو نواب صاحب کے کام سے فرصت ہی نہیں ملتی ہے۔ کبھی رات کو تھوڑی دیر کو یا کبھی دن کو آگئے۔ وہ رات ایسی کٹی کہ جیسے تمکر پڑ گئی تھی۔ وہاں تم بھی تھیں، یہاں نرس اور میں اکیلی اور جب موت کھی اور اب کمزوری[۳۵]

میں نے گلزار سے کہا کہ میرا الو اس کی حالت دیکھ کر دل گھبرا جاتا ہے، تم جا کر ڈاکٹر رحمٰن کو بھیجو۔ جب ڈاکٹر رحمٰن آئے تو انہوں نے کہا کہ بھائی! دعا کرو اور میں بھی دعا کرتا ہوں تو میں اور گھبرا گئی اور باہر کمرے کے نکل کر آئی کہ شوکت صاحب کو ٹیلیفون کروں، اتنے میں ڈاکٹر آگئے۔ اور انہوں نے رات کی رپورٹ دیکھی اور نبض دیکھی تو نبض کا پتہ نہیں۔ اس نے گھبرا کر شوکت صاحب کو ٹیلیفون کیا کہ تمہارے بھائی کی یہ حالت ہے، جلد آؤ، یہ بے چاری ایک عورت کیا کرے گی۔ غرض وہ آئے۔ زاہد، شعیب، مظہر سب آگئے۔ میری بری حالت ہوگئی، میں دوسرے کمرے میں آکر رونے لگی۔ پھر دل کا ڈاکٹر رحمٰن اور مانک سب کی رائے ہوئی کہ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر رحمٰن نے کہا کہ حالت نازک ہے۔ لیکن میری رائے ہے کہ جلاب کی دوا دی جائے۔ دوا اور انجکشن دیے گئے، ایک دل کے لئے اور ایک پیشاب کے لئے تو پیشاب آیا اور کہا کہ ۲۸ گھنٹے خطرے کے ہیں، گزر جائیں تو اطمینان ہو۔

رات کو پھر ڈاکٹر آئے تو کچھ حالت بہتر بنی، اس وقت وہ چلے گئے۔ رات کو شوکت صاحب اور میں دوسرے برابر کے کمرے میں رہے اور جا کر دیکھتے رہے۔ دوسرا کمرہ اور لیا صبح ہوئی تو حالت

۳۵۔ لندن جاتے وقت جب مولانا کی حالت بہت زیادہ خراب ہوگئی تھی اور انہیں پیرس میں علاج کے لئے اتار لیا گیا تو مولانا نے بھی اس بیماری کی شدت کو شملہ کی بیماری کے مشابہ قرار دیا تھا۔ یہ لکھنے کے بعد: "میں نے دوبارہ زندگی پائی، حقیقتاً خود دھکا مجھے اس بار لگا ہے وہ سب سے زیادہ سخت تھا" زہرہ بی کے خط میں لکھتے ہیں، "خون کا دباؤ بالکل شملہ کی طرح ۱۹ سے اوپر ہو گیا تھا اور لیٹنا سانس کے باعث ناممکن ہو گیا تھا" (ذاتی ڈائری حصہ دوم صفحہ ۱۶۵)

۳۶۔ یہی بات مولانا نے بھی لکھی ہے۔ "شملہ میں مرض کا پہلا سخت حملہ تھا اور بدن میں مقابلے کی قوت تھی۔ مگر بدن میں اب جان نہ تھی" (ایضاً صفحہ ۱۶۶)

شروع ہوئی تو بیماری شروع ہوئی۔ دن رات میں بارہ قے ہوتی تھیں، تو پھر ڈاکٹر آتے تو کہا کہ بس اب کل سے آج بہتر ہے اور کل سے تو بس اور دال بھی ملنے لگی ہے، لیکن کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ سب ڈاکٹروں کی یہ رائے ہے کہ نرسنگ ہوم میں بھیج دیا جائے، شاید دو چار روز میں بھیج دیں گے اب ان میں اتنی قوت نہیں ہے کہ خدا نہ کرے دل کا دورہ ہوا اور اس کی برداشت کرسکیں وہ مانے نہیں۔ ذرا طبیعت ٹھیک ہوئی تو باتیں کرتے ہیں ہم سے جا کر کہہ دیا کہ آپ کی یہ حالت ہو گئی تھی، خدا نے بچا لیا تو کہہ رہے تھے، نہ جانے میری بیٹی زہرہ کی کیا حالت ہو گئی ہوگی۔ آج کہتے ہیں کہ میں خط اپنے ہاتھ سے زہرہ کو لکھوں گا۔ میں نے کہا کہ میں تو لکھ رہی ہوں، اگلے ہفتے لکھنا۔

ہم سب وہاں زیادہ نہیں جاتے ہیں کہ یہ باتیں کریں گے، لیکن وہ نرس سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ مظفر کی وجہ سے مجھے بہت آرام ملا کہ میں اکیلی نہیں رہی اور سب تو آتے جاتے رہتے تھے لیکن وہ ہر وقت میرے پاس رات کے گیارہ بجے تک رہتا ہے۔ میں نے تو دو روز کھانا نہیں کھایا، نہ اس نے کھایا، نہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں جاتا تھا۔ ۲۲ کو دوپہر کو میری بری حالت ہونے لگی بھوک کے مارے، تو یہاں ایک مسلمان کی دوکان ہے، ہوٹل ہے کھانے کا۔ وہاں ہندوستانی کھانا ملتا ہے۔ میں پہلے بھی ہفتے میں ایک مرتبہ وہاں جا کر کھانا کھا آتی تھی، وہاں سے ٹیلیفون کر کے دو آدمی کا کھانا منگایا، اس وقت کلیم اور سعید آئے تو انہوں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا اور زاہد بھی تھے۔ ہم سب نے مل کر کھایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

تمہارا خط جس میں تم نے روپیہ کا لکھا تھا، تمہارے ابا کے نام تھا، وہ ان کو نہ دکھا سکی، صرف کہہ دیا کہ زہرہ کا خط آیا ہے، وہ حیرت سے ہے تو رونے لگے کہ ارے میری بیٹی کا نہ معلوم کیا حال ہوگا۔

- صاحب نے حیدری کو بھوپال سے چچا کو خط لکھ دیا تھا، اگر میرا روپیہ نہیں بھی کھایا تو کیا تھا میرا روپیہ جب جمع ہوتا تھا اور برسوں رہا تو تمام خاندان کے خرچ میں آتا تھا اور اب مجھے ضرورت ہے تو دو ہزار نہیں چار ہزار نہیں، صرف تین چار سو کا کسی کو ہمارا اعتبار نہیں تو میں نے بھی بھائی جان کو خط لکھ دیا ہے اور تم بھی ان سے کہہ کر کوشش کر کے دہلی کو روپیہ بھیج دینا، سب حساب میں لکھتی ہوں کرایہ مکان ۴۰ روپے، تنخواہ جمیں ماموں ۵۰ روپے، تنخواہ خواصہ ۲۰ روپے، خوراک جمیں ماموں ۱۲ روپے

خانسامہ ۱۲ روپے، مہتر بہشتی ۲ روپے، نیل حلائے کا ایک روپیہ، جیب خرچ زہرہ طارق ۱۵ روپے، تنخواہ آنا ۹ روپے، تنخواہ جھنڈ با ۱۳ روپے

یہ کل میزان ایک سو تیس ۱۳۰ روپیہ ہوتی ہے، تو ایک سو دو روپیہ تو ہر مہینے یعنی یکم دسمبر سے برابر دینا چاہیئے۔ جب تک میں واپس ہندوستان آؤں، ڈاکٹر صاحب کے نام ایک سو روپیہ ہر مہینے بھیجدینا یا ایک دم تین مہینے کا حساب کرکے ان کو بھیجدینا، وہ جیسا بھائی جان مناسب سمجھیں، لیکن پہلی کو ان کو مل جانا چاہیئے بھائی جان سے کہدینا کہ آپ کہیں سے قرضہ لے کر انتظام کر دیجئے۔ میں وہاں آکر سب ادا کردوں گی اور چھوٹے لال کو بلاکر میرا بھی حساب لینا کہ میرا کتنا روپیہ ہے۔ میں یہاں سے بھیجدیتی ملکہ صاحب کہہ رہے تھے، میں بیماری کی وجہ سے نہیں بھیجا کہ ہم یہاں پر دس میں ہیں، ہم کیا کریں گے۔

قاسم کے دو خط صاحب کے نام آئے لیکن وہ زیادہ بیمار ہو گئے، جواب نہ لکھ سکے۔ میں اکیلی کیا کروں کیسے اتنے خط لکھوں۔ تم ان کو لکھ دینا کہ بھائی تمہاری علالت کی وجہ سے فکر ہے اور میں تو خود بیمار ہو رہا ہوں۔ تم بڑی خوشی سے مکاں میں آکر رہو، اگر ہم آئیں گے تو ہم بھی رہ سکتے ہیں۔ خدا حافظ!

دعاگو، تمہاری والدہ امجدی

(۶)

لندن ۹ر جنوری ۱۹۳۱ء

پیاری زہرہ! پیار

میں زندہ ہوں، لیکن مردوں سے بدتر، نہ معلوم میری قسمت میں کیا لکھا ہے کہ اب تک زندہ رہی، جن کی دنیا کو ضرورت تھی، وہ مجھ کو اور تم کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ اسی کا ہر وقت خوف رہتا تھا وہ سامنے آکر رہا میری ایک بھی قبول نہ ہوئی۔ ان کا دل ہی ہندوستان جانے کو نہیں چاہتا تھا جب بھی جانے کا نام آتا تو کہتے تھے کہ میں ابھی نہیں جاؤں گا جب پورا کام ہو جائے گا اس کے بعد پیرسؔ جاؤں گا، علاج کراؤں گا اور آجاؤں گا میں یہ سنکر اور ان کی کمزوری اور کام دیکھ کر گھبراتی تھی

؎ - پیرس جانے کا ذکر شاید اس لیے کیا تھا کہ پیرس کے ڈاکٹر نے کہا تھا، "الحمدللہ دل میں جو خرابیاں نظر آتی تھیں وہ سب دور ہو گئی ہیں اور حسب قرارداد سالی اب تم کل ایسے لندن جا سکتے ہو، جب اس سے دکول میز کانفرنس سے فارغ ہو جاؤ تو پیرس آکر ہمارا علاج کرانا، انشاء اللہ ایک یا ڈیڑھ مہینے کے علاج کے بعد قلب ایسا ہو جائیگا کہ کبھی گویا مرض ہوا ہی نہ تھا۔" (ایضاً صفحہ ۱۷۱)

میری کوئی ایک بات نہیں سنتے تھے، اس لئے مجبوراً ڈکٹیٹ نہیں کی۔ جب ۲ر کو زیادہ بیمار ہوگئے تھے اور ہوش آگیا تو میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ آپ انہیں کہیے کہ ہندوستان جلد چلے جائیں اور جو ان کی حالت ہے اس کو بتلاد

ڈاکٹر مانک نے ایک روز کہا کہ بھائی محمد علی تمہاری حالت ایک شیشے کے گلاس کی طرح ہے کہ اس کو احتیاط سے رکھا جائے تو برسوں رہ سکتا ہے لیکن اگر اس کو ٹھیس ذرا بھی لگے تو ٹوٹ جائے گا، آپ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اس قدر سفر کر سکیں، شوکت صاحب اور راجہ چلے جائیں گے، نہ اکیلی بیگم صاحبہ کیا کریں گی، ڈاکٹر علاج کرے گا لیکن نئے گردے کہاں سے لائے گا، آپ کے گردے کام نہیں کر رہے ہیں، صرف دل کا ہی سوال نہیں اور تمہارا علاج سوائے آرام کے کچھ نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ اگر آپ کام نہیں چھوڑیں گے تو آپ جلد اچھے نہیں ہو سکتے ہیں اور سوائے اس کے کہ ڈاکٹر دوسرے اور کچھ حاصل نہ ہوگا، آپ کا اچھا ہونا آپکے ہاتھ میں ہے اور آپ آرام کیجئے اور یہاں کی سردی بھی آپ کے لئے اچھی نہیں ہے، میں تو آپ کو یہی رائے دیتا ہوں کہ آپ ہندوستان جلد جائیے اور آپ اکیلے جانے کے قابل نہیں ہیں، کوئی ڈاکٹر ساتھ ہونا چاہئے تو اس کے بعد کہا کہ اچھا ڈاکٹر اگر آپ کی یہی رائے ہے تو میں ۱۶ کو یا ۲۴ کو جہاز سے چلا جاؤں گا۔ ۲۱ر کے بعد سے کمزور بہت ہوگئے تھے لیکن پھر برابر طاقت آرہی تھی اور یہ خیال نہیں تھا کہ اس قدر جلدی ہو جائے گی۔

جب ایک ہفتہ گذر گیا تو کہا کہ تم اس کمرے میں آکر کیوں نہیں رہتی ہو؟ میں نے کہا کہ نرس ہوا ہے، اس کو اچھا معلوم نہیں ہوتا تو کہا کہ اب مجھے رات کو نیند خوب آجاتی ہے اور رات کی نرس کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے بھی کہا کہ اب کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ رات کی نرس بند کر دی گئی دن کی آتی تھی۔ چہرے پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایسی حالت رہی تو جلد تندرست ہو جائیں گے ڈاکٹر بھی خوش تھ

۲۹ر کو کہا کہ میری ایک لڑکی یہاں ہے اور اس کی سالگرہ ۳۱ر کو پوری ہوتی ہے اور میں نے آج تک کچھ نہیں کیا ہے، یہ خوشی تو میں ضرور کروں گا اور سب کو بلا کر کھانا ہندوستانی قسم کے ہوٹل سے منگا کر کھلا دوں گا لیکن پہلے مہاراجہ الور اور نواب بھوپال سے معلوم کر لوں کہ انہیں کہیں باہر جانا تو نہیں ہے۔ مہاراجہ صاحب کو خط لکھا، انھوں نے منظور کر لیا، اس کے خط میں لکھا تھا کہ ایک مرتے ہوئے کی آخری آرزو ہے کہ آپ میرے ساتھ آکر کھانا کھائیں۔ نواب صاحب چونکہ اور لوگوں کو پہلے سے دعوت دے چکے تھے، وہ نہ آسکے، مہاراجہ صاحب کے یہاں سے ۶ آدمی تھے، ایک ٹیلیفو

خانساماں ۱۲ روپے، مہر بہشتی ۲ روپے، تیل جلانے کا ایک روپیہ، جیب خرچ زہرہ طارق ۱۵ روپے،
تنخواہ آیا ۹ روپے، تنخواہ جھنڈا ۱۳ روپے

یہ کل ملا کر ایک سو تیس روپیہ ہوتی ہے، تو ایک سو دو روپیہ تو ہر مہینے یعنی یکم دسمبر سے برابر دینا چاہیئے۔ جب تک میں واپس ہندوستان آؤں، ڈاکٹر صاحب کے نام ایک سو روپیہ ہر مہینے بھجوا دیا ایک دم تین مہینے کا حساب کرکے ان کو بھیج دینا۔ وہ جیسا بھائی جان مناسب سمجھیں، لیکن پہلی کو ان کو مل جانا چاہیئے۔ بھائی جان سے کہہ دینا کہ آپ کہیں سے قرض لے کر انتظام کر دیجئے۔ میں وہاں آکر سب ادا کر دوں گی اور چھوٹے لال کو بلا کر میرا بھی حساب لینا کہ میرا کتنا روپیہ ہے۔ میں یہاں سے بھیج دیتی بلکہ صاحب کہہ رہے تھے، میں نے بیماری کی وجہ سے نہیں بھیجا کہ ہم یہاں پر دیس میں ہیں، ہم کیا کریں گے۔

قاسم کے دو خط صاحب کے نام آئے لیکن وہ زیادہ بیمار ہو گئے، جواب نہ لکھ سکے۔ میں اکیلی کیا کروں کیسے اتنے خط لکھوں۔ تم ان کو لکھ دینا کہ بھائی تمہاری علالت کی وجہ سے فکر ہے اور میں تو خود بیمار ہو رہا ہوں۔ تم بڑی خوشی سے مکان میں آکر رہو، اگر ہم آئیں گے تو ہم بھی رہ سکتے ہیں۔ خدا حافظ!

دعاگو، تمہاری والدہ امجدی

(۶)

لندن ۹ جنوری ۱۹۳۱ء

پیاری زہرہ! پیار

میں زندہ ہوں، لیکن مردوں سے بدتر۔ معلوم میری قسمت میں کیا لکھا ہے کہ اب تک زندہ رہی، جن کی دنیا کو ضرورت تھی، وہ مجھ کو اور تم کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ اسی کا ہر دم خوف رہتا تھا، وہ سامنے آکر رہا میری ایک بھی قبول نہ ہوئی۔ ان کا دل ہی ہندوستان جانے کو نہیں چاہتا تھا، جب کبھی جانے کا نام آتا تو کہتے تھے کہ میں ابھی نہیں جاؤں گا جب پورا کام ہو جائے گا اس کے بعد پیرس[ش۵] جاؤں گا، علاج کرا دیں گا اور آجاؤں گا۔ میں یہ سن کر اور ان کی کمزوری اور کام دیکھ کر گھبراتی تھی

ش۵۔ پیرس جانے کا ذکر شاید اس لئے کیا تھا کہ پیرس کے ڈاکٹر نے کہا تھا: "الحمدللہ دل میں جو خرابیاں نظر آتی تھیں وہ سب دور ہو گئی ہیں اور حسب قرارداد سابق اب تم کل اپنے لندن جا سکتے ہو۔ جب اس سے (گول میز کانفرنس) سے فارغ جاؤ تو پیرس آکر ہمارا علاج کراؤ۔ انشاء اللہ ایک یا ڈیڑھ مہینے کے علاج کے بعد قلب ایسا ہو جائے گا کہ کبھی گویا مرض ہوا ہی نہ تھا۔" (ایضاً صفحہ ۱۷۱)

میری ایک بات نہیں سنتے تھے، اس لئے تھوڑا تھوڑا دکھنی رہتی تھی۔ جب ۲؍ کو زیادہ بیمار ہو گئے تھے اور ہوش آگیا تو میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ آپ انہیں کہئے کہ ہندوستان جلد چلے جائیں اور جو ان کی حالت ہے ان کو سنا دو۔

ڈاکٹر بانک نے ایک روز کہا کہ بھائی محمد علی تمہاری حالت ایک شیشے کے گلاس کی طرح ہے کہ اس کو احتیاط سے رکھا جائے تو برسوں رہ سکتا ہے لیکن اگر اس کو زمین پر مار دو گے تو ٹوٹ جائے گا، آپ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اس قدر سفر کر سکیں، شوکت صاحب اور راجہ چلے جائیں گے، یہ اکیلی بیگم صاحبہ کیا کریں گی، ڈاکٹر علاج کرے گا لیکن نئے گردے کہاں سے لائے گا، آپ کے گردے کام نہیں کر رہے ہیں، صرف دل کا ہی سوال نہیں اور تمہارا علاج سوائے آرام کے کچھ نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ اگر آپ کام نہیں چھوڑیں گے تو آپ جلد اچھے نہیں ہو سکتے ہیں اور سوائے اس کے کہ ڈاکٹر دوسرے اور کچھ حاصل نہ ہوگا، آپ کا اچھا ہونا آپکے ہاتھ میں ہے اور آپ آرام کیجئے اور یہاں کی سردی بھی آپ کے لئے اچھی نہیں ہے، میں تو آپ کو یہی رائے دیتا ہوں کہ آپ ہندوستان جلد جائیے اور آپ اکیلے جانے کے قابل نہیں ہیں، کوئی ڈاکٹر ساتھ ہونا چاہئے تو اس کے بعد کہا کہ اچھا ڈاکٹر! اگر آپ کی یہی رائے ہے تو میں ۱۶؍ کو یا ۲۳؍ کے جہاز سے چلا جاؤں گا۔ ۲۱؍ کے بعد سے کمزور بہت ہو گئے تھے لیکن پھر برابر طاقت آ رہی تھی اور یہ خیال نہیں تھا کہ اس قدر جلدی ہو جائے گی۔

جب ایک ہفتہ گذر گیا تو کہا کہ تم اس کمرے میں آ کر کیوں نہیں رہتی ہو؟ میں نے کہا کہ نرس ہوتی ہے، اس کو اچھا معلوم نہیں ہوتا، تو کہا کہ اب مجھے رات کو نیند خوب آ جاتی ہے اور رات کی نرس کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے بھی کہا کہ اب کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ رات کی نرس بند کر دی گئی، دن کی آتی تھی۔ چہرے پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسی حالت رہی تو جلد تندرست ہو جائیں گے ڈاکٹر بھی خوش تھا۔

۲۹؍ کو کہا کہ میری ایک لڑکی یہاں ہے اور اس کی سالگرہ ۳۱؍ کو پوری ہوتی ہے اور میں نے آج تک کچھ نہیں کیا ہے، یہ خوشی تو میں ضرور کروں گا اور سب کو بلا کر کھانا ہندوستانی شمع کے ہوٹل سے منگا کر کھلا دوں گا لیکن پہلے مہاراجہ الور اور نواب بھوپال سے معلوم کر لوں کہ انہیں کہیں باہر جانا تو نہیں ہے۔ مہاراجہ صاحب کو خط لکھا، انھوں نے منظور کر لیا، ان کے خط میں لکھا تھا کہ ایک مرے ہوئے کی آخری آرزو ہے کہ آپ میرے ساتھ آ کر کھانا کھائیں۔ نواب صاحب چونکہ اور لوگوں کو پہلے سے دعوت دے چکے تھے، وہ نہ آ سکے، مہاراجہ صاحب کے یہاں سے ۶ آدمی تھے، پھر تیلیوں

کر کے سب کو دعوت دی۔ مہاراجہ جام صاحب چونکہ بیمار تھے نہ آسکے۔ صاحب اسی روز باہر جا رہے تھے، راجہ کی کچھ طبیعت خراب تھی، وہ بھی نہیں آئے، مظفر دن بھر رہا اور کام کرتا رہا۔ خود کھانے کے لئے ٹیلیفونوں سے کہا۔ بادشاہ کے سکریٹری اور دور برہید کی بیوی[۵۳]، شعیب غرض یہ کہ سب ۹ آدمی ڈنر پر تھے، برابر کے کمرے میں میز لگائی گئی، خود گئے، صوفے پر بیٹھے رہے۔ کھانے کے بعد مہاراجہ صاحب نے تقریر کی، ان کا شکریہ خود ادا کیا۔ خوب خوشی خوشی خود بھی اپنی کرسی میں کھانا کھاتے رہے۔

جب سب لوگ چلے گئے تو پھر اپنے کمرے میں آگئے، چونکہ گلنار کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی تھی، وہ نہ آسکی تھی، تو جب صبح ہوئی تو کہا کہ گلنار نہیں آئی۔ میں نے کہا آتی ہوگی۔ وہ آئی تو اس سے خوب باتیں کرتے رہے۔ اس نے کہا کہ ابا! ہم آپ کو مرنے نہ دیں گے اور دل کے مرض والے جلدی نہیں مرتے ہیں تو کہا کہ بیٹی! مجھے تو خیال بھی نہیں آتا کہ میں مرنے والا ہوں، اب بھی اتنی قوت ہے کہ ہاتھی سے لڑ سکتا ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ مرتے مرتے بچ گیا۔ میری بیٹی زہرہ کیسی پریشان ہوگی۔ نرگس کرمس نے گلنار سے کہا کہ بیٹی! میرے لڑکا ہوگا تو محمد علی نام رکھیں گے، اور لڑکی ہوگی تو فاطمہ۔ غرض یہ کہ ہنستے رہے

بیگم کو ۸ بجے ایک جگہ جانا تھا، مجھ سے کہا کہ وہاں ضرور جانا، میں چلی گئی، نرگس بھی ۲ ر کی دوپہر کو گلنار کا ٹیلیفون آیا کہ میں سینما دیکھنے جا رہی ہوں، تم بھی چلو تو کہا کہ ضرور چلی جاؤ، میں بالکل اچھا ہوں، میں وہاں گئی۔ وہاں سے واپس آئے تو ۷ بجے تھے، دوسرے روز ڈاک کا روز تھا تو میں تم کو اور بھائی جان کو خط لکھنے لگی۔ تمہارا ابھی کا ممانی کا خط آیا تھا، وہ مجھے دیا اور کہا کہ میری بیٹی زہرہ کو لکھ دو کہ ۲۰ کو تو میری بری حالت ہوگئی تھی، لیکن بچ گیا اور میں آج بہت تھک گیا ہوں، ورنہ خود خط لکھتا۔ میں نے کہا کہ میں نے سب لکھ دیا ہے۔ اسی روز جب کہ میں گئی ہوئی تھی لکھوائے رہے۔ ڈاکٹر بیٹھے تھے، ان سے کہا کہ اب میرے دل کی حالت دیکھ لو اور پھر بعد میں بھی دیکھ لینا۔ ڈاکٹر نے بعد میں دیکھا تو حالت اچھی تھی۔ کہا کہ اب میں خوش ہوں کہ میں نے اپنا سب کام ختم کرلیا، اس کے بعد اس

---

[۵۳] یہاں "صاحب" سے پہلے غالباً کوئی نام رہا ہوگا جو چھپنے سے رہ گیا، ممکن ہے شوکت صاحب ہوں۔

[۵۴] یہ لفظ پڑھا نہیں جا سکا، "مہدی" ہو سکتا ہے۔ آگے چل کر اسی خط میں حیدرآباد کے مہدی یار جنگ کا ذکر ہے۔ شاید وہی ہوں۔

کو دیکھتے رہے اور اس کی غلطی نکالتے رہے۔ دوسری کافی منگائی تھی، کہنے لگے کہ افسوس میں نے
اس قدر محنت کی اور وہ کافی اب تک نہیں آئی کہ میں ہندوستان بھیجتا۔ میں نے کہا کہ آپ نے
آج بہت کام کیا ہے، اب آرام کیجئے۔ رات کو ۱۱ بجے سو گئے۔ جس طرح روز اٹھتے تھے دونوں
مرتبہ اسی طرح دو تین مرتبہ اٹھ کر پیشاب کیا۔ صبح ۸ بجے مجھے آواز دی کہ اب اٹھتے، میرا منہ
دھلوا دیجئے۔ میں نے منہ دھلوایا، خوب دانت صاف کئے، منہ ہاتھ اپنے ہاتھ سے دھویا اور
پھر میں نے علاج کی دوا دی۔ پیٹ لگا دیا۔ کہا کہ مجھے بھوک بہت لگی ہے، خود گھنٹی دی۔ نوکر آیا اس
سے کہا کہ کافی اور ٹوسٹ لاؤ۔ وہ لایا، کافی پیتے رہے، اور ٹوسٹ کھاتے رہے، اتنے میں ۹ بج گئے۔ نرس
آگئی۔ میں نے کہا کہ اب نرس آگئی، میں غسل خانے ہو آؤں، کہا کہ جاؤ۔ میں آگئی تو کہا کہ ابھی تک
لڑکے زاہد اور مظفر نہیں آئے، ٹیلیفون کر کے بلاؤ، ان سے مجھے بہت کام لینا ہے۔ میں نے
ٹیلیفون کیا۔ زاہد نے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں۔ اخبار اور ڈاک آگئی، اس کو دیکھتے رہے۔ میں نے
کہا کہ جس قدر لوگ ہندوستان سے آتے ہیں انہوں نے سب نے جہاز میں انتظام کر لیا، آپ نے
ابھی تک نہیں کرایا ہے تو کہا کہ زاہد آجائے تو ۱۶ کے جہاز سے اور ۲۳ کے جہاز سے انتظام کرتا ہوں۔
زاہد آئے تو ان سے کہا کہ ٹیلیفون کر کے انتظام کرو چونکہ ہفتے کا دن تھا، انہوں نے کہا کہ آج نہیں ہو
سکتا ہے، اس لئے کہ ۱۲ بج گئے، سب دفتر بند ہو گئے، تو کہا کہ اچھا پرسوں، لیکن اسی دیر میں مظفر
آگئے، ان سے باتیں کرتے رہے۔ میں نے کہا کہ پان ہے کھلا دوں تو کہا کہ ہاں۔ خود کہنے لگے کہ مجھے بھی پان
دو، میں نے پان دیا کھاتے رہے۔

جب مظفر چلے گئے تو پھر ٹیلیفون کر کے حیدر آباد کے مہدی یار جنگ کو بلایا۔ ان سے باتیں
ایک گھنٹہ کرتے رہے۔ دن کے ۲ بج گئے۔ ہندوستانی ہوٹل سے مونگ کی کھچڑی منگائی۔ نرس نے
کہا کہ آپ نے اسے کھانے میں دیر کر دی، اب کھا لیجئے۔ وہ کھچڑی لے کر آئے، اس کو کھاتے رہے
مکھن ڈال کر، اس کے بعد مجھے کہا کہ یہ کھچڑی تم کھا لو۔ یہاں ہوٹل کا کھانا کھاتی نہیں ہو اور میری
وجہ سے باہر کھانے کو نہیں جاتی ہو، دن بھر بھوکی رہتی ہو۔ میں نے کہا کہ میں نے کبھی مونگ کی
کھچڑی نہیں کھائی اور خالی کاہے سے کھاؤں تو کہا کہ تمہارے پاس چٹنی اچار ہے اس سے کھاؤ
اور پھر گھنٹی دے کر نوکر کو بلایا اور کہا کہ مکھن گرم کر کے لاؤ۔ میں پلنگ کے قریب بیٹھی تھی،

کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ میں نے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی، اس وقت مجھے کچھ رونا سا آ گیا اور میں کہنے لگی کہ دیکھو آپ کام کرنا نہیں چھوڑتے اور ڈاکٹر خوف دلاتے ہیں اور جب آپ کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو میری عجب حالت ہوتی ہے تو کہا کہ ہاں میں جانتا ہوں اور میں نے کہا کہ سوائے آپ کے میرا تو کوئی نہیں تو کہنے لگے کہ یہ کہو، تمہارے بھائی ہیں۔ میں اٹھ کر ہاتھ دھونے چلی گئی اس عرصے میں ڈاکٹر آ گئے۔ دونوں بھائی اور ایک یہاں کے مسٹر مہرا ہیں، وہ بھی آتے ہوتے تھے مجھ سے کہا کہ چائے منگاؤ۔ چائے آئی، سب پیتے رہے۔ ڈاکٹر سے کہا کہ میرے لئے ایک اچھی موٹر لو، ایسے لوگ ہم ہیں، زہرہ، طارق سب آ سکیں۔ مسٹر مہرا نے کہا کہ آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا کہ بیگم صاحبہ سے جھنڈا اٹھوانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بھائی، ابھی ہندوستان کا معاملہ تو ٹھیک ہونے دو۔ میں ہی تھا کہ کوکنڈہ (کوکناڈا) میں جھنڈا اٹھایا تھا اور میں ہی ہوں گا کہ جو ہندوستان کا جھنڈا اٹھاؤں گا۔ ابھی اس کا موقع نہیں ہے۔ ایسے میں ۵ بج گئے۔ کہا کہ بھائی: مجھے معاف کرنا کہ میں تھک گیا ہوں، اب سو جاؤں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں آپ آرام کیجئے۔ ڈاکٹر اور وہ سب چلے گئے۔

تھوڑی دیر میں مظفر آیا اس نے چائے پی، نرس باہر چلی گئی، میں کمرے میں بیٹھی رہی۔ دو گھنٹے ہو گئے۔ ۷ بج گئے، اس وقت نرس میں دیکھنے لگی تو ایک دم بڑے زور کی گلے سے آواز نکلی کہ ان کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور اٹھنا چاہتے ہیں اور الٹا ہاتھ اٹھا رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر سیدھا ہاتھ پھیلا دیا میں نے اسے ہاتھ میں ہاتھ دبا لیا تو مسکرائے، گویا کہ وہ پہچانتے تھے لیکن زبان نہیں چلتی تھی، بہت کوشش کرتے تھے۔ میں اور نرس تھے میں گھبرائی، نرس سے کہا کہ ٹیلیفون کرو، اس نے ٹیلیفون کیا۔ گلبارکو، شعیب، زاہد سب آ گئے، ڈاکٹر آ گئے، انجکشن دیا، پھر بڑا ڈاکٹر آیا، مہاراجہ ایلچی بھی دیر میں پھیرے کئے۔ دل کا ڈاکٹر جو تھا، اس نے لوٹ کے آ کر دیکھا تو اس نے کہا کہ اب سب کو دھوکے میں رکھنا بے کار ہے ان پر فالج ہوا ہے، ایک ہاتھ ایک سرے سے بیکار ہے، ہم انجکشن دیتے ہیں، حالت ان کی اچھی نہیں ہے، شاید صبح تک ٹھیک ہو جائے۔ سب کی طرف دیکھتے رہے۔

آخر کار دو بجے تک یہ حالت رہی اور پھر سانس تیز چلنے لگی، اور شعیب اور گلبارکو

بھیج دیا تھا۔ راہد، مطہر اور دو تین لڑکے اور تھے رحمٰن سدھی، میں یٰسین پڑھتے رہے، رات بھر آنکھ بھی بند ہو گئی صبح سوا نو بجے ہم سب کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔

شوکت صاحب اسٹیشن پر تھے، وہ اس وقت تک نہ آسکے، پانچ منٹ چلے گئے ہونگے کہ جب وہ آئے دن بھر سب بیٹھے رہے، قرآن پڑھتے رہے تمام لوگ یہاں کے آتے رہے، کیونکہ دن کو ہوٹل سے نہیں جاتے ہیں۔ رات کو ۱۲ بجے اس کو دوسری جگہ لے گئے جہاں غسل دیا جانے والا تھا اور صندوق تیار ہو رہا تھا۔ رات بھر شوکت صاحب رہے۔ صبح کو غسل مطہر، رحمٰن سدھی سب تھے مل کر شام کو تیار ہوئی میں اور گلنار بھی گئی تھیں اور عورتیں بھی تھیں۔ یہاں سب بڑے لوگ ہندو مسلمان اکٹھا ہو آئے تھے۔ کالفرنس کو سب تھے۔ اسی روز رات کو شعیب یہاں گلنار کو ساتھ لئے ہوئے آئے تھے۔ صبح کو چلی گئی تھی اتنی۔ وزنک ہی کیا۔ پھر ہوٹل چھوڑ دیا اب بھی گلنار کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں تو رہ بھی نہ سکی، اس لیئے کہ ایک تو ہوٹل، پرانا شہر، دوسرے گلنار کی حالت آج کل ایسی ہے کہ اس کی وجہ سے بھی نہیں رہتی۔ اپنے دل پر جاری ہوں دوسرے بہاری بھائی کا خیال پریشان کر رہا ہے پہلے تو ہندوستان لانے کا خیال تھا، پھر تیسرے روز فلسطین سے تار آیا کہ کیا ہم کو آپ اجازت دیں گے؟ ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ یہاں دفن کیا جائے۔ میں نے اپنی رضامندی ظاہر کی، کیونکہ ایسی جگہ قسمت والے کو ہی ملتی ہے۔ کل میں اور گلنار دیکھنے گئے تھے۔ پانچ روز، دن اور رات ایک دو آدمی بیٹھے قرآن شریف پڑھتے رہے تھے بڑی قسمت والا ایسی جگہ پر ہے، کیونکہ جہاز والے جھگڑا کر رہے تھے اسی جہاز میں ہم سب ۱۷ کو سوار ہو جائیں گے، وہ میں، شوکت صاحب راہد پورٹ سعید پر اتر جائیں گے لے کر اور پھر جہاز بار پر سے بیٹھ کر وہاں پہنچنے کے بعد دفن ہو جاویں گے۔ تو پھر یہ ارادہ ہے کہ زیارتیں کرتے ہوتے، واپس ہندوستان ہوں گے گلنار سیدھے بھوپال جائیں گی، میں دہلی آکر سامان وغیرہ کا جو کچھ سب کی رائے ہو گی، وہ کر کے مکان چھوڑ دیں گے۔ اگر قاسم رکھنا چاہتے ہیں تو میں بھوپال گلنار کے پاس چلی جاؤں گی، وہاں رہوں گی اور اگر زندہ رہی تو کر رہا ہی کہانی سنا دوں گی۔

ساری! ہم صبر کرنا، سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس وقت نہ فاتحہ دلا سکی ہوں، نہ فاتحہ دلواؤں تو کس کو دوں۔ صرف کچھ روپیہ خیرات کر دیا۔ تین پونڈ ہے۔ امید ہے کہ تم فاتحہ

دلوا رہی ہوگی، اور دلواتی رہنا ۔ طارق کو پیار

تمہاری درد نصیب والدہ ، امجدی

(علی برادران (مرتبہ ۔ سید رئیس احمد جعفری) مطبوعہ لاہور ۔ دسمبر ۱۹۶۳ء صفحات (۴۱۴ - ۴۲۶)

"آخری مشورہ" کے عنوان سے مولانا محمد علی مرحوم کی وہ یادداشت شائع ہوئی ہے جسے انھوں نے انگلستان کے وزیراعظم کے نام لندن ہوٹل میں یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو قلم بند کرایا تھا اور ۲ کو تصحیح کے ساتھ ساتھ کچھ اضافے کئے تھے، اس کے بعد ۳ کو وہ بے ہوش ہوگئے اور پھر کبھی ہوش نہیں آیا۔ اس کتابچے کے دیباچہ میں، جس پر دریا گنج دہلی کی ۳ مارچ ۱۹۳۱ء تاریخ ہے، مولانا شوکت علی مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے: "ماہرین فن اطبا نے مجھ سے کہا کہ محمد علی کی موت، قلب کے رک جانے یا گردے کی تکلیف سے نہیں ہوئی بلکہ اصل سبب یہ تھا کہ آخری یادداشت کے لکھانے میں اس کے دماغ پر اس قدر غیر معمولی زور پڑا کہ دماغ کی رگیں پھٹ گئیں ۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ دماغ میں کئی دن پہلے سے خون بہہ رہا تھا اور اس غیر معمولی کام کی وجہ سے فالج کا اثر ہوگیا، جس کے سبب صبح سات بجے اٹھنے کے بعد سے وہ بات چیت نہ کرسکے اور بالآخر ۴ جنوری کی صبح کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے ۔ آخری مرتبہ بے ہوش ہونے سے قبل محمد علی دو گھنٹے تک تو نواب سر عبدالقیوم صاحب سے صوبہ سرحد کی اصلاحات کے متعلق باتیں کرتے رہے ۔ اس کے علاوہ دو گھنٹے تک سر شاہ نواز بھٹو سے صوبہ سندھ کے متعلق باتیں کرتے رہے ۔ باقی دو گھنٹے لاہور کی ایک بہن بیگم عزیز کے ساتھ گفتگو کرتے رہے، غرض اس طرح وہ مرتے دم تک بہادر مجاہد کی طرح کام کرتے ہوئے رحلت کر گئے ۔ ۔"

شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں امروہوی

مولانا محمد علی کی آخری علالت

(شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں صاحب (وفات ۲۱ دسمبر ۱۹۵۶ء) مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک، چھ سات سال ان کے ساتھ کام کرنے کی انھیں عزت بھی حاصل تھی۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی مرحوم سے بارہا ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور مارچ ۱۹۱۸ء میں جب موصوف نے بمبئی میں مستقل قیام کر لیا تو کبھی کبھار وہاں بھی مولانا سے ملاقات کے مواقع حاصل ہوئے۔ موصوف نے اپنے استاد پر "حیات اجمل" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو غالباً ۱۹۳۱ء میں دہلی سے شائع ہوئی ہے)

میں ہمیشہ مولانا مرحوم سے کہا کرتا تھا کہ "مولانا! اپنی صحت کو قوم کی خاطر سنبھالیے، آپ کی زندگی کی آپ کو اتنی احتیاج نہیں ہے، جتنی کہ آپ کی درماندہ قوم کو ہے" مگر افسوس انہوں نے ہمیشہ ملی اور قومی ضروریات کو ترجیح دی اور صحت کی بالکل پرواہ نہ کی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد علی کی ذات سے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی قومی ضرورت انھیں دعوت عمل دے رہی ہے اور وہ اپنی صحت کے لیے بیٹھے رہیں۔ ڈاکٹر چیخا کریں، حکیم چلایا کریں، مولانا شوکت علی ایسے بزرگ نہ رعب وداب کے ساتھ کتنا ہی شور مچایا کریں لیکن وہ جس کام کا ارادہ کر لیتے تھے پھر دنیا کی کوئی قوت اس سے انھیں باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ بالآخر ملت مسلمہ کو جو نقصان عظیم پہنچنا تھا پہنچ کر رہا اور نازک ترین وقت میں مولانا محمد علی

ہم سے جدا ہو گئے جبکہ اس وقت ہمیں ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

میں نے اپنی عمر میں سب سے پہلے مولانا محمد علی کو اس روز دیکھا تھا جس روز دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم کا گولا پھینکا گیا تھا اور جس روز گورنمنٹ آف انڈیا کا دفتر کلکتہ سے دہلی میں منتقل ہو رہا تھا۔ اس سے دو ماہ بیشتر "کامریڈ" اخبار کا دفتر دہلی میں آچکا تھا اور مولانا محمد علی دہلی میں مستقل قیام کی ابتدا کر چکے تھے۔ میں اس زمانے میں مدرسہ طبیہ میں پڑھتا تھا۔ جس روز لارڈ ہارڈنگ کے جلوس پر چاندنی چوک میں بم پھینکا گیا، اس وقت دن کے ۲ بجے کا وقت تھا۔ میں اس وقت جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ایک تماشائی کی حیثیت سے وائسرائے کے شاہی جلوس کا منتظر تھا۔ سڑک پر دو رویہ فوجیں کھڑی ہوئی تھیں فوج کی پشت پر دونوں طرف خلق خدا کا ہجوم اس طرح اپنی جگہ مقید تھا کہ کوئی متنفس اپنی جگہ سے ہل نہ سکتا تھا۔ جامع مسجد کے سامنے جلوس کو جس وقت ہو چکنا چاہئے تھا اس سے دو گھنٹے کی تاخیر ہو چکی تھی چاندنی چوک میں بم کے دھماکے کو ہم لوگوں نے ریلوے اسٹیشن پر توپوں کی سلامی سمجھ رکھا تھا، کسی کو خبر نہ تھی کہ وائسرائے پر بم پھینکا گیا ہے انگریز اور فوجی افسر اپنے گھوڑوں اور موٹر سائیکلوں پر ادھر ادھر بدحواس ہو کر دوڑ رہے تھے۔ لوگوں کا انتظار حد سے زیادہ گذر چکا تھا۔

آخر کار ایک فوجی افسر لال قلعہ کی طرف سے آکر جامع مسجد کے سامنے سے گذر رہا تھا، ادھر چیلوں کے کوچے کی طرف سے ایک دوسرا انگریز بجلی کی طرح جامع مسجد کے سامنے ہوا اور اس فوجی افسر کو گریبان میں ہاتھ ڈال کر پکڑ لیا اور کہا: "میں تمہیں ہرگز اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک تم جلوس کے لیٹ ہونے کا صحیح سبب مجھے بتا کر پبلک کو اطمینان نہ دلا دو گے" اس زمانے میں کسی صاحب بہادر سے اس قسم کی بے باکانہ گفتگو کو معجزہ سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ یہ بہادر ہندوستانی بصورت انگریز کون ہے، جس نے اس انگریز افسر کو اس طرح پکڑ رکھا ہے بالآخر "کامریڈ" اخبار کے ایڈیٹر مسٹر محمد علی نے اس فوجی افسر سے اصل سبب معلوم کر کے پبلک کے انتظار کو ختم کر دیا اور اعلان کیا کہ وائسرائے پر چاندنی چوک میں بم پھینکا گیا ہے، جلوس اب یہاں نہ آئے گا، آپ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔ یہ پہلا دن تھا جبکہ ان آنکھوں نے محمد علی کو پہلی بار دہلی میں دیکھا تھا۔

اس کے بعد حضور مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب بہادر کے ہاں، میرے زمانۂ بے کاری میں، شب و روز مولانا محمد علی حکیم صاحب کے ہاں تشریف لاتے تھے اور حکیم صاحب کے ساتھ تمام

قومی کاموں میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان ایام میں مجھے ان کی خدمت گذاری کا اکثر موقع ملا۔ اس زمانے میں بھی ان کو ذیابطیس کی شکایت رہتی تھی اور کئی برس تک مسلسل سال میں دو تین ماہ تک وہ حکیم صاحب مرحوم کی تجویز سے فولاد، زمرد، جوارش زعفرانی صبح و شام استعمال کیا کرتے۔ ان دواؤں کے استعمال سے افاقہ ہوجایا کرتا تھا، لیکن کچھ عرصے کے بعد جب ان کو ذیابطیس صادق شروع ہوگیا تو یہ دوائیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام عمر انھوں نے اپنے مرض کا علاج کیا اور بے حد کیا مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ کبھی صحیح اور مکمل علاج نہ کیا یا نہ کرسکے۔ آخر میں گذشتہ سال (۱۹۳۰ء) اپریل کے مہینے میں جب بمبئی تشریف لائے اور میں خلافت ہاؤس میں ان سے ملنے کے لئے حاضر ہوا تو میرے خطاب یافتہ (شعار الملک) کے بعد ان سے پہلی ملاقات تھی، ان کی شدت، اسہال پسند اور یکے اور تکلف ترک موالاتی ہونے کی حیثیت سے میرا احساس تو یہ تھا کہ آج کی ملاقات میں مجھے مولانا کی زبان سے ضرور دو چار کھری کھری باتیں سننے کے لئے تیار ہوجانا چاہیئے، مگر اس کے برخلاف میں نے مولانا کی طرف سے اس وقت ایسے پر اخلاص جذبات کا مشاہدہ کیا جو میرے لئے غیر معمولی طور پر حیرت انگیز تھے اور قابل فخر بھی۔ انھوں نے فرط مسرت کے ساتھ مجھے اپنے سینے سے لگایا، میری پیشانی پر بوسہ دیا، میری خدمات کو پسند کیا اور میری کامیابی پر اظہار مسرت کیا۔ یہ تھا ان کی خادم نوازی کا ایک نمونہ کہ باوجود اپنے عقیدے کے خلاف ورزی کے، انھوں نے اپنے ایک خادم کی فنی کامیابی کو بغیر تحسین کے نہ چھوڑا۔ اس کے بعد میرے اصرار پر کچھ دنوں زاہد بمبئی میں قیام کرکے، انھوں نے مجھ کو اپنے مرض کی صحیح تشخیص کرنے اور علاج کرنے کا موقع دیا۔ دوسرے روز صبح کو میں نے انہیں دیکھا، ان کی زبان سے تمام تغیرات بدنی کا حال سنا، ان کے اختبار دیکھے، قارورہ دیکھا اور آخر کار میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ ان کی عام بدنی خرابیوں کا ذمہ دار صرف ان کا مرض ذیابطیس ہے۔ صورت یہ تھی اگر وہ غذا میں نشاستہ اور شیرینی کو ترک کر دیتے تھے تو پیشاب میں شکر کا تناسب آدھا یا ایک پرسنٹ رہتا تھا اور اگر غذا کھانے میں ذرا بھی بے احتیاطی کرنے تھے تو شکر کا تناسب ڈھائی سے ۳ پرسنٹ ہوجاتا تھا۔ پیشاب میں مداومت کے ساتھ شکر جانے اور غذائی مادہ ضائع ہوتے رہنے کی وجہ سے بالآخر عصبی کمزوریاں شروع ہوگئیں۔ تمام بدن کے اعصاب میں ضعف اور تخدر شروع ہوگیا۔ بعد المنبع اعصاب میں بے حسی شروع ہوگئی۔ چنانچہ اول پاؤں کا انگوٹھا بے حس ہوا اور پھر یہ

سے جسمی پڑھنے لگی تو گھٹنے تک تمام پاؤں قدرِ مبتلا ہوگئے۔ یہی حال آنکھوں کے باریک ترین اعصاب کا ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک آنکھ کی بصارت زائل ہوگئی۔ دوسری آنکھ بھی کچھ ضعیف کام دے رہی تھی اور اس کے بھی ضائع ہوجانے کا ہر وقت اندیشہ لگا ہوا تھا، معدہ اور آنتوں کے اعصاب بھی اپنا کام صحیح انجام نہ دے رہے تھے، جس کی وجہ سے انھیں بھوک نہ لگتی، غذا صحیح ہضم نہ ہوتی تھی اور اس طرح ان کے تمام قویٰ یوماً فیوماً ضعیف ہوتے جا رہے تھے۔ یہ حالات تھے جبکہ میں نے ان کا علاج شروع کیا۔ میری تجویز دوائیں ان کی طبیعت کو پسند تھیں، بڑی رغبت کے ساتھ وہ انھیں استعمال فرماتے تھے۔ روزانہ صبح کو میں خلافت ہاؤس جاکر انھیں دیکھتا اور تقریباً ہر روز دو گھنٹے ان کے پاس بیٹھتا تھا۔ الغرض میں آٹھ دس روز ہی علاج کرنے پایا تھا اور ہضم کی اصلاح شروع ہوگئی تھی۔ تمام قوت کسی قدر بہتر ہوچلی تھی، مگر اصل مرض پر اب تک کچھ اثر نہ ہوا تھا کہ مولانا کو فوراً دہلی جانا پڑا اور میرے علاج کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ بند ہوگیا اور میرے دل کی حسرت تکمیل علاج دل ہی میں رہ گئی، اس کے بعد میری آخری ملاقات اس شب کو ہوئی جس کی صبح کو مولانا مرحوم لندن روانہ ہونے والے تھے۔ میں مسٹر اسحاق حسین کو ساتھ لے کر خلافت آفس پہونچا، وہاں دیکھا تو سینکڑوں آدمیوں کا خلافت ہاؤس میں ہجوم تھا جو مولانا سے ملاقات کے خواہشمند تھے، مگر کسی کو مولانا کے پاس اوپر والے حصۂ مکان میں جانے کی اجازت نہ تھی لیکن میرے آنے کی جب انھیں اطلاع ہوئی تو فوراً مجھے انھوں نے اوپر بلا لیا۔ اس وقت جو میں نے جاکر دیکھا تو ان کے حالات بہت زیادہ بدل چکے تھے۔ گذشتہ چار ماہ سے گاہے گاہے ملیریا بخار کا حملہ ہوتا تھا۔ ضعف بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ عصبی ضعف کی شدت کی وجہ سے قلبی حرکت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے ہر وقت ہارٹ فیل ہوجانے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ آنتوں کی حالت اب یہ ہوگئی تھی کہ بغیر نمک یا کوئی دوسری جلاب کی دوا لئے ہوئے اجابت نہ ہوتی تھی۔ مختلف گفتگو اور ملاقاتوں سے جو تاثرات بالعموم ہوتے ہیں، وہ قطعاً اس کے برداشت کرنے کے ناقابل تھے۔ مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور اس حالت میں انھیں یہ طویل اور خطرناک سفر پر آمادہ دیکھ کر میری طبیعت بہت زیادہ دلگیر اور مشوش ہوگئی۔ میں نے اس کے متعلق عرض کیا تو مولانا نے فرمایا کہ حکیم صاحب!

؎ یہاں تقریباً ۱۲ سطریں حذف کر دی گئی ہیں جو دینی سیاسیات سے متعلق تھیں۔

اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں، کیونکہ گول میز کانفرنس کے لئے جو مسلم نمائندگی تجویز ہوئی ہے اس میں کوئی ایک شخص بھی اگر میری جماعت میں کام کا ہوتا یا میری جماعت سے میرے کامل اعتماد کے قابل ہوتا تو میں ہرگز اس وقت نہ جاتا مگر کھلی آنکھوں مسلم مفاد عامہ کو یوں پامال ہوتا کس طرح دیکھ سکتا ہوں میری جان جاتی ہے جائے بار ہے مگر میں آخر سانس تک قومی مفاد کی حفاظت کروں گا[عه] میں نے اس کے بعد بھی ان سے التوائے سفر کے لئے اصرار کیا، مگر انھوں نے میری ایک نہ سنی اور مجھے اس طرح اطمینان دینا چاہا کہ کیا بعید ہے کہ سمندری ہوائیں میری صحت پر اثر ڈالیں اور وہاں پہونچ کر حالات بالکل بدل جائیں

عه۔ اسی سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی کو ایک خط (مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۳۰ء) میں لکھا تھا "اب تک صاحب فراش ہوں۔ کانفرنس کے روزانہ اجلاس میں صرف ہندوؤں اور انگریزوں بلکہ سب سے زیادہ خود مسلمان بھائیوں سے ایک ایک نقطہ پر جنگ کرنی پڑے گی ان محاذوں پر جنگ کرتے میں ہر وقت دل کی حرکت یکایک بند ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن اس پر بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس میں شریک ہوں اور وہاں سلطان جائر اور رعایائے جائر دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں۔" خطوط محمد علی مرتبہ: پروفیسر محمد سرور۔ مطبوعہ۔ مکتبہ جامعہ اکتوبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۲۴۵)

ڈاکٹر احمد سجاد

محمد علی کی شخصیت کے عناصر اربعہ

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر   مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

مولانا محمد علی جوہر کی یہ شاعرانہ پیشگوئی اگر صحیح ہوتی تو ان کی قابل رشک زندگی اور موت پر ایچ جی ویلز جیسے عالمی شہرت کے دانشور یہ نہ کہتے کہ محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا، ان کی زبان برک کی زبان تھی اور ان کا قلم میکالے کا قلم تھا"۔ لندن ٹائمز کا ایڈیٹر ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتا کہ "وہ محمد علی اصول کے لئے جئے، اصول کے لئے مصیبت اٹھائی اور اصول کے لئے مرے"۔ اقبال کا حسب ذیل شعر بھی محمد علی کی شخصیت اور کردار پر بالکل صادق آتا ہے۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مگر ان شاندار الفاظ اور اشعار سے مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کے خط و خال پوری طرح پھر بھی واضح نہیں ہوتے، لہذا تجزیاتی مطالعہ کے لئے ہمیں ایک انگریز مفکر کی دی ہوئی چار کسوٹیوں کے مطابق موصوف کی زندگی اور ان کے کارناموں کا جائزہ لینا ہوگا۔ اس مفکر نے کسی فرد یا قوم کی زندگی کے مکمل مطالعہ کے لئے مندرجہ ذیل چار کسوٹیاں مقرر کی ہیں۔

(۱) ماضی سے تسلسل یعنی اکبر الہ آبادی کے لفظوں میں "درخت جڑ پہ ہو قائم تو استوار بھی ہے"

(۲) کشادہ ذہنی جس کے بغیر نئے خیالات و افکار اور ترقی کی نئی منزلوں کی نشاندہی ممکن نہیں۔

(۳) ذمہ داری کا احساس جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے لفظوں میں متمدن زندگی کی بنیاد ہے۔ اسے آپ اسلامی اصطلاحوں میں تقویٰ، عدل، اعلیٰ اخلاق اور قول و فعل میں ہم آہنگی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور

(۴) جرأت مندی جس کے بغیر اوپر کی تینوں خصوصیتیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں کیونکہ نمایاں اور

مثالی کردار کو تشکیل دینے والی صفت جرأت مندی ہی ہے۔

قبل اس کے کہ ان چار کسوٹیوں پر مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے اس پر اس تاریخ ساز شخصیت کے ذہنی پس منظر کو آپ اپنے سامنے رکھ لیں تو بہتر ہے اس پس منظر میں ان کی والدہ کی اصلاحی تربیت، علی گڑھ اور آکسفورڈ کی علمی و تعلیمی تربیت، اس عہد کا سیاسی جوش و خروش اور بال گنگا دھر تلک کے غیر معمولی اثرات پر اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لئے جمال الدین افغانی، علامہ شبلی وغیرہ کی ہمہ گیر کوششوں کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ یہ اور ان کے علاوہ دیگر عوامل نے مغرب کے خلاف شدید ردعمل اور اصلاح و انقلاب کی ایک عمومی فضا قائم کر دی تھی، چنانچہ اجتماعی سطح پر ابھی دنوں علی گڑھ کالج، ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن حمایت اسلام لاہور، دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء وغیرہ کا قیام عمل میں آیا اور انفرادی سطح پر اقبال، محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی عظیم شخصیتوں کا ظہور ہوا

محمد علی جوہر نے اپنی مختصر خود نوشت سوانح عمری میں یہ اعتراف کیا ہے کہ علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی میں علامہ شبلی کے درس قرآن اور "اسلام اور اسلامی زندگی" پر ان کے لکچرز ماضی کے تسلسل اور اس کی صحت مند روایتوں سے انہیں زندگی بھر جوڑے رکھا۔ چنانچہ جیل اور قید و بند کے زمانے میں قرآن، تاریخ اسلام اور عبادات کے مشق و مطالعہ کا ذوق کچھ اور نکھر گیا، یہاں تک کہ مولانا عبدالباری فرنگی محل کے مرید ہو گئے۔ ڈاڑھی رکھ لی اور عربی عبا کے عادی ہو کر مسٹر محمد علی سے "مولانا محمد علی" ہو گئے۔ جب علی گڑھ کی انگریزیت و مغربیت کو بدلنے میں ناکام رہے تو جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی، قرآن و سیرت اور عبادات پر خاص طور سے زور دیا۔ اسلام اور مسلمانوں پر جب اور جہاں کہیں چوٹ بھی سب سے زیادہ ذہنی تکلیف محمد علی جوہر کو ہوئی اور جس کا برملا اظہار کرنے میں بھی کبھی نہیں چوکے، نہ کبھی مصلحت کوشی کا شکار ہوئے، چنانچہ ایک موقع پر انہوں نے کہا کہ جہاں تک احکام خدا وندی کے تعلق کا سوال ہے " میں اول بھی مسلمان ہوں، دوم بھی مسلمان ہوں اور آخر بھی مسلمان ہوں خود انہی کا شعر ہے:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے   یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

حد تو یہ ہے کہ بقول جواہر لال نہرو کانگریس کی تجاویز میں بھی کسی نہ کسی بہانے سے مذہب داخل

کا حوالہ ضرور دیتے تھے۔ ہنڈ بہرواس کی مخالفت کرتے تو ان کے الحاد اور بددینی پر انہیں خوب ڈانٹتے۔ چنانچہ اسلام اور ملک وقوم کی خدمت کا جذبہ ہی تھا جس کی بنا پر انہیں خاصی ملازمت کو چھوڑ کر کامریڈ اور ہمدرد کے ذریعہ صحافت و سیاست کے خطرناک میدان میں بے محابا کود پڑے۔ پھر جنگ عظیم اول کے زمانے میں انگریزوں نے مجاہدین آزادی اور مسلمانان ترک و عرب کو جو چرکے لگائے ان سب کے نتیجے میں مولانا موصوف نے مشہور زمانہ خلافت تحریک شروع کی جس نے ۱۸۵۷ء کے بعد کے مایوس و مضمحل ہندی مسلمانوں کے تن مردہ میں نئی روح پھونک دی اور مولانا محمد علی کے لفظوں میں جس تحریک نے انقلاب فرانس کی یاد تازہ کر دی۔"

یہ اور اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا محمد علی جوہر نے ماضی کی مستند روایتوں سے مکمل وابستگی کے باوجود ملک وقوم کو نئی زندگی اور نئی آگہی بخشی۔ اس سلسلے میں بڑی بڑی مخالفتوں اور رکاوٹوں کی کبھی پروا نہ کی۔ نہ لیڈری و ناموری کے لئے کبھی دون الوطنی، چاپلوسی یا بزدلی کی ادنیٰ سی جھلک بھی آنے دی۔ مرحوم کا یہ شعر ان کی شخصیت کا بہترین آئینہ کہا جا سکتا ہے۔

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف   کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

جہاں تک دوسری خصوصیت کشادہ ذہنی اور فراخ دلی کا تعلق ہے انہوں نے اپنی تمام اسلامیت کے باوجود زندگی میں کبھی بھی تنگ نظری اور عصبیت کو قریب بھی آنے نہ دیا۔ انفرادی تعلقات سے ہٹ کر ملک و ملت کے اجتماعی مسائل تک میں وہ حق و صداقت کے اندر رہتے ہوئے ہر شخص اور گروہ کو اظہار خیال اور اختلاف رائے کا پورا پورا حق دیتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ تعصب، عصبیت اور تنگ نظری کا موصوف پر فی الفور ردعمل ہوا کرتا تھا، اس لئے پوری صفائی کے ساتھ اس کی نشاندہی بھی کر دیتے تھے جس کے نتیجے میں ان کے قریب ترین ساتھیوں کو بھی بسا اوقات غلط فہمی ہو جاتی تھی۔

مہاتما گاندھی نے جنوبی افریقہ میں انسانیت اور سیاست و مذہب کی جو غیر معمولی خدمات انجام دی تھیں ان سے مولانا موصوف بے حد متاثر تھے چودھری خلیق الزماں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ گاندھی جی کے تقریباً ان دیکھے عاشق تھے ۱۳؍ اپریل ۱۵ء کو گاندھی جی سے مولانا کی پہلی بار ملاقات ہوئی تو وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "پہلی ہی نظر میں ان کی محبت کا قائل ہو گیا۔"

پنڈت جواہر لال نہرو سے فکری تضاد کے باوجود اپنے دورِ صدارت میں انہیں زبردستی آل انڈیا کانگریس پارٹی کا جنرل سکریٹری منتخب کروایا۔ ترکِ موالات کی تحریک شروع ہوئی تو اس کے بعد زندگی بھر کھدر پوش رہے یہاں تک کہ کفن بھی کھدر ہی کا تھا۔ آخر آخر میں انہیں کانگریس سے شکایات پیدا ہوگئی تھیں، مگر اس کے باوجود مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو وغیرہ سے آخر وقت تک اپنے ذاتی تعلقات میں کوئی فرق آنے نہ دیا۔

موصوف نے ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی جنگ آزادی کی کامیابی کے لئے اتنا کچھ لکھا اور کہا ہے کہ ان کا بڑے سے بڑا مخالف انھیں تنگ نظر اور فرقہ پرست نہیں کہہ سکتا۔

پیں چند رپال نے ہندوستانی حکومت کی جب فرقہ پرستانہ تعبیر کی تو ۱۵ اپریل ۱۹۲۱ء کے کامریڈ میں اس پر شدید تنقید کی۔ اسلامی معاملات میں جہاں خود کو اول و آخر مسلمان کہتے تھے، وہیں ملکی اور قومی امور میں خود کو اول و آخر ہندوستانی بھی کہتے تھے گاندھی جی کی خدمات پر ایک مرتبہ جب انہوں نے تنقید کی تھی اور اس پر جو ہنگامہ ہوا تھا تو اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ سیاسی معاملات میں میں گاندھی جی کو اپنی والدہ مکرمہ اور پیر و مرشد سے بھی زیادہ قابلِ احترام تصور کرتا ہوں ملکی اتحاد اور ہندو مسلم مسئلہ پر انہوں نے تقریباً ساٹھ سال قبل جو کچھ کہا ہے اسے آج بھی ان کی اعلیٰ ظرفی ہی پر محمول کیا جائے گا۔ فسادات کے موقع پر وہ ہمیشہ صبر و ضبط اور امن و اماں قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کو اپنی جانوں تک کو قربان کر دینے کی تلقین کرتے۔ ڈاکٹر مونجے کی سنگھٹن تحریک اور آریہ سماجی لیڈر سوامی شردھانند کی شدھی تحریک کے جواب میں ڈاکٹر حفیظ الدین کچلو وغیرہ نے جب تبلیغ و تنظیم کی تحریک شروع کی تو مولانا نے ڈاکٹر سیف الدین کی مخالفت کر کے مسلمانوں کے غلط دعصب کو اپنے خلاف دعوت دے دی۔

گول میز کانفرنس کے موقع پر ارباب اقتدار سے دو ٹوک انداز میں کہہ دیا کہ ہندو مسلم فرقہ وارانہ مسئلہ دراصل انگریزوں کی ظالمانہ پالیسی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا براہ راست شاخسانہ ہے

اقلیتی مسئلہ پر جب بھی گفتگو کی تمام اقلیتوں کو سامنے رکھ کے کی۔ مولانا کے الفاظ ہیں:

"ہندوستان میں بلاشبہ اقلیتیں ہیں اور یقیناً ہم کو ان کے لئے ایسا انتظام کرنا چاہئے کہ

وہ محسوس کریں کہ آئندہ حکومت محض ایک یا دو اقوام کی حکومت نہ ہوگی بلکہ تمام ہندوستانیوں کی حکومت ہوگی جس میں ذات اور عقائد کا امتیاز باقی نہ رہے گا۔

وہ عملی اتحاد کے لئے ہمیشہ لڑتے رہے۔ جمہوریت کی کامیابی کے لئے انھوں نے جن پانچ نکات پر زور دیا تھا، ان کی اہمیت و افادیت آج بھی قائم ہے۔ وہ پانچ یہ ہیں: (۱) ہندو مسلم اتحاد (۲) اقلیتوں میں احساس سلامتی (۳) نسل پرستی سے علیحدگی (۴) تعلیم میں سدھار (کیونکہ جدید تعلیم نے ان کے خیال میں مذہب پرستی کے بجائے فرقہ پرستی سکھائی ہے) اور (۵) رائے عامہ کی تربیت۔

ان کی اسی بلند حوصلگی اور کشادہ ذہنی کا نتیجہ تھا کہ ان کی موت کی خبر سے بلا تفریق مذہب و ملت نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم انسانیت کو صدمہ ہوا۔ گاندھی جی نے ان الفاظ میں اظہار غم کیا: "مولانا محمد علی جوہر کی موت اس وقت واقع ہوئی جبکہ ہمیں ان کی ضرورت تھی۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے زبردست کام کیا ہے۔" جواہر لال نہرو نے فرمایا: "مولانا محمد علی جوہر کو رجعت پسندوں سے کوئی نسبت ہی نہ تھی جو فرقہ وارانہ مسائل کے علمبردار بنے گھوم رہے ہیں۔"

تیسری خصوصیت ذمہ داری کے احساس اور عدل و انصاف کے معاملے میں تو ان کے احساسات بہت شدید تھے۔ اس معاملے میں مداہنت، ابن الوقتی یا تعصب کو انگیز کرنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ ۱۹۲۸ء میں موتی لال نہرو رپورٹ کی کھل کر صرف اس لئے مخالفت کی کہ اس میں مکمل آزادی کے نصب العین سے پہلو تہی کی گئی تھی اور مسلمانوں کے بعض مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ جامعہ ملیہ کے لائق و فائق شاگرد دراجنگ بہادر نے واشگاف لفظوں میں ان اعلیٰ مقاصد کے لئے ان کی بے داغ ایمانداری اور وطن کے لئے ناقابل تردید دیانتداری" کو تسلیم کیا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کی جرأت اور بیباکی کا تو سارا زمانہ ہی معترف تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جنگ آزادی کی پوری تاریخ میں اس جیسے جری اور بےخوف لیڈر بہت کم ہوں گے یوں تو مجاہدین آزادی کی صفوں میں ایک سے ایک نڈر موجود تھے، جو حکومت وقت، جیل اور پھانسی تک کو خاطر میں نہ لاتے تھے، مگر ان میں بہت کم ایسے رہنما تھے جو وقت آنے پر اپنی پارٹی، اپنی قوم، یہاں تک کہ دوست و احباب اور عزیز و اقارب کو بھی انصاف کے معاملے میں کھری کھری سنانے کی ہمت رکھتے ہوں یہ نمایاں جرأت اگر کسی میں سب سے زیادہ تھی تو وہ محمد علی جوہر تھے خود ان ہی کا شعر ہے:

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو   خوش ہوں کہ وہ پیغام قضا میرے لئے ہے

یہ محض خوش گمان شاعر کی ترنگ نہیں بلکہ ان کی پوری زندگی اس کی شاہد ہے۔ اس بے مثال جرأت مندی اور بے باکی در اصل ان کی والدۂ محترمہ کی ذہنی تربیت کی رہین منت ہے۔ ذرا ان کی والدۂ محترمہ کی ہمت اور بہادری کا اندازہ تو کیجیے کہ ۱۹۱۷ء میں چھنڈواڑہ کی نظربندی کے زمانے میں جب انھیں یہ خبر ملی کہ ان کے صاحبزادے کو بعض ہتک آمیز شرطوں پر حکومت آزاد کرنے کو تیار ہے تو انہوں نے ایسا وہ تاریخی بیان دیا جو جنگ آزادی کی تاریخ میں آج تک کسی ماں نے نہ دیا ہوگا: "آزادی حاصل کرنے کے لیے اگر میرے بیٹے کوئی ایسی شرط قبول کریں گے جو اسلام کی شان کے خلاف اور مفاد ملک کے منافی ہوگی، تو باوجود اس تمام محبت کے جو قدرتاً مجھے اپنے بیٹوں سے ہے، اس کے قبل کہ وہ صراط مستقیم سے ہٹ سکیں، اپنے ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دوں گی" ایک ایسی ماں کا بیٹا اگر "اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد" کہتا ہے تو اس میں شعریت سے زیادہ اس کے شخصی جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء کو پانچ سالہ نظربندی کے بعد مولانا چھوٹے تو بال بچوں سے ملنے کے بجائے سیدھے امرتسر پہنچے جہاں جلیانوالہ باغ کے حادثہ عظیم کے بعد کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت تحریک کے پرجوش اجلاس ہو رہے تھے۔ وہاں ان کا زبردست خیرمقدم کیا گیا۔ مولانا نے اپنی ایک پرجوش تقریر میں فرمایا:

"میں کہتا ہوں، اس آزادی کے لئے مسٹر تلک کو پھر جیل جانا چاہئے، مجھے دوبارہ عمر بھر کے لئے نظربند ہونا چاہئے، مسٹر بسنٹ کو پھانسی پر چڑھا جانا چاہئے مگر اس قسم کے مظالم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہونا چاہئے جیسے کہ پنجاب میں ہوتے۔"

پروفیسر مجیب جیسے عظیم مؤرخ اور محمد علی کے ناقد بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ زندگی میں کبھی بھی احساس کمتری کے شکار نہ ہوتے۔ بڑی سے بڑی شخصیت سے کبھی مرعوب نہ ہوتے۔ پروفیسر مجیب کے الفاظ ہیں:

"۱۰ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں کراچی میں اپنے خلاف مقدمے کے دوران انھوں نے جس طرح اور جس خود اعتمادی کے ساتھ جج اور جیوری کا مذاق اڑایا تھا، اس سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں۔"

(جامعہ مولانا محمد علی نمبر ص ۹۳)

چنانچہ سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر ریمزے میک ڈونلڈ وزیر اعظم برطانیہ کے خلاف لکھتے ہوئے طنزاً ان کے نام کو مسخ کر کے "رام جی مکھن لال" تک لکھا۔

دنیا جانتی ہے کہ تحریک خلافت، ترک موالات اور کانگریس کی جس جوش و خروش اور ہمت و جرأت کے ساتھ محمد علی نے قیادت کے فرائض انجام دیئے، اس کی بنا پر ہندوستان کے مسائل نے بین الاقوامی حیثیت حاصل کر لی۔ "کانگریس جو اب تک تعلیم یافتہ خوش حال اور خواص کی پارٹی تھی اب عوامی بن گئی۔ بدیشی مال کا ملک گیر پیمانے پر بائیکاٹ کیا جانے لگا اور صد الماجد دریابادی کے لفظوں میں جیل جانا ہنسی کھیل ہو گیا۔

شمع آزادی کا یہ پروانہ جان لیوا بیماریوں سے تھک چکا تھا مگر فرض پکارتا ہے تو عزیزوں کی مخالفت کے باوجود جان ہتھیلی پر رکھ کر گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن کا سفر کرتا ہے۔ وہاں اس نے برطانوی سامراج کو جس انداز سے خطاب کیا، اسے راجہ سنگ بہادر کے لفظوں میں "عالم نزع کا نعرہ" کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ شہید آزادی نے فرمایا تھا:

"میں اپنے ملک کو اسی صورت میں واپس جاؤنگا جب ایسی آزادی جس پر آزادی کا اطلاق ہو سکے، میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں، بشرطیکہ وہ آزاد ملک ہو، مرنے کو ترجیح دوں گا۔ اگر آپ ہندوستان کو آزادی نہیں دیں گے تو آپ کو یہاں میرے لئے قبر کا انتظام کرنا ہو گا۔"

خدا نے اس مجاہد اعظم کے الفاظ کی لاج رکھ لی اور غلام ہندوستان میں واپس آنے کے بجائے وہیں لندن میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی اور ان کے جامد مرنیہ کی مناسبت سے ان کی آخری آرام گاہ کے لئے سرزمین انبیاء یعنی بیت المقدس میں جگہ ملی اور ان کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر   یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

یہ تھی وہ مختصر سی روداد جو ان کی شخصیت کے عناصر اربعہ کے سلسلے میں پیش کی جا سکی تھی۔ اس مثالی شخصیت کی ان چار خصوصیات کو اب شاعر مشرق علامہ اقبال کے ان چار عناصر

پرکھ کر دیکھ لیجئے، آپ دونوں کسوٹیوں میں حیرت انگیز مماثلت پائیں گے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

مولانا محمد علی نے ۱۵ نومبر ۱۹۳۰ء کو گول میز کانفرنس لندن میں جو مشہور تقریر کی تھی، اس میں ایک جگہ فرمایا تھا کہ: "جن امور کا ہندوستان سے تعلق ہے، میں اول ہندوستانی ہوں، دوم ہندوستانی ہوں اور آخر میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی کے سوا کچھ نہیں۔ میں ان مساوی الجسامت دائروں سے تعلق رکھتا ہوں جن کے دو مختلف مرکز ہیں، ایک ہندوستان اور دوسرا دنیائے اسلام۔ جب میں ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے صدر کی حیثیت سے انگلستان آیا تو میرے دوستوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کو اپنے سامان کیلئے کوئی نشان خصوصی مقرر کر لینا چاہئے۔ میں نے اس پر عمل کیا اور اس کو دو دائروں میں تقسیم کر دیا۔ ایک دائرے میں لفظ "ہندوستان" تھا اور دوسرے دائرے میں "اسلام" لفظ خلافت کے پہلو میں موجود رہا۔ ہم بہ حیثیت مسلمانان ہند کے دونوں دائروں میں شامل ہیں۔ ہم ان دونوں دائروں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں سے ہر ایک تیس کروڑ نفوس انسانی پر مشتمل ہے اور ہم ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑ سکتے۔"

(حیات جوہر مرتبہ: مسٹر بلرامی (مطبوعہ علی گڑھ جنوری ۱۹۳۱ء صفحہ ۷۹)

معین شاکر

ترجمہ: محمد خلیق

ہندوستانی سیاست میں محمد علی کا حصہ

محمد علی مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی فکر کے بظاہر متضاد رجحانات میں ہم آہنگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ مذہب کی اقدار اور روح کی طرف بے توجہی برتنے بغیر سائنس اور جدیدیت کے حامی تھے۔ وہ نہ تو علماء کی جماعت کے ساتھ تھے اور نہ غیر علماء کے گروہ کے ساتھ بلکہ یہ چاہتے تھے کہ ان دونوں میں پائی جانے والی خلیج کو پر کرنے کی کوشش کی جائے جو اس زمانے یعنی انیسویں صدی کے اواخر میں عملاً ناممکن نظر آتا تھا۔ محمد علی میں دو رجحانات بیک وقت نظر آتے ہیں۔ یہ جیسے پرجوش علمبردار اسلام کے تھے اتنے ہی پرجوش قوم پرست بھی تھے۔ گاندھی جی کی طرح محمد علی بھی مذہب اور سیاست کے اتحاد کی نمائندگی کرتے تھے۔

محمد علی کو علی گڑھ تحریک نے جنم دیا تھا۔ انیسویں صدی کے آخری نصف میں سرسید نے جو کوشش کی تھی اس کی تاریخی اہمیت کو وہ سمجھتے تھے اور اس پر یقین رکھتے تھے کہ یہ تحریک ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد میں ہے۔ انہیں مغربی تعلیم کی افادیت سے انکار نہیں تھا لیکن وہ اس کی کورانہ تقلید کے حق میں نہیں تھے اور نہ یہ چاہتے تھے کہ مشرقی یا ہندوستانی روایات کو بالکل ترک کر دیا جائے لیکن چونکہ علی گڑھ تحریک کا بنیادی مقصد یعنی فلسفے، سائنس اور مذہب میں امتزاج نہیں حاصل ہو سکا تھا اس لئے تحریک کی اصلاح کی ضرورت تھی۔ علی گڑھ تحریک کے تجربے سے محمد علی کو یقین ہو گیا تھا کہ مغربی تعلیم میں بعض خامیاں تھیں۔ مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں نہ تو مجلسی روایات کی قدر تھی اور نہ حق کی تلاش اور تحقیق کا جذبہ باقی تھا۔ روحانی اور غیر روحانی مسائل سے متعلق ان کا تصور نیم پختہ تھا۔ برطانوی طریقہ تعلیم ہندوستانی مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایسے لوگوں کو جنم دیا تھا جو مذہبی سے زیادہ فرقہ

پرست تھے۔ لیکن مولانا آزاد اور شبلی نعمانی کی طرح انھوں نے انگریزی تعلیم کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اٹھارھویں اور ابتدائی انیسویں صدی میں مسلمانوں کا سیاسی رجحان سرگرم سامراج دشمنی کی طرف مائل تھا۔ مسلمان انگریزوں کو نکالنا اور ملک میں ہندوستانی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کا نعرہ اسلام کے احیا نہیں تھا بلکہ یہ غیر ملکی حکومت کو ختم کرنے کے لئے ملک کے تمام فرقوں میں اشتراک اور اتحاد کے خواہاں تھے۔ مسلمان ملکوں کی طرف ان کا رویہ ہمدردی کا تھا۔ تعلیم اور مذہب کے میدان میں بعض برطانوی پالیسیوں سے اس جذبے کو اور بھی تقویت ملی۔ سرسید کی قیادت کے ابھرنے سے انگریز دشمنی کی روایت نہیں ختم ہوئی۔ ان کے سیاسی طرز عمل کے نتیجے میں مسلمان افسروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو حکومت کا وفادار تھا لیکن اس کو حکومت کا اعتماد نہیں حاصل تھا۔ برطانوی حکومت کا ایک حصہ ایسا تھا جس کے لئے مسلمانوں کی وفاداری مشتبہ تھی۔ اس کو یقین تھا کہ مسلمان صرف مسلم حکومت کے وفادار ہو سکتے ہیں۔ سر اے۔ پی۔ میکڈونل کو اس نظریے کا نمائندہ سمجھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے صاف صاف لارڈ کرزن سے کہا تھا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کے غلبے کو ترجیح دیں گے کیونکہ مسلمان قدرتاً انگریزوں کے خلاف تھے۔ اسی طرز فکر کا نتیجہ تھا کہ الہ آباد یونیورسٹی کے نصاب سے فارسی کو خارج کر دیا گیا۔ تحصیلداری اور ڈپٹی کلکٹری کے امیدواروں کی فہرست کو اسلئے مسترد کر دیا گیا کیونکہ اس میں مسلمانوں کے بہت نام تھے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی کہ پولس کے محکمے میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد کیوں زیادہ تھی۔ حکم جاری ہوا کہ حکومت کے کسی شعبے میں ہندوؤں کے مقابلے میں تین سے زیادہ مسلمانوں کا تقرر نہ کیا جائے۔ مسلمانوں کی تشویش میں اور بھی اضافہ ہوا جب اس وفد کی ہمت افزائی کی گئی جس کا یہ مطالبہ تھا کہ فارسی کی جگہ دیوناگری رسم الخط ہونا چاہئے۔ اس سے سرسید کی تحریک کو یقیناً سخت دھکا لگا اور مسلمانوں میں بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم قیادت زمینداروں کے بااثر حلقے کے ہاتھ سے نکل کر ترقی پسند رجحانات رکھنے والے نوجوانوں کے ہاتھ میں آگئی اور یہی لوگ احتجاجی تحریک کے روح رواں بن گئے اور اول الذکر صرف تماشائی بن کر رہ گئے۔ یہ نوجوان لیڈر کانگریس کے دشمن اور انگریزوں کے حامی نہیں بننا چاہتے تھے۔ یہ لوگ عوامی سیاست پر یقین رکھتے تھے اگرچہ ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلم یونیورسٹی کی خصوصیت کو برقرار رکھا جائے اور سول سروس

اور عدلیے میں مسلمانوں کو بھرتی کیا جائے۔ ترقی پسند رجحان رکھنے والے انھیں مسلمان نوجوانوں میں محمد علی بھی تھے۔

دوسرے مسلمان نوجوانوں کی طرح محمد علی کی بھی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی اور یہ جمال الدین افغانی، آرنلڈ اور شبلی کی تعلیمات سے متاثر رہے۔ یہ اسلام کو قوم سے بالاتر سمجھتے تھے۔ عالمی خلافت پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے اپنے ملک کی سرحدوں سے باہر دیکھنا ضروری تھا۔ خلافت کلاسیکی اسلامی سیاسی نظریے کا ایک حصہ تھی۔ عثمانی خلافت میں مسلمانوں کی دلچسپی کی تاریخ ابتدائی انیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ دلچسپی سیاسی نہیں بلکہ مذہبی تھی۔ انگریز اس حقیقت سے واقف تھے اور اس کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ۱۸۰۵ء میں برطانیہ عثمانی خلافت سے یہ اعلان کرانے میں کامیاب ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو برطانیہ کا وفادار رہنا چاہئے۔ عزیز احمد کے مطابق جنگ کریمیا سے لے کر ۱۸۷۸ء تک برطانوی پالیسی یہ بھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ترک دوستی کے جذبے کی ہمت افزائی کی جائے۔ ۱۸۷۷ء کی روس اور ترکی کی لڑائی میں مسلمانوں نے ترکی کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ آگے چل کر مسلمانوں کی اس ہمدردی کا برطانوی پالیسی سے تصادم ناگزیر تھا کیونکہ اس کے بعد سے برطانوی خارجہ پالیسی ترکی اور مصر کے خلاف ہوگئی۔ ڈبلو۔ اس بلنٹ نے لکھا ہے کہ مشتبہ برلن معاہدے، سائپرس پر ناجائز قبضے اور مصر میں برطانوی خارجیت نے مسلمانوں کے ایک گروہ کو برطانیہ کے خلاف کردیا۔ برطانیہ کے ساتھ سرسید کی وفاداری اور سلطان عبدالحمید سے مخالفت کے باوجود یہاں اسلامی جذبات بڑھتے رہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کی حیثیت کو سامراجی طاقتوں سے خطرہ تھا اور برطانیہ کی چشم پوشی کی وجہ سے مراکش فرانسیسی مقبوضہ بن گیا تھا اور عثمانی صوبے لیبیا پر اطالوی تسلط قائم ہوگیا تھا۔ عام طور پر یہ شبہ کیا جانے لگا تھا کہ فارس اور ترکی کو آپس میں بانٹ لینے کے لئے برطانیہ اور روس کے پاس خفیہ معاہدہ تھا۔ ۱۳-۱۹۱۲ء کی بلقان جنگ کے دوران مسلمانوں کا ایک طبی وفد وہاں بھیجا گیا تھا۔ پہلی عظیم جنگ کے دوران ترکی کے ساتھ مسلمانوں کی ہمدردی اور دلچسپی ایک روحانی قسم کی تھی جو انگریزوں سے منافرت کا نتیجہ تھی۔ میکڈونل نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ "اس میں شک نہیں کہ ترکی کے ساتھ بڑی ہمدردی پائی جاتی ہے اور یہ کہ اس جذبے نے اسلامی احیاء کی شکل اختیار کرلی ہے جو میرے خیال میں کچھ تو خارجی ہمت افزائی اور کچھ داخلی حالات کا نتیجہ ہے۔ یہ جذبہ ایک مدت سے آہستہ

آہستہ پروان چڑھا ہے آگرہ کے کمشنر نے مجھ کو بتلایا کہ ملاہوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ترکی ٹوپی پہننے لگی ہے جس سے ہوا کے رخ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے " مسٹن کا کہنا تھا کہ پان اسلامیت صرف ایک مقصد کی خاطر تھی جس کے ذریعہ مسلمان ایک عظیم روایت کے ساتھ رشتہ قائم رکھنا چاہتا تھا ممکن ہے کہ یہ کوئی اخلاقی نصب العین ہو لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک جارحانہ رشتہ ہے کیونکہ اس منظر پر یہ چکر اسکالر الطلاق جارحیت پسند مولویوں کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے جو ناواقف عوام کے جذبات سے کھیلنا چاہتے ہیں - پان اسلامیت یہیں جنم لیتی ہے اور یہیں سے مسلمان قومیت کا نشوونما پیدا ہوتا ہے۔

یہ وہ پس منظر ہے جس میں محمد علی کے رول کو دیکھنا چاہئے۔ برطانوی حملے اور برطانوی خارجہ پالیسی کا مسلمانوں کی طرف سے جو رویہ تھا اس نے ہندوستان میں مسلم انتہا پسندی کے لئے راہ ہموار کی اس کے چیمپین محمد علی تھے جو ترقی پسند رجحان رکھنے والے نوجوان حلقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے کہ محمد علی تلک کو اپنا سیاسی گرد مانتے تھے تلک کی طرح یہ بھی ملک کی سیاسی تحریک کو عوامی بنیاد فراہم کرنے کے قائل تھے اور دونوں ہی کا مقصد خود اختیاری حاصل کرنا تھا اور دونوں ان طریقوں کو ناپسند کرتے تھے۔ جو اس دور کے آزاد خیال لوگوں نے اختیار کر لئے تھے یہ دونوں مذہب کو سیاسی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ محمد علی گاندھی جی اور ان کی قیادت کو اسی انتہاپسند زاویے سے دیکھتے تھے۔ یہ ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے اور اسلامی مفاد کے تحفظ کے لئے گاندھی کی حمایت کرتے تھے۔

محمد علی کے ذہن میں اسلام کا وہ روحانی تصور تھا جس کی نشوونما شبلی نعمانی اور سید امیر علی نے کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ محمد علی کے لئے اسلام اور پان اسلامیت میں کوئی فرق نہیں تھا ان کے خیال میں اسلام اور پان اسلامیت دنیا بھر کے مسلمانوں کی ایک اعلیٰ تنظیم تھی جو قومی حدود سے بالاتر تھی۔ یہ دونوں روحانی اتحاد اور سماجی نظام کا سرچشمہ تھے۔ محمد علی کی پان اسلامیت کا اظہار ۱۹۱۹ء کی خلافت تحریک کی شکل میں ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ خلافت کا مسئلہ سارے عالم اسلام کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور خلافت مسلمانوں کے بنیادی ادارے کی حیثیت سے ضروری ہے۔ ترکی کا خلیفہ پیغمبر اسلام کا جانشین ہے اور تمام مسلمانوں کے لئے قائد کی حیثیت رکھتا ہے انھوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرائیں کیونکہ غلام ہندوستان ترکی اور اس کے خلیفہ

کی کوئی مدد نہیں کرسکتا اس طرح محمد علی نے ہندوستانیت اور پان اسلامیت کے درمیان مصالحت کی راہ نکالی۔ انھوں نے اعلان کیا "جہاں تک حکم خداوندی کا سوال ہے میں اول و آخر مسلمان اور صرف مسلمان ہوں لیکن جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے میں اوّل و آخر ہندوستانی اور صرف ہندوستانی ہوں۔"

اسلام کے رومانی تصور کے مطابق اسلام زندگی کا ایک مکمل لائحۂ عمل اور سماجی زندگی کا ایک جامع نظام ہے جس کے دائرے میں پورا عالم انسانیت آتا ہے۔ اسلام کا یہ رومانی تصور یا تو آزاد اور محمد علی کی پان اسلامیت کی طرف لے جاتا ہے یا مولانا مودودی کے احیائے مذہب کی طرف۔ رومانی نظریے میں اسلام کی کسی تخلیقی تشریح کی گنجائش نہیں تھی

اپنے زمانے کی سیاسی مصلحت کے پیش نظر محمد علی کو رومانیت کا سہارا لینا پڑا۔ عملاً اس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام کی تعلیم پر سختی سے قائم رہتے ہوئے عقلیت پسندی استدلالی نقطۂ نظر مثبت سائنس اور غیر مقلدانہ فلسفے سے متصادم ہونے سے بچا جائے۔

محمد علی کی پان اسلامیت کے مضمرات کافی اہم تھے۔ چونکہ اسلام کے ہر پہلو کی تائید وہ اپنا فرض سمجھتے تھے اس لیے ان کی سیاسی فکر پر سیکولرزم سے زیادہ مذہبی رنگ غالب تھا۔ محمد علی کا خیال تھا کہ سیکولرزم اسلام کے دائرے کو محدود کر دے گی اور غیر دینی معاملات میں اس کو غیر موثر بنا دے گی۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ سیکولرزم قرآن کے احکامات اور پیغمبر اسلام کی سنت کے منافی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ 'جبر مذہب میں نہیں بلکہ مذہب کا ہے۔ مولانا عبدالباری کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا "جہاں تک سیاسی معاملات کا تعلق ہے ہر فرقے میں لیڈر ہیں۔ لیکن زندگی کی سب سے اہم جبر مذہب ہے اور اس میدان میں ہم اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتے جب تک کوئی عالم دین ہمارا لیڈر نہ ہو"۔ انھوں نے اس نظریے کو سخت ناپسند کیا کہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھنا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ مسلمان یا تو اپنے مذہب کی پیروی نہ کرسکیں کیونکہ مسلمان کی زندگی کا ہر شعبہ مذہب کا تابع تھا' یا یہ کہ سیاست کو روحانیت سے مبرا کر دیا جائے اور اس طرح اس کو عطائیوں اور بہروپیوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا دیا جائے۔ ان کے خیال میں سیکولرزم ایک مغربی تصور تھا جس کو مشرق میں نہیں برتا جاسکتا تھا۔ اصل مسئلہ مذہب کے حدود کو متعین کرنے کا تھا اور ان کے

خیال میں وہ باتیں جو مغرب میں سیاست کا حصہ تھیں وہ اسلامی مشرق میں مذہب کا حصہ تھیں۔ وہ حکومت الٰہی کے تصور کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے اور ان کے ہر سماجی اور سیاسی تصور پر یہی تصور حاوی تھا۔ انھوں نے کہا "مجھے اپنی غلطی کا اعتراف صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب قرآن، حدیث یا معتمد علماء کے ارشادات سے ثابت کر دیا جائے کہ میرا راستہ غلط ہے۔"

چونکہ اسلام میں رنگ اور علاقے کی بنا پر فرق نہیں کیا جاتا اس لئے مختلف لوگوں میں اتحاد اور تعاون مشترک مذہب کے اصولوں کی بنیاد پر ہی ممکن تھا۔ اہمیت قوم پرستی کی نہیں بلکہ اتحاد کی تھی محمد علی مغربی قوم پرستی کو اس لئے مضر سمجھتے تھے کیونکہ اس کی ماہیت سیکولر تھی قوم پرستی کسی ایک ملک یا جغرافیائی علاقے کے لوگوں کے لئے ہوتی ہے جہاں مادر وطن کی پرستش مذہبی فریضے کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن انسان بحیثیت انسان اپنے مذہب کا وفادار ہوتا ہے اور مذہب قومی سرحدوں سے باہر بھی ہو سکتا ہے۔ اسلام میں علاقائی قوم پرستی کا کوئی مقام نہیں۔ کیونکہ عرب اور غیر عرب میں امتیاز نہیں کرتا۔ محمد علی نے لکھا: "اسلام ان تعصبات کی مذمت کرتا ہے جو انسانیت کی جگہ پر قومیت کو جنم دیتے ہیں عربی اور عجمی یا آریائی اور غیر آریائی یا دوسری نسلوں کے ہونے کی بنا پر مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ میں نے ان تفرقوں کے بھیانک نتائج دیکھے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مذہب کے اعتبار سے اسلام قومیت سے بالاتر ہے اور اس لئے سیکولرزم کا مخالف ہے۔ سیکولر قوم پرستی خدا کا عطیہ نہیں شیطان کا عطیہ ہے۔ قوم پرستی اور مذہب میں زمین اور آسمان کا بعد ہے۔ مذہب کے بغیر قوم پرستی حق و باطل کی تمیز کے لئے زہر ہوتی ہے۔ ایک صالح مسلمان کو اس قوم پرستی سے احتراز کرنا چاہئے جس کا نعرہ یہ ہوتا ہے "ہمارا ملک ہمارا ملک ہے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح"۔ قوم پرستی کسی ملک کی پرستش کی تلقین کرتی ہے جبکہ اسلام صرف ایک اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہے اور وہ خدا کا اقتدار ہے جو لاشرط، لاشریک اور ناقابل تنسیخ ہے لیکن قوم پرستی اگر اسلام پرستی ہے تو وہ قابل قبول ہو سکتی ہے کیونکہ اس صورت میں یہ علاقائی یا سیکولر نہیں رہے گی اور نسل و مقام کے حدود سے آزاد ہو گی۔ یہ رویہ محمد علی کے خیالات کے عین مطابق تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ ایک طرف خلافت کو برقرار رکھا جائے اور دوسری طرف ملک کے اتحاد اور اس کی آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھا جائے۔

محمد علی کے یہاں فرقہ پرستی کا مخصوص مفہوم تھا۔ ملک کی آزادی کے ساتھ ملک کے مختلف

فرقوں کو ایک دوسرے کی بالادستی کے خوف سے آزاد ہونا ضروری تھا تاکہ مسلمان اپنے کلچر کا تحفظ کر سکیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور نسلوں سے مل جل کر ہی قوم بن سکتی ہے اور یہ اتحاد سیاسی سطح اور کچھ حد تک معاشرتی سطح پر ہو سکتا ہے۔ محمد علی کو ہمیشہ فرقہ پرست لیڈروں کی ہندو قوم پرستی کی طرف سے تشویش رہی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی قومیت اور ہندو مذہب کے حدود کو مشترک نہیں تصور کیا جا سکتا کیونکہ ان دونوں کو اگر ہم مرتبہ سمجھا جائے تو مختلف مذاہب کے ماننے والے کروڑوں ہندوستانی اس سے خارج ہو جائیں گے۔ چنانچہ محمد علی جو پہلے فرقہ وارانہ انتخابی حلقوں کے خلاف تھے اب اس کے حامی بن گئے۔ وہ فرقہ وارانہ نمائندگی اور انتخاب کے حق میں اس لئے تھے کہ مسلمانوں کو یہ تشویش ہو گئی تھی کہ سوراج عملاً ہندو راج کے مترادف تھا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے پان اسلامیت کے رجحان کے بہت تباہ کن نتائج برآمد ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پان اسلامیت مسلمانوں کی قرون وسطیٰ کی یک جہتی پر مبنی تھی جو اب قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ خلافت تحریک کے نتیجے میں بہت سے مسلمان ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔ محمد علی کا خیال تھا کہ مسلمان اگر خلافت کا تحفظ نہیں کر سکتے تو انہیں ہندوستان کو چھوڑ کر کسی اسلامی ملک میں چلے جانا چاہئے۔ اس پروپیگنڈے کے بہت غیر صحت مند نتائج برآمد ہوئے۔

مسلم سیاست کے ارتقا پر محمد علی کی پان اسلامیت کے اہم اثرات مرتب ہوئے۔ انہوں نے انگریز دشمنی اور غیر دستوری اقدام کے استعمال کا جواز نکال لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر برطانیہ ترکی کی خلافت کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو مسلمانوں کو یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ قبائلی علاقے میں اسلحہ سازی کے کارخانوں کی کیا صورت ہے اور وہاں ضرورت کے کتنے اسلحے تیار کئے جا سکتے ہیں۔ سامراجیت کے خلاف ان کے احتجاج اور ہندوستان کی آزادی کے لئے ان کی جدوجہد کے پس پشت یہ یقین تھا کہ انگریز مسلمانوں کے مذہبی دشمن ہیں۔ انہیں اس بات کا خیال نہیں رہا کہ اگر مذہب کی بنیاد قوم پرستی پر رکھی گئی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مسابقتی قومیتیں پیدا ہو جائیں گی اور ہندوستانی معاشرے میں خلفشار پھیل جائے گا۔ اسی عدم استقامت پر قائم رہتے ہوئے انہوں نے ہندوستان میں مذاہب کے اتحاد کا نصب العین پیش کیا جسکو وہ معاشرتی وفاق یا مذاہب کے وفاق کا نام دیتے تھے۔

مسلمانوں کی سیاست میں محمد علی کے حصے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پہلے لیڈر تھے کہ جنھوں نے

علما اور مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی وہ سمجھتے تھے کہ اس سے اسلام اور ملک کی آزادی دونوں کو تقویت ملے گی۔ خلافت کی تحریک علماء اور مغربی تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کے اتحاد کی نشانی تھی جس کا واحد مقصد مسلمانوں میں یکجہتی پیدا کرنا تھا۔ محمد علی کے انتقال کے بعد علماء اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے درمیان خلیج زیادہ گہری ہوگئی یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے محمد علی کا طریقہ اختیار کیا تھا انھیں نے پاکستان کے لیے جدوجہد کی اور اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

تقریباً پونے پانچ سال کی نظربندی سے رہا ہونے کے بعد، مولانا محمد علی امرتسر پہنچے تو ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کو کانگریس کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ: "ہم یہاں اس لئے جمع نہیں ہوئے ہیں کہ دوزانو جھک کر یہ درخواست کریں کہ ہم کو جیل خانوں سے آزاد کرادو، ہم کو پھانسی کے تختے سے بچالو۔ میں اپنے لئے اپیل نہیں کرتا۔ مجھے چند آدمیوں کی رہائی کی فکر نہیں ہے، ہم چند آدمیوں کو آزاد کرا کے سارے ملک کو غلام بنانا نہیں چاہتے۔ میں اس ملک کے نام پر بول رہا ہوں جس کی آزادی ہم کو بہت زیادہ عزیز ہے بہ نسبت کسی شخص واحد کی آزادی کے خواہ اس کی پوزیشن اور حقیقت کتنی ہی اعلیٰ اور بڑی کیوں نہ ہو۔

میں ضرور جیل بھیج دیا جاؤں۔ مسٹر تلک اگر ضرورت ہو تو تیسری مرتبہ جیل خانے روانہ کر دیئے جائیں۔ مسز بیسنٹ دوبارہ نظربند کر دی جائیں بلکہ اس بڑھاپے میں اگر ضرورت ہو تو ان ہی کے بالوں سے جکڑ کر ان کو پھانسی دے دی جائے، لیکن ہندوستان کو آزاد ہوتے دیکھئے تاکہ کوئی شخص آئندہ کسی ہندوستانی مرد اور عورت کے بارے میں یہ نہ کہہ سکے کہ وہ پیدائشی غلام ہے۔"

اوراقِ گم گشتہ، مرتبہ: رئیس احمد جعفری (مطبوعہ: لاہور۔ ۱۹۶۸) صفحہ ۵

قاضی محمد عبدالغفار مرحوم

مولانا محمد علی بحیثیت صحافی

پیش نظر مضمون قاضی محمد عبدالغفار (۱۸۸۸ء - ۱۷ جنوری ۱۹۵۶ء) کی ایک ریڈیو تقریر ہے جو دسمبر ۱۹۴۴ء میں حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی تھی اور اسی سال ۱۳ دسمبر کے روزنامہ "خلافت" (بمبئی) میں شائع ہوئی تھی۔ محمد ظہیر وارثی صاحب (کامٹی) نے ازراہ عنایت، جامعہ کے محمد علی نمبر کے لیے اس کی نقل بھیجی ہے اور ہماری درخواست پر "خلافت" کا وہ شمارہ بھی جس میں یہ تقریر شائع ہوئی ہے۔ اخبار بہت ہی بوسیدہ ہے اور کہیں کہیں سے کٹ گیا ہے، جس کی وجہ سے بعض جگہوں پر مضمون کی متعدد سطریں غائب ہوگئی ہیں مگر چونکہ خوش قسمتی سے یہ مضمون دو جگہ اور چھپا ہے، ایک علی گڑھ میگزین کے علی گڑھ نمبر (مرتبہ نسیم قریشی، ۵۵-۱۹۵۳ء) میں، دوسرے "علی برادران" (مرتبہ رئیس احمد جعفری، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۳ء) میں، اس لیے ان مضامین کی مدد سے تصحیح میں آسانی ہوگئی۔

پیش نظر مضمون اور باقی دونوں مضامین میں خاصا فرق ہے۔ کہیں کہیں الفاظ اور جملوں کا فرق ہے، مگر آخری حصہ بالکل مختلف ہے۔ علی گڑھ نمبر جب شائع ہوا تھا تو اس وقت قاضی صاحب مرحوم، انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکریٹری کی حیثیت سے علی گڑھ ہی میں تھے، اس لیے انھوں نے "علی گڑھ نمبر" کی مناسبت سے نظر ثانی کے علاوہ آخری حصے میں بنیادی تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ غالباً یہیں سے یہ مضمون "علی برادران" میں نقل کیا گیا ہے۔ لیکن یہ مضمون بنیادی طور پر وہ ہے جو حیدرآباد ریڈیو سے نشر ہوا تھا اور "خلافت" میں شائع ہوا ہے۔

فاضل مضمون نگار اردو کے مشہور ادیب اور ممتاز صحافی ہیں ۔ صحافت کا آغاز مولانا محمد علی کی نگرانی اور تربیت میں ہوا ہے ، اس لیے انھیں اپنا استاد مانتے ہیں اور خود مولانا نے انھیں "اردو کا محمد علی" لکھا ہے ۔ اپنے ایک خط میں قاضی صاحب کو لکھتے ہیں : "خدا تمھیں سلامت رکھے ، خوب کام کر رہے ہو ۔ واللہ تمھارا اوقات رشک آتا ہے ۔ اگر اپنی تعلّی نہ سمجھو تو کہوں کہ اردو کے محمد علی ہو ۔" (خطوط محمد علی صفحہ ۲۷۶)

موسم سرما اور وہ بھی دہلی کا موسم سرما اور وقت صبح ۵ بجے ۔ شوکت بھائی (یعنی مولانا شوکت علی) چند ماہ پہلے مجھے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دلاکر یہاں لے آئے تھے ۔ اب دسمبر ۱۳ء کی اس صبح کو ۶ بجے کلکتہ کی سکونت ترک کرکے پہلی دفعہ دلی آرہے تھے ۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا ، میں جیلوں کے کوچے سے بھاگم بھاگ چاندنی چوک تک پہنچا ۔ اس وقت کوئی تانگہ بھی میسّر نہ آیا ، اس لئے ریلوے اسٹیشن تک کا فاصلہ تقریباً دس میل بھاگتے بھاگتے طے کیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میری عمر ۲۲ سال سے زیادہ نہ تھی ، اس لئے دلی میں دسمبر کی کڑکڑاتی سردی میں ایک جوان جسم پر پسینے کا لطف دوبالا ہوگیا تھا ۔ اِس وقت تک تو میں شوکت علی سے خوب واقف تھا ، اس لیے کہ وہ میری شادی کے دن میری سسرال میں (یعنی سر محمد یعقوب کے مکان پر) اس وقت تشریف لائے تھے جب میں دولہا بنا بیٹھا تھا اور پہلا کام انھوں نے یہ کیا تھا کہ میرے سامنے سلامی کا جس قدر روپیہ رکھا تھا وہ سب اُٹھاکر مسلم یونیورسٹی کے چندے میں شریک کرلیا تھا ۔ مگر محمد علی کو میں نے ایک دو مرتبہ دور سے ہی دیکھا تھا ۔ البتہ اب دسمبر کی اِس ٹھنڈی صبح سے میرا ان کا وہ رابطہ شروع ہوتا تھا جو ان کی زندگی کے غروب آفتاب تک قائم رہا ۔ "کامریڈ" والے محمد علی سے اس قدر قریب آنے کا شوق میری جوانی کو بیتاب کر رہا تھا اور دلی ریلوے اسٹیشن کے اس پلیٹ فارم پر دسمبر کی وہ صبح میری زندگی کا ایک نیا باب شروع کر رہی تھی ۔

ہوڑہ ایکسپریس اپنے مقررہ وقت کے چند منٹ بعد پلیٹ فارم پر پہنچا اور ٹرین کی ایک آخری گاڑی سے ایک سُرمئی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے محمد علی برآمد ہوئے ۔ میری جوانی

بھی اس زمانہ میں لباس اور فیشن کی ترغیبات سے ہم آغوش تھی، اس لیے پہلی چیز جس کا رعب مجھ پر پڑا وہ محمد علی کے انگریزی لباس کی تراش خراش اور موزونیت تھی۔ آج تک یاد ہے کہ ان کے سرمئی سوٹ کے ساتھ ان کے جوتے اور موزے بھی سرمئی تھے۔ زندگی کے اس دور میں جوتوں اور موزوں کی رنگ آمیزی ہم نوجوانوں کی معاشرت کا گویا ایک بہت ہی اہم عنصر تھا۔ علی گڑھ میں ہم اس جامہ زیبی کا سبق پڑھتے تھے اور اس کو اپنی تعلیم و تربیت کا ایک امتیازی نشان سمجھا کرتے تھے۔ زندگی کی یہ قیمتیں ہمارے لیے اس وقت تک نہ بدلیں جب تک کہ مسٹر محمد علی اپنی عبا و ردا کے ساتھ مولانا محمد علی نہ بن گئے۔ اس دن صبح کو دلی کے ریلوے اسٹیشن پر جبکہ میں نے اس شخص کو دیکھا جس سے میری زندگی کو سالہا سال وابستہ رہنا تھا تو وہ نظر صرف اتنی ہی وسیع تھی کہ پہلی نظر آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ محمد علی کے سوٹ کی تراش اور سوٹ کے ساتھ موزوں اور جوتوں کے رنگ کے ربط پر گئی، باقی جو کچھ دیکھا تھا وہ بعد میں دیکھا۔ ۲۲ سال کی عمر میں جس کا ایک حصہ سرکاری ملازمت میں گزرا تھا ابھی اپنی نظر کا زاویہ قائم نہ کر سکی تھی۔ میں "کامریڈ" کے مضامین پڑھا کرتا تھا اور ان مضامین کے مطالب سے زیادہ انگریزی زبان پر محمد علی کے قلم کی قدرت کو دیکھا کرتا تھا۔ میرا دل اور میری طرح اس زمانے کے ہزارہا نوجوانوں کا دل جدید افکار کی وسعتوں اور خیالات کی بلندیوں سے ناآشنا تھا۔

"ہمدرد" کے شعبۂ ادارت میں جب میں ایک ادنیٰ شاگرد بن کر محمد علی کے سامنے بیٹھا تب کہیں ان چنگاریوں کی گرمی میں نے محسوس کی جو "کامریڈ" کے جواں سال اور بے باک ایڈیٹر کی شخصیت سے نکل کر ان کے نوجوان شاگردوں کو اذیت کوش ہونے کی دعوت دیتی تھی۔ ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو "ہمدرد" کا ایک ورقہ "نقیب ہمدرد" کے نام سے شائع ہوا تھا، اُس وقت تک بیروت سے ٹائپ کی کافی مقدار وصول نہ ہوئی تھی اس لیے یکم جون ۱۳ء سے پہلے "ہمدرد" اپنے پورے حجم کے ساتھ شائع نہ ہو سکا۔ یکم جون ۱۳ء کے بعد سے شعبۂ ادارت کا پورا کام شروع ہوا اور میں نے پہلی دفعہ محمد علی کے مددگار کی حیثیت سے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ ایک ادنیٰ شاگرد کی حیثیت سے میں نے

اُن کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا اور جب تک ۱۹۱۴ء کی جنگ کا ہنگامہ شروع نہ ہوا اور محمد علی کی مدیرانہ حیثیت قومی کاموں میں منتقل نہ ہوگئی وہ "ہمدرد" کے شعبۂ ادارت کی نگرانی کرتے رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ ایک ایسے استاد کی طرح جو بیک وقت شفیق بھی تھا اور سخت گیر بھی، انھوں نے صحافت کے ابتدائی اصول اپنے نوجوان مددگاروں کو سمجھانے کا طریقہ اس طرح مقرر کیا کہ ہفتے میں صرف ایک یا دو مضامین لکھ دئے جاتے تھے۔ ہر ہفتہ شام کو ادارت کے اراکین کی ایک مجلس مشاورت چیف ایڈیٹر کے کمرے میں منعقد ہوتی تھی۔ اس مجلس میں مرحوم اپنے ہر مددگار کے لیے ایک مضمون تجویز کرتے تھے، پھر اس مضمون کے متعلق کتابوں کی ایک فہرست لکھاتے تھے۔ بہت سی کتابیں اپنے کتب خانے سے نکال کر دیتے تھے ان کے خاص خاص ابواب اور صفحات کی نشان دہی وہی کرتے تھے اور بار بار اس اصول کو ذہن نشین کراتے رہتے تھے کہ لکھنے سے پہلے اور لکھنے سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ بعض دفعہ دس بارہ کتابیں پڑھنے کے بعد ایک اداریہ لکھنا ہوتا تھا۔ میرا پہلا اداریہ "ہمدرد" کی پہلی جلد کے آٹھویں پرچے میں ۸ جون کو شائع ہوا تھا لیکن میں یہ بتاؤں کہ وہ لکھا کس طرح گیا تھا تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ فن صحافت میں محمد علی کے شاگرد کس طرح تربیت حاصل کرتے تھے۔ دس بارہ کتابیں مجھے دی گئی تھیں تاکہ میں ان سب کو پڑھ لوں، کچھ نوٹ محمد علی نے لکھوائے تھے، آٹھ دس دن تک میں لکھنے کی تیاری کرتا رہا، پھر جب ایک حصہ لکھ لیا تو مسودہ ان کے پاس لایا۔ مجھے یاد ہے کہ چند ہی سطریں پڑھنے کے بعد انھوں نے منہ بنایا اور یہ کہہ کر مسودہ پھینک دیا کہ "یہ کیا فضولیات گھسیٹ کر لائے ہو۔"

میں کیا کہوں کہ اُس دن ایک خام کار نوجوان کی کس قدر دل شکنی ہوئی جس کو اپنے خیال میں بڑا ناز تھا اس بات پر کہ وہ "ہمدرد" کے ادارتی شعبہ جات میں اپنی خواہش کے اصرار پر شریک کیا گیا ہے، حالانکہ عمر اور تجربے میں وہ محمد علی کے تمام دوسرے شاگردوں سے کم نہیں تھا مگر چیف ایڈیٹر کی رائے میں اس کے پہلے ہی مضمون کا مسودہ فضولیات قرار پایا تو ظاہر ہے کہ اس نوجوان کی خود بینی کو جس قدر بھی صدمہ پہنچا

ہو وہ کم ہے۔ بڑی ذلت اور شرمندگی محسوس ہوئی، کچھ غصہ بھی آیا مگر اتنی جرأت نہ تھی کہ اس غصے کا ذرا بھی اظہار کیا جاتا۔ پھر ایک گھنٹے تک ان کا لیکچر پیا، پھر بہت کوشش کر کے ان کے خیالات کے مطابق از سرِ نو مضمون لکھا، پھر بھی وہ ناپسند ہوا مگر اتنا زیادہ نہیں جتنا کہ پہلی دفعہ۔ ہدایت ہوئی کہ ایک دفعہ پھر لکھو، رات بھر بیٹھ کر پھر لکھا اور صبح کو پیش کیا، پورا مضمون پڑھا گلے سے لگا لیا۔ تعریفوں کے پل باندھ گئے۔ پہلے جس قدر ان کی تنقید سے شرمندہ ہوا تھا اب اپنی توصیف سے شرمندہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس تنقید کی تلخی میں شہد اور دودھ کی نہریں بھی بہا کرتی ہیں۔ ہفتوں میرے ان مضامین کی تعریف ہوتی رہی، چنانچہ حوصلہ بڑھا اور خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ اب ان کی بات سمجھ میں آنے لگی۔ ان کا سا حافظہ یا ان کی سی ذہانت تو نصیب نہ ہوئی تھی اس لیے بلا مبالغہ سینکڑوں اور ہزاروں کتابیں اس طرح پڑھنی پڑیں کہ پنسل اور نوٹ بک پاس رکھی ہے۔ کام کی باتیں نوٹ کرتا جاتا ہوں، ہر مسئلے کے متعلق حاصل کردہ معلومات کو ایک علاحدہ فائل میں محفوظ کر دیتا ہوں اور ضرورت کے وقت اس سے کام لیتا ہوں۔ مضمون لکھتا ہوں تو زیادہ کوشش اس بات کی کرتا ہوں کہ وہ معلومات سے پُر ہو اور معلومات بھی ایسی جو صحیح ہوں۔ خود محمد علی کو جب کوئی مضمون لکھنا ہوتا تھا تو وہ راتوں کو اس طرح جاگتے تھے کہ ان کے بستر پر کتابوں، اخباروں، رسالوں اور تراشوں کا ایک انبار ہوتا تھا اور سرخ پنسل ہاتھ میں ہوتی تھی۔ ان تیاریوں کے بعد وہ لکھنے بیٹھتے تھے تو اپنی طرزِ نگارش کے ساتھ اپنی بیش بہا معلومات اور دلائل کی قوت میں اضافہ کرتے تھے۔ ان کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ ہر مسئلے کی تفصیلات پر گہری نظر ڈالتے تھے اور بعض اوقات تو میں سمجھتا تھا کہ وہ بال کی کھال نکال رہے ہیں لیکن بعد کو معلوم ہوتا تھا کہ نہیں چھوٹی چھوٹی تفصیلات ہی سے بڑے بڑے دلائل مستحکم کیے جاتے ہیں۔

ہر شریک کار کو ان کے خلوص اور محبت سے بھرے دل میں جگہ ملتی تھی۔ ظاہری عتاب اور غصہ، جو آخر میں اعصابی امراض کی وجہ سے زیادہ ہو گیا تھا، محض عارضی ہوتا تھا ایک دفعہ ان کے ایک مضمون کا پروف میں نے دیکھا تھا، اس میں کوئی غلطی رہ گئی

مزاج برہم ہوگیا۔ دفتر میں آکر بس مجھ پر برس پڑے۔ میں بھی کچھ برسا اور اسی وقت استعفیٰ رکھ کر گھر چلا آیا۔ دوسرے دن شوکت بھائی زبردستی پکڑ کر لے گئے اور میں گیا بھی تو یہ سن کر کہ محمد علی نے کل سے کھانا نہیں کھایا ہے اور بہت مغموم ہیں۔ ان کے سامنے پہنچا تو شکایت و حکایت تو کجا لپٹ کر اس طرح رونے لگے کہ مجھ پر ہزاروں گھڑے پانی پڑ گئے۔ میری شکایت ندامت بن گئی اور توبہ کرنی پڑی کہ اب ایسا نہ ہوگا۔ اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں سے محبت کے جواب میں وہ محبت مانگا کرتے تھے اور اگر ہم اپنی کم فہمی سے ان کی کسی شکایت اور غصے سے خفا ہو جاتے تھے تو ان کے قلبِ صافی کی سادگی ایسی تھی کہ وہ خود ہی حیران ہو جاتے تھے کہ میں نے یہ کیا کیا۔

جو کچھ اس بے مثل اُستاد، اس محبت کرنے والے بھائی، اس شفیق دوست سے میں نے سیکھا وہ میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ صحافت ان کی زندگی کا کوئی واحد مقصد نہ تھا بلکہ وہ تو کسی بڑے مقصد کے لیے محض آلۂ کار تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو محمد علی ہندوستان میں آج سب سے بڑے اور کامیاب صحیفہ نگار سمجھے جاتے۔ "ہمدرد" کے اجرا کے چند ہی روز بعد ان کی قومی مصروفیت نے اپنے لیے بڑے میدان اور خارزار پیدا کر لیے تھے، اس لیے وہ صحافت کو اپنی نظر میں اس سے زیادہ کچھ نہ سمجھتے تھے کہ :

میرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں یہ بھی

چنانچہ رفتہ رفتہ "کامریڈ" اور "ہمدرد" کے کاموں سے ان کا تعلق بہت کم ہوگیا اور "ہمدرد" کی ذمہ داریاں بڑی حد تک مجھ پر اور سید جالب مرحوم پر اور "کامریڈ" کی ذمہ داریاں مرحوم راجہ غلام حسین پر عاید ہوگئیں۔ ان کی نظربندی کے بعد بھی کچھ عرصے تک میں "ہمدرد" سے وابستہ رہا، لیکن بعد میں خود ان ہی کے اشارے سے میں نے کلکتہ جا کر وہاں سے روزنامہ "جمہور" جاری کیا، اس طرح میں ان سے دور ہوگیا لیکن بقول استاد مرحوم کے :

دل کی فضا میں بُعدِ زمان و مکاں نہیں

محمد علی کی صحافتی زندگی کی ایک اور خصوصیت قابلِ ذکر ہے وہ فرماتے تھے کہ بغیر کسی [illegible]ے کے اخبار نویسی محض دوکانداری ہے۔ اخبار کا کام رائے عامہ کی رہنمائی

کرنا ہے نہ کہ اس کی تقلید۔ وہ اس طریقے کو معیوب سمجھتے تھے کہ اخبار کے کاروبار کی کامیابی کے لیے اور اخبار کو ہر دل عزیز بنانے کے لیے پڑھنے والوں کے خیالات کی تائید کی جائے۔ اس اصول کی خاطر انھوں نے "ہمدرد" کی عام مقبولیت کو نقصان پہنچانا گوارا کیا لیکن اپنے عقائد کی انفرادیت کو متاثر کر کے اپنے اخبار کو کامیاب بنانا کبھی پسند نہیں کیا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ اخبار میں اس کے مدیر کی شخصیت کا عکس پوری طرح نمایاں رہے۔ شہرت کے پلے میں عوام کے مذاق اور خواہشات کو رکھ کر اس پلے کو بھاری رکھنا وہ اپنے عقائد کی توہین قرار دیتے تھے۔ اس لیے خود ان کے سیاسی عقاید کے مدوجزر کے ساتھ ان کا اخبار بھی بہت سے نشیب و فراز سے گزرتا رہا ہے تاآنکہ عامیوں کی بد مذاقی سے عاجز آکر ان کی زندگی ختم ہوگئی۔

تیسری بات جو میں نے ان سے سیکھی یہ تھی کہ عدم تعاون کی تحریک سے پہلے بحیثیت ایک صحیفہ نگار کے وہ سرکاری حلقوں میں ایک خاص اثر رکھتے تھے اور بعض اوقات اسی وجہ سے ان کے مخالفین ان پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ سرکاری حلقوں کے زیر اثر ہیں۔ ایسے لوگوں سے جیسے کہ مرحوم نواب صاحب رام پور یا مہاراجہ الور یا آغا خاں، مہاراجہ محمود آباد یا سر سید علی امام تھے۔ مرحوم کے تعلقات بظاہر گہرے تھے اور اس وقت تک جبکہ عدم تعاون کی تحریک نے ان کو سرکاری حلقوں سے بالکل جدا نہ کر دیا وہ حکومت کے اندرونی حلقوں میں بہت با اثر سمجھے جاتے تھے۔

خود فرمایا کرتے تھے کہ ان کی وقعت ان حلقوں میں محض ان کی قابلیت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اس لیے ہے کہ حکومت جانتی ہے کہ ان کا عقیدہ مستحکم ہے اور ان کی شخصیت ترغیبات سے بالاتر ہے، اس لیے ان کی آواز میں زور تھا اور ان کے الفاظ میں اثر۔ پہلی دفعہ جب نظربند ہوئے تو اس وقت تک میں ان کے افکار سے بہت قریب ہو چکا تھا اور سرکاری حلقوں میں ان کی گفت و شنید سے واقف رہتا تھا۔ کہا کرتے تھے کہ حکومتیں ہم جیسے لوگوں کی کمزوریاں تلاش کیا کرتی ہیں۔ جب کوئی کمزوری ہاتھ نہیں آتی تو وہ ہماری باتیں سننا چاہتی ہیں۔ یہی وقت ہے جب انھیں متاثر کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی صحافت کے ابتدائی زمانے

کاسہ کاری حلقوں سے کافی اتصال قائم رہا۔ لیکن بگڑتے تھے وہ اس وقت جبکہ کسی عقیدے اور اصول کا سوال سامنے آتا تھا۔ اصول اور عقیدے کے معاملے میں ہمدرد کے اجراء کے بعد ان کی پامردی بہت نمایاں ہو چکی تھی اور جہاں کوئی ایسی تنقیح پیدا ہوتی تھی تو سرکاری حلقوں میں ان کا کوئی بڑے سے بڑا دوست بھی ان کو متاثر نہ کر سکتا تھا۔

یہ تھے محمد علی میرے محبوب استاد، ان کی صحیفہ نگاری نے اردو صحافت کا ایک نیا دور شروع کیا تھا اور وہ اردو کی پسماندہ صحافت میں بعض اہم اصلاحات کے بانی تھے۔

مثلاً "ہمدرد" پہلا روزنامہ تھا جو لیتھو کے بجائے ٹائپ میں چھپا۔ "ہمدرد" پہلا روزنامہ تھا جس کے مضامین کا معیار اس زمانے کی عام صحافت سے بہت زیادہ بلند تھا۔ بہت سے مشہور شعراء اور ادیبوں کو جو صحافت سے دور رہتے تھے، محمد علی کی شخصیت نے پہلی دفعہ ہمدرد کے صفحات پر پیش کیا۔ حالی، اقبال اور شبلی کی نظمیں اور پریم چند کے افسانے غالباً پہلی دفعہ ایک اردو کے روزنامے میں شائع ہوئے۔ طنز اور مزاح نگاری کا ایک اعلیٰ معیار "ہمدرد" نے قائم کیا جس کا اس سے پہلے اردو صحافت میں کوئی وجود نہ تھا۔ بھوق اور محفوظ علی اس فن کے استاد مانے گئے اور آج بھی جو اچھے مزاح نگار اور طنز نگار ہیں انھوں نے "ہمدرد" کی روایات سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ یہ سب محمد علی کی شخصیت کا کرشمہ تھا اور ان کے شاگردوں کو اگر خوش مذاقی سے کچھ حاصل ہوا تو وہ بھی انھیں کی عطا ہے۔

میری عمر بھر کی یہ داستان ہے، اُسے میں صرف پندرہ منٹ میں کیا بیان کر سکتا۔ قائد ملت محمد علی کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا لیکن صحیفہ نگار محمد علی کے متعلق ابھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ اب وہ اپنے رب کی رحمتوں کے آغوش میں محو خواب ابد ہیں لیکن ان کی روایات اب بھی اپنے اندر زندگی کی حرارت رکھتی ہیں۔ جب کبھی وہ یاد آتے ہیں تو اس عہدِ رفتہ کے بہت سے مُردے کروٹیں بدلتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں وہ اب بھی زندہ ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مرگئے:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

حواشی :

۱۔ مہینہ اور سنہ دونوں غلط ہیں۔ کلکتہ سے کامریڈ" کا آخری شمارہ ۱۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کو اور دہلی سے پہلا شمارہ ۱۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کو نکلا تھا اور مولانا ۹ ستمبر ۱۹۱۲ء کو دہلی آئے تھے۔

۲۔ چیلوں کے کوچے سے، جسے آجکل کوچہ چیلاں کہتے ہیں، پرانی دہلی کے ریلوے اسٹیشن کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی میل ہوگا۔

۳۔ باقی دونوں مضامین میں ۲۳ سال چھپا ہے۔ قاضی صاحب کا سنہ ولادت ۱۸۸۸ء ہے اور اس لحاظ سے اُس وقت ان کی عمر ۲۵ سال کے قریب رہی ہوگی۔

۴۔ اس لفظ سے ایسی غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مولانا نے "نقیب ہمدرد" کے نام سے کوئی اخبار نکالا تھا یہ غلط فہمی شاید مولانا دریا آبادی کے اس جملے سے پیدا ہوئی کہ "کچھ عرصے کے بعد "نقیب ہمدرد" کے نام سے ایک مختصر روز نامہ نکلنے لگا۔" (ذاتی ڈائری صفحہ ۵) مگر اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے، مولانا نے عارضی طور پر جو اخبار نکالا تھا اس کا نام بھی روزنامہ "ہمدرد" تھا، اصل اور عارضی میں صرف یہ فرق ہے کہ عارضی پر جلد کی جگہ "سلسلۂ خاص" لکھا ہوتا تھا، یکم جون ۱۹۱۳ء سے جب اصل اخبار نکلا تو اس پر جلد ۱ نمبر ۱ لکھا گیا۔ عارضی اخبار ۲۳ فروری سے ۱۳ مئی (نمبر ۱ تا ۶۹) یک ورقہ نکلا اور اس کے بعد سے ۳۱ مئی (نمبر ۸۵) تک دو ورقہ تھا۔

۵۔ اس اداریہ کا عنوان "مصر" ہے اور ۱۰ سے ۱۲ جون تک تین قسطوں میں شائع ہوا ہے اور کل ۱۶ کالم کا ہے۔ تفصیل یوں ہے، پہلی قسط ½۵ کالم، دوسری ½۴ کالم، تیسری ½۶ کالم

۶۔ مولانا نے اپنی نامکمل آپ بیتی میں لکھا ہے کہ "در اصل حسن حیز نے مجھے صحافت میں جانے پر اس ناقابل مدافعت حد تک مجبور کر دیا وہ یہ بھی کہ اُس وقت میں صحافت ہی کے ذریعہ اپنی ملت کے مسائل کے سلسلے میں کام کر کے ملت کے لیے ایک حد تک مفید بھی ہو سکتا تھا۔"

خواجہ حسن نظامی دہلوی

مولانا محمد علی بحیثیت ایڈیٹر

مولانا محمد علی اردو انگریزی کے بہت اچھے ایڈیٹر تھے اور ہندوستان میں ان جیسی معلومات کے ایڈیٹر ان کے ابتدائی زمانے میں بہت کم ملتے تھے۔ مرحوم بحیثیت لیڈر کے عوام کے ذہن اور خیال تک پہنچ سکتے تھے۔ مگر بحیثیت ایڈیٹر کے ان کو عوام کی خواہش کا احساس نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کا اخبار "کامریڈ" تو بہت مقبول ہوا، کیونکہ اس کے ناظرین اعلیٰ تعلیم یافتہ اور "کامریڈ" کی اعلیٰ انگریزی کے قدرداں تھے، مگر "ہمدرد" مقبول عوام نہ ہو سکا، کیونکہ مرحوم اس کو بھی "کامریڈ" کی طرح اعلیٰ سطح پر رکھنا چاہتے تھے، حالانکہ اس کے ناظرین کم علمی کے سبب اپنے مذاق کا اخبار چاہتے تھے۔ مرحوم کے مزاج میں شاہ خرچی شروع سے تھی۔ اخبار "ہمدرد" جاری کرنے کا ارادہ ہوا تو کئی مہینے پہلے سے مولانا عبدالحلیم شرر وغیرہ کو بلوا لیا گیا اور ان کو گھر بیٹھے تنخواہیں ملتی رہیں، مگر ٹائپ آنے میں کئی مہینے لگ گئے اور اخبار بہت دیر میں شائع ہوا۔

اخبار نویسی میں ان کی نظر بہت بلند تھی، ورنہ اردو کے ایک روزانہ اخبار کے لیے انھوں نے جو شاہانہ اہتمام رکھا تھا وہ اردو اخباروں کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ان کی شاہانہ طبیعت کے سبب بہت سے بیکار لوگ بھی ان کے آس پاس جمع ہو گئے تھے اور انھوں نے ان کو روزگار دینے کے لیے اخبار کا دفتر وائسرائے کے دفتر سے مشابہ بنا دیا تھا۔ "ہمدرد" جاری ہوا اور خرچ آمدنی سے بہت بڑھ گیا اور نا واقف لوگوں کی بھیڑ سے کام نہ چلا اور شکایتیں بڑھنے لگیں تو مرحوم نے مجھے بلایا، کیونکہ میں ان کے مکان کے قریب ملا واحدی صاحب کے مکان میں رہتا تھا اور اسی جگہ میرا دفتر تھا۔ میں واحدی صاحب کو لیکر ان کے مکان پر گیا اور مرحوم نے مجھے اور واحدی صاحب کو سارا دفتر دکھایا اور مشکلات کو بیان کیا۔ میں نے اور واحدی صاحب نے کہا کہ یہ مشکلات ایک گھنٹے میں دور ہو سکتی ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان سب فضول آدمیوں کو علیحدہ کر دیجیے"

انتظامی عملے میں دو تین آدمی کافی ہیں، ان بیسیوں کی کیا ضرورت ہے؟ مرحوم نے ہنس کر کہا کہ آپ تجارتی رائے دیتے ہیں اور میں یہ کام تجارت کے لیے نہیں کرتا بلکہ قومی خدمت کے لیے کرتا ہوں ۔ میں نے کہا لیکن جب تک اخبار کا نظم درست نہ ہو تو قومی خدمت کیا ہو سکے گی۔ مرحوم نے کہا میں نے ہر کام ایک ایک آدمی کے سپرد کر دیا ہے اور ہر ایک کام کا اس کو ذمہ دار بنا دیا ہے، لہٰذا اس عملے میں سے ایک آدمی بھی کم نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا کہ ان میں سے ایک آدمی بھی ذمہ داری سے واقف نہیں ہے اور کسی کو بھی جواب دہی کا خوف نہیں ہے ۔ جانتے ہیں، آپ کو غصہ آئے گا، آپ ناراض ہوں گے ، گردن جھکا کر آپ کی ناراضگی سن لیں گے ، کیونکہ تھوڑی دیر کے بعد آپ کی شاہانہ شان ان کو معاف کر دے گی اور ان کی پرورش کا جذبہ آپ کو مغلوب کر لے گا ۔

بہر حال مرحوم عملے کی تخفیف کے لیے کسی طرح راضی نہ ہوئے اور ہم دونوں اپنے مکان پر واپس آ گئے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ انگریزی کے ایڈیٹر بہت اچھے تھے مگر اردو کے ایڈیٹر اچھے نہ تھے لیکن کمی صرف اتنی تھی کہ عوام کی خواہش کی پروانہ کرتے تھے ۔ ورنہ اردو کی ایڈیٹری بھی ان کی اعلیٰ تھی جو "ہمدرد" کی لاجواب ترتیب سے معلوم ہو سکتی ہے[1] ۔

جب میری ان کی اخباری جنگ ہو رہی تھی تو میں ان کی تحریری میگزین سے واقف رہنے کی بہت کوشش کرتا تھا۔ اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود ہی سب کچھ لکھتے ہیں، سب ایڈیٹروں کی تحریریں ان کو پسند نہیں ہیں ، اس واسطے زیادہ کام کرنے کے سبب اخبار میں دیر ہو جاتی ہے اور چھاپنے والے جلدی کرتے تھے تو ان کو غصہ آجاتا تھا۔

ان کی ایڈیٹری انگریزی کی کیسی ہی ہو مگر اردو کی ایڈیٹری میں یہ نقص ضرور تھا کہ وہ مخالف فریق کے اشتعال دلانے سے مشتعل ہو جاتے تھے ۔ چنانچہ میرے ساتھی یہ سمجھ کر کہ فلاں طرز تحریر سے ان کو غصہ آئے گا اور وہ اصل مبحث سے ہٹ جائیں گے ، یہ تحریری حربہ استعمال کرتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے ۔

بہر حال ان کی ایڈیٹری کی خوبیاں مذکورہ برائیوں سے بہت زیادہ تھیں ۔

(روزنامہ خلافت ۔ محمد علی نمبر، مورخہ ۳ر فروری ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۴)

---

[1] اس کے بعد کی عبارت پڑھی نہ جا سکی اس لیے دو سطریں حذف کر دی گئی ہیں

مفتی محمد رضا انصاری

مولانا محمد علی اور مولانا فرنگی محلی

محمد علی — مسٹر، بی۔ اے (آکسن) — نے ٹھیٹھ مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی اور مذہب ہی کی گود میں پرورش پائی۔ انگریزی اعلیٰ تعلیم اور کچی عمر میں قیام لندن کے باوصف اپنے عہد کے دیگر لندن پلٹ ہندوستانی نوجوانوں کے برعکس نوجوانی میں بھی، جدید فیشن کے برتنے اور جدید معاشرے کے تقاضوں پر عمل پیرا ہونے کے باوجود وہ مذہبی رہے۔

ذہنی اور عملی دونوں پہلوؤں سے ایک ممتاز مذہبی شخصیت، وہ اپنی نظر بندی — ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک کے زمانے میں بنے اور اس نظر بندی کے زمانے میں رمضان[۱] ۱۳۳۳ھ (مطابق جولائی ۱۹۱۵ء) میں اس وقت کے ایک خاندانی عالم اور رشد، نام ور مجاہد مولانا محمد قیام الدین عبد الباری فرنگی محلی (وفات جنوری ۱۹۲۶ء)[۲] کے ہاتھوں پر اپنے بڑے بھائی اور نظر بندی میں برابر کے شریک، مولانا شوکت علی کے ساتھ بیعت ہو گئے۔

مولانا عبد الباری فرنگی محلی عموماً سلسلۂ قادریہ کی رزاقیہ شاخ اور سلسلۂ چشتیہ کی صابریہ شاخ میں حسب خواہش ارادت مند بیعت کر لیتے تھے۔ محمد علی کے

۱۔ کاغذات مولانا عبد الباری فرنگی محلی۔

۲۔ پیدائش ۱۸۷۸ء وفات: ۱۹ جنوری ۱۹۲۶ء

ایک تذکرہ نگار[۱] نے سلسلۂ قادریہ رزاقیہ میں ان دونوں بھائیوں کے مرید ہونے کی جو تخصیص کی ہے، اپنے ذرائع سے میں اس کی توثیق نہیں کر سکا، نہ اس تذکرہ میں مذکور اس روایت کی تصدیق اب ممکن ہے کہ علی برادران کے کچھ اعزا، مولانا عبدالباریؒ کے خاندان میں پہلے سے ہی مرید تھے اس خاندان میں مریدوں کی کوئی فہرست تیار نہیں کی جاتی تھی۔

علی برادران اپنے ان ہی مرشد کے مدرسہ "مدرسہ عالیہ نظامیہ" واقع فرنگی محل سے ۱۹۲۰ء میں "مولانا" کی اعزازی سندیں پاکر "مولانا" ہوئے۔ اس وقت سے "مولانا محمد علی" اور "مولانا شوکت علی" کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ اور ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔ جب کبھی بھی یاد کیے جائیں گے! میں نے ان اعزازی سندوں کا مثنیٰ دیکھا ہے .... وہ مولانا عبدالباریؒ (مہتمم مدرسہ) کی مہروں سے مزین تھے۔ اور مضامین ممتحنہ کے ذیل میں "خدمۃ الاسلام والمسلمین" درج تھا۔

آخر دسمبر ۱۹۱۹ء میں علی برادران پانچ سال کی نظر بندی اور جیل کے بعد جب رہا ہوئے تو چہروں پر داڑھی اور جسموں پر لانبی عبا کے باوصف "مسٹر محمد علی" اور "مسٹر شوکت علی" ہی تھے۔ کلنڈر ۱۹۱۹ء کا آخری ورق الٹا اور ۱۹۲۰ء شروع ہی ہوا تھا کہ یہ دونوں بھائی اپنے مرشد کے پاس فرنگی محل آکر رخصت ہوئے تو ہندوستان کے طول و عرض میں "مولانا محمد علی" اور "مولانا شوکت علی" کے نام سے ہر طبقہ اور ہر حلقہ میں یاد کیے جا رہے تھے۔ اعزازی سندیں اس اعزاز کی سند کے طور پر ان کے پاس تھیں۔

دیکھا دیکھی ہر ترک موالاتی مسلمان کو "مولانا" کہا جانے لگا۔ ۱۹۲۰ء کے صدر انڈین نیشنل کانگریس پنڈت موتی لال نہرو کو بالآخر گھبرا کر اس سلسلے میں مولانا

۱۔ محمد علی ـــــ ذاتی ڈائری از مولانا عبدالماجد دریابادی

عبدالباریؒ کو ایک بھی خط کے ذریعہ رجوع کرنا پڑا کہ ہندی کے "شری" یا "شریمان" کی طرح اردو میں کوئی بھی ایسا ہی عام تعظیمی لفظ ہے؟ ہر مسلمان کے لیے مولانا کا استعمال کچھ نامناسب معلوم ہوتا ہے[1]۔

جس مرشد کے مولانا محمد علی مرید ہوئے اور جس مدرسہ سے "مولانا" کی سند پائی، اس مرشد سے ان کی وفات سے صرف سوا تین گھنٹے قبل ۱۹ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء کو قبل عشاء اپنے خاندان کے چند ہم سنوں کے ساتھ، جو سب کے سب دس سال سے کم عمر کے تھے، مجھے بھی مرید ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور مدرسہ سے جب "مولانا" کی سند، جو فرنگی محل کے مدرسہ کی آخری سند تھی، ملی تو بانیٔ مدرسہ کی وفات کو پورے دس سال، اور پیر بھائی اور ہم سند مولانا محمد علی کی وفات کو پورے پانچ سال گزر چکے تھے۔ اگرچہ ہم دونوں کی عمروں میں ساڑھے چار دہائیوں کا اور مرتبے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پھر بھی ؎

من و تو ہر دو خواجہ تاشانیم
بندۂ بارگاہِ سلطانیم

مزید خوش قسمتی یہ کہ سات آٹھ سال کی مدت تک بالکل پڑوس میں مولانا محمد علی کو بارہا قیام پذیر پایا۔ اپنے دیوان خانے میں اپنے بزرگوں کے ساتھ جائے پیتے سرگرم گفتگو دیکھا اور سنا۔ لکھنؤ کے بعض جلسہائے خلافت میں رفاہ عام میں ان کو تقریر کرتے اور آنسو بہاتے اور پونچھتے قریب سے دیکھا۔ اور ایک دفعہ موٹر میں ادھر ادھر اپنے شہر کا چکر بھی ان کے ساتھ کاٹا۔ اور یہ سب سنِ شعور سے پہلے، دس سال سے کم عمر میں! دس سال کی عمر کے بعد شعبان ۱۳۴۹ھ (مطابق ۴ جنوری ۱۹۳۱ء) میں شب برات

۱۔ موتی لال نہرو کا اردو خط۔ بنام مولانا عبدالباری (کاغذات مولانا عبدالباری)

کے دن جب مولانا محمد علی کی وفات کی خبر بذریعہ تار، ان کے اور میرے مرشد کے جانشین مولانا قطب میاں (وفات ۱۹۵۴ء) کے پاس آئی تو یہی احساس ہوا کہ خاندان ہی کا کوئی بزرگ اٹھ گیا ہے۔ جب مرشد کے جانشین نے مولانا شوکت علی کو لندن تار دے کر مولانا محمد علی کو مرشد کے پہلو میں دفن کرنے کی پیش کش کی تو ایک نہج کا احساس فخر اپنے اندر پایا۔ پھر وہ تعزیتی جلسہ کبھی فراموش نہ ہوگا جو امین آباد پارک (گھنٹہ گھر والے پارک) میں بعد مغرب ہوا۔ سارا شہر سنسان تھا۔ نہ سڑکوں پر سواریاں، نہ تجارتی مرکزوں میں دوکانیں۔ نہ خوانچہ والے، نہ شربت پانی والے۔ گھر سے جلسہ گاہ تک تقریباً دو، پونے دو میل، پیدل جانا اور پیدل آنا، اس سے پہلے اتنا پیدل چلنے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔

ایک ممتاز شخصیت کے دوسری ممتاز شخصیت سے تعلقات کی متعین تاریخ اور ان کی نوعیت کا معاملہ تاریخی تحقیقات کے لیے عموماً پل صراط کی حیثیت رکھتا رہا ہے یہی سوال یہاں مرید و مرشد کے سلسلہ میں بھی جواب طلب ہے۔ خوش قسمتی سے اس سلسلہ میں ایک مستند مطبوعہ تحریر[1] میرے استاد اور جد بد مولانا مفتی عنایت اللہ فرنگی محلی (وفات ۱۹۴۱ء) کی موجود ہے۔ جس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں یہ ہے۔

"مولانا عبدالباری نے اپنے شاگرد رشید اور رشتہ کے بھائی مفتی عنایت اللہ (راقم تحریر) سے جو فرنگی محل کے نوجوانوں کی ایک علمی انجمن "مجلس الاصلاح" کے سکریٹری تھے، فرمایا کہ مسٹر محمد علی کو لکھو کہ اگر ہند اور بیرون ہند کے ملی مسائل کے سلسلہ میں ہم لوگوں کی خدمات درکار ہوں تو ہم حاضر ہیں۔ جواب آیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور

۱۔ حسرۃ الآفاق بوفاۃ مجمع الاخلاق اردو مطبوعہ

مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کے لیے علی برادران
دسمبر ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ آئے تھے۔ اس وقت باضابطہ گفتگو ہوئی۔
مسلم لیگ کونسل، فاؤنڈیشن کمیٹی اور انجمن ہلال احمر کے اجلاسوں
میں شرکت کے لیے یہ دونوں دسمبر کے آخری ہفتہ میں لکھنؤ آئے اور
۳۱ دسمبر ۱۹۱۲ء کو پہلی بار شیخ مشیر حسین قدوائی کے ہمراہ فرنگی محل
تشریف لائے اور اسی دن انجمن خدام کعبہ کی داغ بیل پڑی۔"

شیخ مشیر حسین قدوائی: سیاست ملی کا ایک فراموش کردہ انتہائی مجاہد
ملک ساز (وفات ۱۹۳۷ء) ترکوں کا عاشق، اسلام کی عالمگیر برادری کا پرجوش
مبلغ اور نوجوان "موہن داس کرم چند گاندھی" کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے
۱۹۱۵ء میں لندن سے اپنے ایک خط کے ذریعہ متعارف کرانے والا، اودھ کا ایک تعلقدار
بیرسٹرایٹ لا اور انجمن خدام کعبہ کا دو جنرل سکریٹریوں میں سے ایک۔ اودھ خلافت
کانفرنس فیض آباد منعقدہ ۱۹۲۰ء میں شیخ صاحب کا مفصل خطبۂ صدارت نہ صرف
مسئلہ خلافت اسلامیہ پر بھرپور روشنی ڈال رہا ہے بلکہ صاف دکھا رہا ہے کہ انگریز حکومت
ترک سلطنت سے نہیں، بلکہ عیسائیت اسلام سے چن چن کے بدلے چکا رہی تھی۔

مولانا مفتی عنایت اللہ کے بیان کے مطابق انجمن خدام کعبہ کے اغراض و مقاصد
اور دستور العمل کے تحریر کرنے میں کچھ وقت لگا۔ مولانا شوکت علی کا بیان ہے کہ مئی
۱۹۱۳ء کو انجمن خدام کعبہ کا باضابطہ قیام فرنگی محل میں عمل میں آیا۔ جس کے صدر یا
خادم الخدام مولانا عبدالباری اور معتمد یا خادم الخدام یا جنرل سکریٹری مولانا شوکت علی اور
شیخ مشیر حسین قدوائی ہوئے۔ اس وقت انجمن کا فنڈ کل تیئیس روپے تھا۔ سو روپے مولانا
عبدالباری سے قرض لیے گئے جو بعد میں انھیں ادا کر دیے گئے۔[1]

۱۔ مولانا شوکت علی مطبوعہ تقریر۔

محمد علی ایڈیٹر کامریڈ بھی انجمن خدام کعبہ کی مرکزی کمیٹی کے ممبر رہے ۔ انجمن کا مرکزی دفتر مولانا شوکت علی کے قیام کے خیال سے دہلی منتقل ہوگیا ۔ ممبر دو قسم کے رکھے گئے "شیدائی" اور "فدائی" ۔ مولانا شوکت علی کا بیان ہے کہ سال بھر میں انجمن کے ممبروں کی تعداد بیس ہزار ہوگئی جن میں نواب وقار الملک سکریٹری ایم ۔ اے ۔ او کالج ۔ علی گڑھ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا شبلی نعمانی کے نام بھی ملتے ہیں ۔ مرکزی دفتر سے "ڈیلی رپورٹ" خادم الخدام کے پاس لکھنؤ پہنچ جاتی اور خادم الخدام بھی بار بار دہلی کا دورہ کرتے تھے[1]

مئی ۱۹۱۳ء میں انجمن خدام کعبہ قائم ہوئی ۔ اگست ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مچھلی بازار کی مسجد کی شہادت کا سانحہ پیش آیا ۔ اس پر احتجاج کرنے والے کانپور کے مسلمانوں کو فوج کی گولیوں سے بھون دیا گیا ۔ اور اشتعال انگیزی کے الزام میں بڑی تعداد میں گرفتاریاں کی گئیں ۔ مولانا عبدالباری لکھنؤ کے احتجاجی جلسہ میں سیاسی پلیٹ فارم پر پہلی بار آئے اور ایک پرجوش تقریر کی[2] ۔ اس مسجد کے قضیہ کو لے کر محمد علی اور وزیر حسن وفد کی شکل میں لندن گئے ۔ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ، شملہ کی بلندیوں سے اتر کر کانپور آئے اور دروازۂ مسجد پر مولانا عبدالباری کے تجویز کردہ شرعی حل پر مہاراجہ محمود آباد، سر محمد شفیع، محمد علی، سید علی امام ممبران وائسرائے کونسل کی موجودگی میں مولانا سے تبادلۂ خیال کیا اور تجویز کردہ حل کو قبول اور اس پر عملدرآمد کا وعدہ کیا ۔

انجمن خدام کعبہ سرگرم عمل تھی کہ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کی گھنگھور گھٹا اٹھی اور برسنا شروع ہوگئی ۔ ترک انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے پر مجبور ہوئے ۔ مولانا عبدالباری نے بحیثیت خادم الخدام، خلیفۃ المسلمین سے بذریعہ تار درخواست کی کہ

۱۔ کاغذات عبدالباری

۲۔ حسرۃ الآفاق بوفاۃ مجمع الاخلاق ۔ اردو مطبوعہ

آپ جنگ میں غیر جانبدار رہیں یا کم از کم ترکوں کے خلاف جنگ میں حصہ نہ لیں۔ اس میں ناکامی کے بعد بحیثیت خادم الخدام مولانا عبدالباری نے گورنر لکھنؤ پر دباؤ ڈالا کہ حکومت برطانیہ اعلان کرے کہ حرمین شریفین اور مقامات مقدسہ کو دائرہ جنگ سے باہر رکھا جائے گا۔ نہ صرف گورنر نے بلکہ وائسرائے اور وزیر اعظم برطانیہ نے بھی یہ ضمانت دی اور ۱۹۱۴ء میں پارلیمنٹ میں اس ضمانت کا اعلان کیا گیا۔

برق رفتاری سے بدلتے ہوئے جنگی حالات نے مسلمانان ہند میں جو ہیجان اور بے چینی پیدا کی اور بڑھائی اس کا مداوا یہ لفظی ضمانتیں نہ بن سکیں۔ مولانا عبدالباری برابر آگاہی دیتے رہے کہ اگر ضمانت کی خلاف ورزی ہوئی تو ہندوستان کی مسلم رعایا کی وفاداری خطرے میں پڑ جائے گی۔ مولانا محمد علی ایڈیٹر کامریڈ مولانا عبدالباری کی اس حمایت حق گوئی کو سنت رسول اور اکابر امت کا اسوہ قرار دیتے اور مولانا عبدالباری کو اس راہ پر، جس پر نشان قدم ثبت ہو چکے تھے، گامزن ہونے پر مبارکباد دیتے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن ہندوستان سے باہر جا چکے تھے۔ علمائے ہند میں مولانا عبدالباری ہی تھے جو مسند درس اور سجادۂ ارشاد کی ذمہ داریوں سے صرف نظر کر کے اس جہاد میں سپہ سالار کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

محمد علی اور شوکت علی ۱۹۱۵ء میں نظر بند ہو گئے۔ پہلے دہلی کے قریب مہرولی میں، پھر لینسڈاؤن میں، پھر چھندواڑہ میں اور آخر میں بیتول جیل میں۔ مولانا عبدالباری کا اہتمام یہ بھی بڑھ گیا کہ وہ ہر ماہ ان نظربندوں سے ملنے کے لیے جائیں۔ اسی ایک سفر میں علی برادران نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

آخر دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر خلافت کانفرنس نے مسئلہ خلافت اسلامیہ کی اہمیت برطانوی مدبرین کو بتانے کے لیے لندن ایک وفد بھیجنا تجویز کیا جس کے ارکان میں مولانا عبدالباری کا نام بھی تھا جن کا مسئلہ کی شرعی حیثیت کی تشریح کرنے کے لیے جانا ضروری قرار دیا گیا۔ مولانا نے اپنے قائم مقام کی حیثیت سے علامہ سید سلیمان ندوی کو وفد کے لیے نامزد کر دیا۔

اور اس قائم مقام نے قائم مقام وزیر ہند مسٹر فشر سے لندن میں جب بات کی تو خلافت اسلامیہ
اور مقامات مقدسہ کی مذہبی حیثیت بتاتے ہوئے کہا ۔

"نہ میں پولیٹیکل آدمی ہوں ، اور نہ وہ جن کا میں قائم ہوں وہ پولیٹیکل ہیں ۔
ہم لوگ خالص علمی اور مذہبی خدمت کرنے والے ہیں[۱] ۔"

وفد لندن سے ناکام ہی واپس آیا ۔ محمد علی بھی واپس آ گئے ۔ ان کے مرشد کی رہنمائی میں اس بیچ ، عدم تشدد کا اصول مسلمانوں نے بطور حربۂ جنگ مان لیا تھا ۔ اور گاندھی جی کو تحریک خلافت کا مسلمہ قاید بھی ۔ محمد علی آئے اور تحریک خلافت کے قاید کے ہمنوا ہو کر سرگرم عمل بھی ہو گئے ۔ ۱۹۲۰ء ختم ۔ ۱۹۲۱ء شروع ہوا ۔ محمد علی اپنے بھائی شوکت علی اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ مقدمۂ کراچی کے نتیجے میں دو سال کے لیے اسیر فرنگ ہو گئے ۔ مقدمہ کے دوران اپنے بیان وغیرہ سے قبل عدالت سے انھوں نے درخواست کی کہ چوں کہ وہ اپنے مذہب کے احکام کی تعمیل میں سرکار کے مجرم قرار پائے ہیں ، اس لیے اپنے دفاع میں ان کو بہت سے مذہبی مسائل سے کام لینا پڑے گا ۔ لہٰذا اس میں مدد کے لیے مولانا عبدالباری کو ان سے جیل میں ملنے کی سہولت ملنا چاہیے[۲] ۔

مولانا عبدالباری دوران کارروائی مقدمہ کئی بار کراچی گئے ۔ اور ملزمان مقدمۂ کراچی سے ملاقات کی ۔ پھر ملزمان کو سزا ہوئی قید تنہائی کی ـــــ محمد علی نے اس قیدِ تنہائی میں اسلام پر ایک کتاب انگریزی میں تحریر کرنا شروع کی ۔ اس میں اپنے "روحانی مرشد" کا اپنے خود نوشت حالات کے ضمن میں حوالہ آیا ہے ۔ ان کے الفاظ میں :

"مولانا عبدالباری صاحب سے مل کر جو علمائے فرنگی محل لکھنؤ کے اس مشہور

۱۔ "بریدِ فرنگ" لندن سے علامہ سید سلیمان ندوی کے خطوط کا مطبوعہ مجموعہ

۲۔ روئیداد مقدمۂ کراچی

معروف خاندان کے سربراہ تھے جس نے گذشتہ چار صدیوں میں ہندوستان کو مسلسل بغیر کسی انقطاع کے ایک وقت عابد، زاہد، صوفیا اور متبحر علماء عطا کیے۔ ۱۹۱۳ء کے موسم گرما میں میرے بھائی شوکت صاحب نے انجمن خدام کعبہ کی بنیاد رکھی![1]

۱۹۲۳ء میں قید تنہائی سے چھوٹے کانگریس کے صدر ہوتے۔ ہندو مسلم فسادات نے جو ان کے زمانۂ اسیری میں ہندوستان بھر میں پھوٹ پڑے تھے، بحیثیت مسلمان صدر کانگریس کے نیچے۔ ان کے مرتبان ہی ناخوشگوار حالات سے کبیدہ خاطر ہو کر سرگرم سیاست سے اس لیے پیچھے ہٹنے لگے کہ ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ مسلمانوں کی طرف سے ان ہی نے لگایا تھا۔ ان ہی نے "قربانی گاؤ" کے ترک کا اولین اعلان کیا تھا اور انھوں نے ہی باوجود اس یقین کے کہ حق کی حمایت میں تلوار اٹھانا اسلام کا حکم ہے، عدم تشدد کا اصول بطور حربۂ جنگ کے بحیثیت عالم دین کے مانا اور مسلم رہنماؤں سے منوایا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جس خلافت اسلامیہ کی حفاظت کے لیے وہ سربکف میدان میں اترے تھے۔ اسے خود ترکوں نے ۱۹۲۴ء میں ختم کر دیا۔ اور ایک وجہ اور تھی اور وہ مسئلہ حجاز، جو ۱۹۲۴ء ہی میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مولانا عبدالباری حجاز کے حکمران شریف حسین کے مؤید تھے۔ محمد علی نئے حکمران ابن سعود کے عقاید سے مکمل اختلاف کے باوجود سیاسی اور ملی نقطۂ نظر سے ان کے حامی تھے۔ یہ مسلمانانِ ہند کا نیا مسئلہ تھا۔ مرید و مرشد دو مختلف کیمپوں میں ہو گئے۔ اس اختلاف رائے میں کوئی حرج نہ تھا۔ اگر وہ طوفانِ بدتمیزی نہ ہوتا جو دونوں کیمپوں میں ۱۹۲۵ء میں پوری طرح سرایت کر گیا تھا۔

متواتر اور مسلسل بدقسمتی یہ ہے کہ ممتاز شخصیتوں کے اختلاف رائے کو وہ لوگ

---

[1] محمد علی کی نامکمل آپ بیتی

شخصی مخالفت بنا دینے میں تن، من، دھن سے لگ جاتے ہیں جو خود چھوٹے ہوتے ہیں۔ مگر بڑوں کے کندھوں پر کھڑے ہو کر بڑا اور زندۂ جاوید بننے کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔ دونوں کیمپوں میں ایسے لوگ خاصی تعداد میں تھے جو اپنے اپنے سربراہ کو انتقامی کاروائیوں پر اکساتے رہتے تھے۔ محمد علی کا اخبار روزنامہ "ہمدرد" دہلی سے نکلتا اور مخالف کیمپ پر تابڑ توڑ حملے کرتا۔ سمجھا یہی جاتا کہ محمد علی حملہ آور ہیں۔ محمد علی کی تعزیروں کے ایسے اقتباسات مولانا عبدالباری تک پہنچائے جاتے جو اصولی اختلاف کے بجائے ذاتی مخاصمت کے آئینہ دار ہوتے۔ دونوں طرف کے ان "چھوٹوں" کے ناموں سے واقفیت اس وقت کوئی دشوار معاملہ نہیں ہے۔ لیکن ابھی وہ نسل موجود ہے جو چاہے ان بدتمیزیوں میں بذاتِ خود شریک نہ ہو۔ مگر جذباتی رجحان اس کا ادھر یا ادھر تھا۔ بہر حال اب بھی اس لیے ان ناموں کو پوشیدہ رہنے دیجئے اور یہ دیکھئے کہ مولانا محمد علی اور مولانا عبدالباری کا غلط فہمیوں کی اس یلغار میں اپنا اپنا طرز عمل کیا رہا۔

جہاں تک "ہمدرد" کے معاندانہ مضامین کا تعلق ہے تو اسی ۱۹۲۵ء کے وسط میں جو بے اعتدالیوں کے شباب کا سال ہے، مولانا محمد علی اپنے ایک طویل خط میں مولانا عبدالباری کو برسبیل تذکرہ لکھتے ہیں:

"(ہمدرد میں) ــــ خود میرے مضامین مہینوں کے بعد کبھی نظر نہ آتے تھے۔ گو بہت سے مضامین میرے ایما سے لکھے جاتے تھے۔ جن خیالات کا اظہار ہمدرد میں ہوتا تھا، وہ اکثر میرے خیالات کے خلاف نہ ہوتے تھے۔ لیکن وہ خود میرے خیالات نہ ہوتے تھے۱"

"اپنے خیالات کے خلاف نہ ہوتے تھے" اور "خود میرے خیالات نہ ہوتے تھے"۔ بظاہر

۱۔ مکتوبات رئیس الاحرار (سیاسی) مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۲۵ء

کچھ بہت زیادہ فرق نہیں رکھتے مگر جب خیالات کے ساتھ ذاتی مخاصمت کا عنصر بھی شامل ہو تو وہ لکھنے والے ہی کا کارنامہ ہوگا، اس کا نہیں جس کے ایما سے یہ تحریر لکھی گئی ہو

ہمدرد کے لیے کتابت ہو جانے والے بہت سے ایسے ہی مضامین اگر محمد علی دیکھ پائے تو ان پر انھوں نے سیاہی پھروادی اور لکھنے والے منہ تکتے رہ گئے البتہ جو ان کے دیکھے بغیر چھپ گئے ان کے بارے میں افسوس کرنے کے علاوہ وہ بھی کیا کر سکتے تھے۔

مولانا محمد علی کے تحریری پہلو کا جائزہ لیتے وقت اس صورت حال پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اداریہ تک لکھنے کا وقت محمد علی نہیں نکال پاتے تھے۔ اس لیے کہ۔

پورے ہفتہ کی غلامی ایک "کامریڈ" ہی کرالیتا ہے۔ پھر "ہمدرد" کے لیے وقت کہاں سے نکالوں؟ جو کہ اس کے لیے برادر ملا دوسرے بھی لکھ سکتے ہیں اس لیے ان پر چھوڑ دیا ہوں اور خود کامریڈ کے لیے جس کے لیے ایک لکھنے والا بھی نہیں ملا، وقف ہو جاتا ہوں[۱]"

اس خط مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۲۵ء میں مولانا محمد علی فرنگی محل کے ایک اور خلافتی لیڈر مولانا سلامت اللہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"مولوی سلامت اللہ صاحب نے یا تو اس قدر سورا شوری سے مضمون (متعلقہ قتل مرتد) لکھنے کے لیے غیر ضروری اجازت حاصل کرنا چاہی یا جب میں نے اس کا انتظار کرنا شروع کیا تو بے نمکی کا ثبوت دیا۔"

یہ مولوی سلامت اللہ (وفات ۱۹۳۲ء) جو لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل میں ۱۹۲۱ء میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، چودھری خلیق الزماں، بابو موہن لال سکسینہ وغیرہ کے رفیق جیل تھے

۱۔ مکتوبات رئیس الاحرار (سیاسی) مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۲۵ء

میرے دادا کے حقیقی بھائی، مولانا عبدالباری کے شاگرد، مرید، خلیفہ اور ملکی و ملی سرگرمیوں میں ان کے دست راست اور مولانا محمد علی کے پیر بھائی تھے۔ مولانا محمد علی سے عمر میں چھوٹے تھے اس لیے اس بے تکلفی سے ان کا ذکر کرنے میں مولانا محمد علی نے کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔

ان ہی مولانا سلامت اللہ کی جیبی سائز کی ڈائریاں میرے بچپن میں ایک درجن کے قریب تھیں۔ ان کے فالج میں مبتلا ہونے کے زمانے تک یعنی مارچ ۱۹۲۹ء تک۔ ۱۹۳۲ء میں ان کی وفات کے بعد یہ ہمارے خاندان کے کتب خانے میں داخل کر دی گئیں۔ جب مجھے ادھر توجہ ہوئی تو صرف بیس سال کی ڈائریاں موجود پائیں۔ بے حد مختصر الفاظ میں وہ دن بھر کی نجی، سیاسی اور خاندانی یادیں ہر تاریخ کے تحت لکھ لیا کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے ۱۹۲۵ء کی ڈائری موجود ہے وہی سال جو پیر و مرید کی آویزش کا سنگین سال بنایا جاتا ہے۔ اس سال کے آخری مہینوں میں ابن سعود کی حمایتوں کے ۲ر اکتوبر اور ۸ر نومبر کو لکھنؤ میں ہونے والے وہ دو جلسے ابن سعود کے مخالفوں نے ناکام بنا دیے تھے۔ جن میں مولانا محمد علی خاص طور پر تقریر کرنے لکھنؤ آئے تھے۔ ان جلسوں کی مزاحمت کرنے والے مولانا عبدالباری کے ماننے والے سمجھے جاتے تھے۔ اور مولانا عبدالباری کو پس پردہ شریک کار قرار دیا جا رہا تھا۔

یہ اسی ڈائری کے اس زمانے کے وہ اقتباسات ہیں جن سے اپنے مرشد کے بارے میں مولانا محمد علی کے حقیقی رویہ پر روشنی پڑتی ہے اور ابن سعود مخالف کیمپ کے ذہنی رویہ پر بھی۔ ملحوظ رہے کہ ۸ر نومبر کے جلسے کے پورے ڈھائی مہینے کے بعد مولانا عبدالباری کا انتقال ہو گیا۔

پس منظر یہ ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ۱۸، ۱۹ر اکتوبر کو سیتا پور میں ہونے والا تھا۔ جس میں شرکت کے لیے گاندھی جی، علی برادران اور دیگر سیاسی رہنما

سیتاپور جانے کے لیے لکھنؤ پہنچ رہے ہیں۔ مولانا محمد علی بھی عازم سیتاپور ہیں۔ ان کے پہنچنے سے قبل ابن سعود مخالف کیمپ کی قائم کردہ انجمن خدام الحرمین کا ایک وفد سیتاپور جاکر علی برادران کے وہابی عقائد بیان کرکے مسلمانان سیتاپور کو ان کے استقبال سے باز رہنے کی تلقین کر چکا تھا۔ اب سنیے ڈائری کے اقتباسات :

۱۹ اکتوبر ۲۵ء : چار بجے سہ پہر کو ۔ صاحب سیتاپور سے واپس آئے۔ معلوم ہوا کہ علی برادران کے استقبال کا بائیکاٹ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے مولانا محمد علی کو سخت اشتعال ہو گیا۔ گزشتہ شب کے جامع مسجد والے جلسے اور سبز ریسوں کی جناب مولوی صاحب (مولانا عبدالباری فرنگی محلی) و مولانا حسرت موہانی و مولوی سلیمان صاحب (پھلواروی) اور مجھ کو (ڈائری نویس، مولانا سلامت اللہ) سیکڑوں گالیاں دیں اور مضحکہ اڑا! جس سے تمام مسلمانوں کو رنج پہنچا۔ مولوی عبدالماجد بدایونی و ڈاکٹر کچلو کو بھی بہت برا کہا گیا۔ افسوس

۲۰ اکتوبر۔ مولانا محمد علی مع بیگم صاحبہ گزشتہ شب کو آگئے اور خلیق الزماں کے یہاں مقیم ہیں۔ نوٹس شائع ہوا ہے کہ آج چار بجے سہ پہر کو رفاہ عام میں مولانا محمد علی اور توفیق رفیق شامی نجد و حجاز پر لیکچر دیں گے۔ مولانا حسرت موہانی و سردار احمد بھی کانپور سے آگئے اور مولانا محمد علی کی ملاقات کو گئے۔ گیا۔ ۵ بجے دن کو مولانا محمد علی و مولوی عبدالماجد دریابادی مع حسرت موہانی کے فرنگی محل آئے۔ میں ان کو مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) کے مکان میں لے گیا۔ (مولانا عبدالباری ان دنوں حیدرآباد دکن گئے ہوئے تھے) اور ان کی بیگم صاحبہ زنانے مکان میں مغرب کے وقت تک مقیم رہیں۔ مولانا محمد علی و حسرت موہانی اور میں نے ساتھ کھانا کھایا و چائے نوشی ہوئی۔ آپس کے شکایات ہوتے۔ مولانا محمد علی نے سیتاپور وغیرہ میں مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) کو برا کہنے کے واقعات سے شرعی قسم کھا کر انکار کیا۔ اور "ہمدرد" کے مضامین کو اپنے قلم سے لکھے ہونے سے انکار

کیا۔ البتہ ذمہ داری لیتے ہیں۔ بعض (مضامین) کو انھوں نے اب تک نہیں دیکھا ہے۔ قبہ جات کے متعلق مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) کے قول کے پیرو ہیں۔ خود اپنی ماں اور صاحبزادی کا مزار سنگ سرخ سے بنوا رہے ہیں۔ اور ابن سعود کے تسلط کے خلاف ہیں۔ مولوی ..... کو بہت برا کہتے ہیں۔ مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) کے ساتھ محبت بدستور قائم ہے ..... ڈیڑھ بجے دن کو واپس گئے۔ پانچ بجے شام کو رفاہ عام میں جلسہ شروع ہوا۔ خلیق (خلیق الزماں) کی صدارتی تقریر و توفیق شامی کی تقریر جو ابن سعود کی مدح سرائی میں تھی، صبر و سکون سے سنی گئی۔ سات بجے شام کو توفیق شامی کی تقریر ختم ہونے پر زور و شور سے مطالبہ ہوا کہ جواب میں حسرت موہانی کی تقریر ہو۔ خلیق صدر نے سخت الفاظ میں رد کیا اور مولانا محمد علی کو تقریر کے لیے کھڑا کر دیا۔ حاضرین نے ان کی تقریر سننے سے انکار کیا اور جلسہ درہم برہم کر دیا۔ محمد علی صاحب لکھنؤ والوں کو گالیاں دیتے ہوئے واپس گئے اور رات کو دہلی گئے۔

۲۴ر اکتوبر: آج "ہمدرد" میں مولانا محمد علی کا بیان گزشتہ جلسہ لکھنؤ کے متعلق شائع ہوا ہے۔ ٹھاکر نواب علی خاں (اودھ کے ایک شیعہ تعلقہ دار) پر زیادہ الزام دیا ہے جو ایک حد تک صحیح ہے۔

۴ر نومبر۔ جناب مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) بمبئی سے آج دس بجے دن کو لکھنؤ پہنچے۔ بمبئی میں مولانا شوکت علی سے ملاقات کا حال بیان کیا اور ۸ر نومبر کے جلسہ کے لیے (جو ابن سعود کی حمایت میں ہونے والا ہے اور جس میں مولانا محمد علی تقریر کرنے والے ہیں) خلیق الزماں سے مل کر معاملات طے کرا دینے کو فرمایا کہ دونوں فریق تقریر کر سکیں..... بعد عصر جناب مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) خلیق الزماں کے یہاں گئے اور مسلمانوں کے درمیان فتنہ کو روکنے کی کوشش کی۔ طے پایا کہ پرسوں کے

جلسہ میں صدر غیر جانب دار ہو اور دونوں فریق کو تقریر کا موقع دیا جائے۔

۷ر نومبر۔ معلوم ہوا کہ شرائط صدارت کا مسئلہ حسب دل خواہ سب کو منظور ہے مگر . . .
(ایک مقامی خلافتی لیڈر) نہیں مانتے ..... سات بجے شام کو خادم الحرمین کے
مشورے کا جلسہ ہوا . . . بالاتفاق کل کے جلسہ کی مزاحمت طے ہوئی اور ہر قسم کے
خطرے کا مقابلہ کیا جانا تجویز ہوا اور انتظامات شروع کیے گئے۔

۸ر نومبر: (اس تاریخ کے تحت جو کچھ تحریر ہے وہ سب نقل کیا جا رہا ہے۔ اس جلسے کے ناکام
ہونے کا ذکر ابن سعود کے حامیوں کی مطبوعہ تحریروں میں آچکا ہے مخالف کیمپ کا یہ وہ
بے کم و کاست بیان ہے جو اشاعت کے لیے نہیں تحریر ہوا تھا۔ اس لیے بر بنائے صداقت
کا حامل ہے۔ انشا پردازی سے عاری اس سچائی کا اظہار حقیقی تاریخ کا فطری
تقاضا ہے)

——— تمام کنجڑوں کو جلسہ میں حاضری پر آمادہ کر لیا۔ موہان کسمنڈی، گھلا ملیح آباد و
قرب و جوار کے مواضعات کے لوگ اور شہر میں منشی گنج، مدح گنج، مصاحب گنج،
کھدرا، مالس منڈی، مقبرہ گولہ گنج وغیرہ کے مسلمان بلائے گئے اور دو بجے دن تک
سب مسلح ہو کر یتیم خانہ (جلسہ گاہ) میں پہنچ گئے۔ گیارہ بجے دن کو مولانا شوکت علی و
مولانا محمد علی، جناب مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) سے ملاقات کو آئے مگر مولوی
صاحب نے ملاقات سے انکار کر دیا، بوجہ اس کے کہ گذشتہ آمد (۲ر اکتوبر) کے موقع
پر محمد علی صاحب نے قبہ شریف کے متعلق نا ملائم الفاظ استعمال کیے تھے۔ (یہاں میں ایک
ساعت سے یہ تشریح کرنا چاہتا ہوں کہ گذشتہ آمد کے موقع پر جب مولانا عبدالباری
لکھنؤ میں موجود نہیں تھے۔ مولانا محمد علی مولانا عبدالباری کے یہاں آئے تھے، جیسا کہ
اوپر گذر چکا ہے مولانا حسرت موہانی سے گفتگو کے دوران مولانا محمد علی نے قبہ شریف یعنی
گنبد خضرا کے بارے میں . . . مولانا بڑے پرجوش انداز میں کہے تھے۔ "اگر شریعت سے

ثابت ہو جائے کہ قبہ بنانا ناجائز ہے تو حضور کے مزار پر سے اس غلاظت کو میں خود اپنے ہاتھوں سے دور کروں گا۔" ظاہر ہے ان الفاظ سے ایک شرعی حکم کی تعمیل پر آمادگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ مگر الفاظ کی درشتی صوفیا کے حلقوں میں بہت زیادہ ناگواری کا سبب ہو گئی۔

دونوں بھائی باہر والے مکان میں ٹھہرے رہے۔ آخر میں قطب میاں (مولانا عبدالباری کے بھتیجے و داماد اور بعد کو جانشین) و ممتاز میاں صاحب (سلسلۂ قادریہ رزاقیہ کے ایک سربرادے) کی سفارش سے اور محمد علی صاحب کے اظہار ندامت پر ڈیڑھ بجے ان کو محل سرا میں اجازت آنے کی مل گئی۔ معلوم ہوا کہ معافی ہو گئی لیکن حالات حاضرہ کے متعلق کچھ نہیں طے ہوا۔ سوا دو بجے علی برادران واپس گئے میں و ... و قطب میاں، حسرت موہانی و مشیر حسین صاحب وغیرہ سب (جلسہ گاہ) پہنچ گئے۔ مگر بیم جاسہ کے دروازہ میں اندر سے قفل پڑے ہوئے تھے اور اندر ظفر الملک، محمد علی (لکھنؤ والے) ملک رفیع (بارہ بنکی) عبدالعلی کھیاروی (ضلع بارہ بنکی) عبدالماجد دریابادی، احد حسن قدوائی (مشہور ٹینس کھلاڑی) تکمل خاں ملیح آبادی اور دیگر ان کے ہم خیال قریب تیس چالیس آدمیوں کے موجود تھے۔ کچھ لوگ چھت پر تھے۔ اور چار بوجھ لاٹھیاں اندر کوٹھوں میں رکھے جاتے ہوئے میں نے و . وغیرہ نے دیکھا۔ تین بجے جلسے کا وقت تھا۔ باہر دو ہزار مسلح و غیر مسلح آدمی کھڑے رہے۔ پانچ بجے شام کو علی برادران آئے۔ دروازے کھلے مگر بخوف بدامنی و عدم ضمانت ظفر الملک نے جلسہ ملتوی کر دیا اور مولانا مرالحرمین کی فتح کا اعلان ہماری طرف سے کیا گیا۔ راجہ صاحب سلیم پور (راجہ سید احمد علی علوی) کے یہاں ہوتے ہوئے ساڑھے سات بجے رات کو مکان پہنچے۔ ساڑھے چھ بجے شام کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا۔ محمد علی صاحب کی تحریک متعلق صدارت و مقام و وقت جلسہ

غلبہ رائے سے مسترد ہوگئی اور علی گڑھ میں سالانہ جلسہ ہوگا۔ راجہ صاحب محمود آباد (مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں آف محمود آباد) (اودھ) کو علی برادران لانا چاہتے تھے۔ یہ دوسری شکست ہوئی۔

۹ نومبر: صبح کو ممتاز میاں صاحب کے یہاں حاضر ہوا۔ ... مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) ومرزا میاں موہانی تشریف لائے۔ دوران گفتگو میں، میں نے صاف عرض کر دیا کہ مولانا محمد علی کے خلاف یہاں سے سخت پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ سیتاپور کے واقعہ کی تصدیق نہیں ہے۔ آپ فوراً یا در نہ کر لیا کیجئے۔ مولوی صاحب کو تعجب ہوا۔ آٹھ بجے مکان آیا۔ معلوم ہوا کہ ٹھاکر نواب علی خاں ومولوی عنایت اللہ خیالی گنج (چودھری خلیق الزماں کی قیام گاہ جہاں علی برادران اس دفعہ قیام پذیر تھے۔) مولانا محمد علی صاحب کے پاس اپنی طرف سے جلسہ کر کے مدعو کرنے گئے ہیں۔ چنانچہ دس بجے یہ لوگ واپس آئے۔ مولانا محمد علی صاحب نے اسے برابر منظور کر لیا ہے مگر ان کی پارٹی والے سخت برہم ہیں۔ چنانچہ یہاں سے باضابطہ دعوت نامہ ان کو بھیجا گیا۔ گو مولانا سلیمان صاحب پھلواروی اور بشیر حسین صاحب مخالف تھے اور وکٹوریہ پارک (چوک) میں اجازت لے کر جلسہ کا انتظام دو بجے کے لیے کیا گیا اور مولانا حسرت موہانی کا کوری سے (لکھنؤ سے متصل کلومیٹر پر واقع قصبہ جہاں ان تاریخوں میں سالانہ عرس ہو رہا تھا جس میں شرکت کے لیے مولانا حسرت موہانی گئے ہوئے تھے۔) بلوایا گیا۔ مگر افسوس ہے ساڑھے بارہ بجے محمد علی کا جواب آیا کہ خدام الحرمین اگر جلسہ کرے تو میں تقریر کروں گا۔ یہاں سے مجبوری ظاہر کی گئی۔ چنانچہ تین بجے سہ پہر تک انتظار کر کے ہمارے یہاں جلسہ شروع کیا گیا۔ اور مولوی عنایت اللہ صاحب نے تقریر کی۔ اور فریقین کی خط وکتابت جلسہ کو سنا کر ساڑھے چار بجے ختم کر دیا گیا۔ اندازہ ہے کہ خلیق (چودھری خلیق الزماں)، ظفر الملک، عارف ہنسوی (اسسٹنٹ ایڈیٹر

روزنامہ ہمدرد دہلی) وغیرہ کا اثر مولانا محمد علی پر پڑ گیا عصر کے بعد سے بارش شروع ہوگئی۔ مولانا شوکت علی کے نام سے چھ بجے شام کو جمعیۃ خلافہ کے جلسۂ عام کا اشتہار شائع ہوا۔ لاٹھی وغیرہ کی مخالفت تھی۔ امین الدولہ پارک کے بجائے محلسرا ممتاز حسین مرحوم میں (ممتاز دار الیتامیٰ سے متصل نجی رہائش واقع گونگے نواب امین آباد) بوجہ بارش جلسہ کیا گیا۔ سات بجے بصدارت مولوی ظہور احمد (سابق جنرل سکریٹری، آل انڈیا مسلم لیگ) جلسہ شروع ہوا۔ مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) خود تشریف لے جانے والے تھے مگر ..... (نام پڑھا نہیں گیا) صاحب و ممتاز میاں کے اصرار سے نہیں گئے۔ مولانا حسرت موہانی، ممتاز میاں، قطب میاں .. شریک جلسہ ہوئے۔ علی برادران نے تقریر میں کوئی لفظ خلاف نہیں کہا۔ حسرت موہانی نے تائید کی۔ صرف ابن سعود کے متعلق اختلاف کر دیا۔ دس بجے رات کو سب واپس آئے۔

۱۰ر نومبر: صبح کو ٹھاکر نواب علی خاں صاحب دفتر (خدام الحرمین واقع گلی پارچہ متصل فرنگی محل) میں آئے اور مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) بھی راجہ صاحب — (غالباً راجہ صاحب سلیم پور) و مشیر صاحب (مشیر حسین قدوائی) کے یہاں سے ہو کر تشریف لائے اور گزشتہ شب کے جلسۂ خلافت کا حال سنا اور مولانا محمد علی اور شوکت علی کی تقریروں پر اطمینان ظاہر کیا...... مغرب کے بعد سے نو بجے رات تک آج پھر ممتاز دار الیتامیٰ والے پارک میں جلسہ ہوا۔ مولانا شوکت علی جو صبح کو کانپور گئے تھے۔ شام کو واپس آکر جلسہ کے صدر تھے، مولوی عبدالحلیم نائب ناظم جمعیۃ علماء اور مولوی حبیب الرحمان لدھیانوی کی تقریریں ہوئیں۔ کوئی دل آزار بات نہیں کہی البتہ شہر خلافت کمیٹی جدید قائم کرنے کی کوشش میں ظفر الملک صاحب نے اچھے الفاظ نہیں استعمال کیے۔ خواجہ کرامت علی (اودھ خلافت کمیٹی قدیم

گے ایک عہدیدار اور مولانا عبدالباری کے مرید نے ٹوکا۔ مولانا شوکت علی صدر نے اس جھگڑے کو مرکزی خلافت کمیٹی میں طے کرنے کو کہا .... نو بجے رات کو منشی محمود علی (لکھنؤ کے مشہور بڑی والے) کے یہاں شوکت صاحب کی دعوت تھی۔ مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) بھی شریک ہوئے۔ کوئی خلاف بات نہیں پیش آئی .... مولانا محمد علی صاحب سہ پہر کو دہلی روانہ ہو گئے۔

۲۱؍نومبر: مغرب کے وقت مولوی عبدالماجد دریا بادی اور ظفرالملک میرے یہاں بعرض ملاقات مولوی صبغت اللہ سلمہٗ (ڈائری نویس کے حقیقی بھتیجے) آئے۔ آٹھ بجے رات تک متفرق گفتگو آپس میں رہی۔ میں نے غلط فہمیوں کے رفع کرنے کی کوشش اور مسلمانوں کو فتنہ سے محفوظ رکھنے کے متعلق عرض کیا مگر بحث و مباحثہ سے یہ ظاہر ہوا بلکہ صاف طور سے دونوں نے کہدیا کہ ہم مولوی اور پیرزادوں کے اقتدار کو توڑنا چاہتے ہیں۔ اصولی اختلاف واقع ہو گیا ہے۔ کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی ..... اخبار ہمدرد دہلی مولوی صبغت اللہ کے نام جاری تھا۔ اس کو آج سے مولانا محمد علی صاحب نے بند کر دیا۔

۲۴؍نومبر: گیارہ بجے دن کو ڈاکٹر کچلو صاحب و کنور عبدالوہاب صاحب منشی احترام علی کاکوروی کے ہمراہ فرنگی محل تشریف لائے ۔ موجودہ آپس کے نفاق پر گفتگو کی۔ تجویز ہوا کہ حکیم اجمل خاں صاحب مسلم لیڈران کی گول میز کانفرنس جلد از جلد لکھنؤ یا دہلی میں طلب فرما دیں۔ اور آپس میں مفاہمت کرا دیویں۔ ساڑھے بارہ بجے ڈاکٹر صاحب وغیرہ واپس گئے ..

یہ اس نجی ڈائری کے اقتباسات ہیں جو مشتہر کرنے کے خیال سے قطعی نہیں لکھی گئی تھی۔ اسی لیے ان میں اپنی طرف کی غلط روی پر بھی نکتہ چینی ہے اور مولانا

محمد علی کے متعلق پھیلائی گئی غلط فہمیوں کی تردید کی ہے اور مرشد مولانا عبدالباری سے
استدعا کی کہ ہر ایک شخص کی بات کو فوراً باور نہ کرلیا کریں وغیرہ وغیرہ۔
۱۹۲۵ء کی ڈائری ختم۔ ۱۹۲۶ء کی مفقود۔ اسی سال کے پہلے مہینے کی
۱۹ تاریخ مولانا عبدالباری تین دن کی سخت علالت اور برابر غشی و بے ہوشی میں
رہنے کے بعد سوا گیارہ بجے رات کو وفات پاگئے۔ مولانا محمد علی کو دوسرے
دن ۲۰ جنوری کو سنگین علالت کی اطلاع لکھنؤ کے اخبارات سے
ہوئی۔ دہلی سے فون کرکے مرشد کی خیریت پوچھی۔ سانحۂ ارتحال کی
اطلاع دی گئی۔ اسی وقت دہلی سے روانہ ہوکر دوسرے دن یعنی
۲۱ جنوری کو لکھنؤ پہنچے۔ مرشد کے مزار پر حاضر ہوکر فرنگی محل آئے۔
فرنگی محل کے پھاٹک میں میں نے ان کو اس طرح داخل ہوتے دیکھا کہ سفید
رومال سے آنسو پونچھتے تھے۔ اور ساتھیوں میں سے کسی سے ہم کلام نہ تھے۔
اس مکان میں جہاں مرشد کا سجادہ ہے اس طرح آئے کہ ڈیوڑھی میں رک کر
آنسو پونچھے، عینک صاف کی۔ کوئی نو بجے صبح کا وقت ہوگا۔ اسی وقت مولانا
عبدالباری کے وصیت نامے کی وہ دفعہ پڑھی گئی جس میں مخلصین سے خصوصاً اور عامہ
مسلمین سے عموماً اپنی غلطیوں کی معافی چاہی گئی تھی۔ اور وہ دفعہ پڑھی گئی جس
میں اپنے حقیقی بھتیجے اور داماد قطب میاں کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ یہ دفعات
مولانا سلامت اللہ نے بلند مگر گلوگیر آواز سے سنائیں۔ مولانا محمد علی سجادہ کے
بالکل مقابل نڈھال بیٹھے تھے۔ میں اپنے ہم سنوں کے ساتھ مجمع کی یورش
سے بچا کر سجادے کے بائیں طرف بٹھا دیا گیا تھا۔ اس لیے کہ مرشد کے جانشین
ان کی گدی پر بٹھائے جانے والے تھے اور مریدین کو نذریں پیش کرکے اپنی
ارادت کا اظہار کرنا تھا۔ ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ قطب میاں کو گدی پر

بٹھا کر سب سے پہلے مولانا سلامت اللہ نذر پیش کریں گے۔ اس کے بعد اور لوگ اسی میں ہم لوگ بھی نذر پیش کریں گے۔ سب سے پہلے مولانا سلامت اللہ نے نذر پیش کی۔ اس کے بعد مرید مولانا محمد علی نے اپنی طرف سے ایک اور دوسری نذر اپنے بھائی مولانا شوکت علی کی طرف سے۔ سب لوگوں نے کھڑے ہوئے جھک کر نذر دی۔ مولانا محمد علی سجادے سے قریب بھی تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کھڑے نہیں ہو پائیں گے۔ انھوں نے بیٹھے بیٹھے نیم دراز ہو کر نذر پیش کی۔ اس کے بعد ان کے دوسرے پیر بھائیوں نے اور ان ہی میں اس کم سن پیر بھائی نے بھی نذر پیش کی۔

پیر اور مرید کی باہمی آویزش کا ذکر، جس نظر مضمون میں آچکا ہے اور بقول مولانا عبدالماجد دریابادی "مرید اپنے مرشد کا محض مطیع ہی نہ تھا، دوست اور محب بھی تھا، عاشق و شیدائی بھی تھا، ممنونِ کرم بھی رہا کرتا تھا" ۱۹ اور ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء (منگل اور بدھ) کی درمیانی شب میں جب مولانا فرنگی محلی کا انتقال ہوا اور مولانا محمد علی کو اس حادثے کی اطلاع ملی تو فوراً ہی اپنی بیگم کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوئے اور ۲۱ جنوری کو صبح سویرے لکھنؤ پہنچے تو سیدھے قبرستان گئے اور مولانا دریابادی کے لفظوں میں: "مٹی کے ڈھیر سے لپٹ کر رونے لگے

بہ جنازہ گر نہ آئی، بہ مزار خواہی آمد

دل ایک دن قبل ہی سے رو رہا تھا، اس وقت آنکھوں سے بھی چشمے ابل پڑے آہ – جو قلب سراپا درد تھا، یکسر سوز و گداز تھا، اجنبیوں اور بیگانوں کے لیے بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا، اس وقت اپنے محبوب ترین دوست کی قبر پر کھڑا تھا، اپنے مرشد کے مزار پر حاضر تھا، جذبات میں جتنا بھی تلاطم ہوتا سب بجا تھا..."

(ذاتی ڈائری کے چند ورق - حصہ اول صفحہ ۳۱۹)

d No D-(S E)-108 Vol 77 No 1-2 Jan & Feb 198
THE MONTHLY JAMIA, Jamia Nagar, New Delhi-110025

